ہر شعبۂ زندگی میں مسلمانوں کے بگاڑ کی تشخیص اور اس کا علاج

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ

ادارۃ المعارف کراچی

مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبے میں پھیلی ہوئی کوتاہیوں کی نشان دہی نیز
عبادات، نکاح وطلاق، حقوق العباد اور دیگر معاشرتی معاملات سے متعلق
معاشرے میں پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کا شریعت کی روشنی میں حکیمانہ علاج

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ

ادارۃ المعارف کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

"اصلاحِ انقلاب امت" حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ کی وہ مجددانہ تصنیف ہے جس میں انہوں نے اپنے زمانہ کے مطابق زندگی کے ہر شعبے میں اسلام کی تعلیمات کی توضیح فرمائی ہے۔ مسلمانوں کی عملی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس میں وہ اپنے دین کی اصل تعلیمات سے دور نہ ہٹتے چلے گئے ہوں۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کتاب میں عمل کی ان ہی کوتاہیوں کی انتہائی جزرسی کے ساتھ نشان دہی فرمائی ہے اور پھر انہیں دور کرنے کی موثر تدبیریں بتائی ہیں۔

یہ کتاب درحقیقت ایک سلسلۂ مضامین ہے جو دارالعلوم دیوبند کے معروف ماہنامہ "القاسم" میں قسط وار شائع ہوتا رہا، بعد میں اسے کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا۔

احقر نے اپنے ماہنامہ البلاغ میں اس سلسلۂ مضامین کی کچھ قسطیں القاسم سے نقل کر کے شائع کی تھیں، اور اس بات کی آرزو تھی کہ یہ مضامین یکجا طور سے کتابی صورت میں شائع ہوں۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی سینکڑوں تالیفات بار بار شائع ہوتی رہی ہیں، لیکن حیرت ہے کہ ایسی جامع مفصل اور مفید کتاب غالباً صرف ایک بار شائع ہو کر رہ گئی، اور اب حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے بہت سے متوسلین بھی اس کے نام تک سے واقف ہیں۔

اسی دوران احقر کے شیخ و مربی سیدی وسندی حضرت ڈاکٹر عبدالحیٰ صاحب دامت برکاتہم نے "اصلاح انقلابِ امّت" کا ایک نسخہ جناب محمد حنیف اللہ لاری صاحب سے حاصل کرکے احقر کو عطا فرمایا اور حکم دیا کہ اس کی طباعت واشاعت کا انتظام کیا جائے۔

احقر نے کتاب کا مطالعہ کیا تو اندازہ ہوا کہ موجودہ دور میں اس کو شائع کرنے کے لئے اس پر کچھ کام کرنے کی ضرورت ہے، یہ کتاب ایسے دور میں لکھی گئی تھی جب عام مسلمان بھی دینی اصطلاحات اور علمی اسلوبِ بیان سے پوری طرح مانوس تھے اور اس سے پورا استفادہ کر سکتے تھے، لیکن اب ہماری شامتِ اعمال سے عوام اس اندازِ بیان سے بہت نامانوس ہوگئے ہیں، اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ تشریحی حواشی وغیرہ کے ذریعہ اسے بالکل عام فہم بنانے کی کوشش کی جائے۔ دوسرے عہدِ حاضر کے مذاق کے مطابق کتاب میں پیراگراف قائم کرنے اور ذیلی عنوانات لگانے کی بھی ضرورت تھی۔

جہاں تک پہلے کام کا تعلق ہے، میں اس کے لئے فرصت کا متلاشی رہا، لیکن جب یہ دیکھا کہ فرصت کی تلاش میں یہ کام ٹلتا جائے گا اور اس طرح ہو سکتا ہے کہ اصل کتاب کی طباعت ہی میں غیر معمولی تاخیر ہو جائے، تو والدِ ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم العالی نے حکم دیا کہ اب تسہیل و تشریح کے انتظار میں کتاب کی طباعت کو مؤخر نہ کیا جائے، کتاب ایک مرتبہ وجود میں آگئی تو ان شاء اللہ اس پر اس نوعیت کے کام ہوتے رہیں گے۔ چنانچہ اس کام سے صرفِ نظر کرکے احقر نے صرف دوسرے کام پر اکتفا کرنے کو مناسب سمجھا، اور اس کے لئے برادرِ عزیز مولوی محمد علی صاحب کو (جو آج کل جامعہ تعلیمات اسلامیہ لائلپور میں نظامت کے فرائض انجام دے رہے ہیں) کتاب حوالہ کردی۔ انہوں نے پوری کتاب کو نقل کرکے اس کے بڑے حصے پر پیراگراف قائم کئے۔ عنوانات لگائے اور بعض مقامات پر مختصر تشریحی حواشی کا اضافہ کیا، پھر وہ اپنی بعض مصروفیات کی بناء پر کام کی تکمیل نہ کرسکے تو میں نے برادرِ عزیز مولوی عبدالغفار ارکانی صاحب (فاضل دارالعلوم کراچی) سے اس کام کی تکمیل کرائی، چنانچہ کتاب کا نصف سے زائد حصہ انہوں نے ہی نبٹایا۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں صاحبان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین۔

بہرکیف! اب اس کتاب کا پہلا حصّہ آپ کے سامنے ہے، انشاءاللہ دوسرا حصّہ بھی جلد از جلد پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی، اگرچہ تسہیل وتشریح کا کام اس مرتبہ نہیں ہو سکا، لیکن اُمید ہے کہ انشاءاللہ کتاب کے بیشتر مباحث عام اردو خواں حضرات پوری طرح سمجھ سکیں گے۔ جہاں دشواری محسوس ہو وہاں کسی اہل علم سے سمجھ لیا جائے۔ وما توفیقی الا باللہ۔

احقر

محمد تقی عثمانی

مدیر: ماہنامہ البلاغ

دارالعلوم کراچی ۱۴

فہرست مضامین

مُسلمان کیوں بدل گئے

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم

اُمّتی مِن حیث ھو اُمّتی کے اعتبار سے دنیوی انقلاب تو مطمح نظر ہو نہیں سکتا، گو اس سے بحث کرنے کو بھی میں بیکار نہیں سمجھتا، مگر حیثیت مذکورہ سے یہ بحث مقصود نہیں، بلکہ انقلاب دینی سے بحث مقصود ہے۔ اسی کے نسبت اس وقت عرض کرنا چاہتا ہوں۔

افسوس کے ساتھ کہا جاتا ہے! کہ جس مرتبہ کا انقلاب عظیم اکثر آحاد امت میں واقع ہوا ہے اس کو دیکھتے ہوئے بے اختیار یہ زبان پہ آتا ہے ؎

اے بسرا پردۂ یثرب بخواب

ترجمہ:۔ اے وہ ذات! جو مدینہ میں محو خواب ہے۔

خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب

ترجمہ:۔ اٹھیئے!! کہ مشرق و مغرب برباد ہو گئے۔

س انقلاب کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ ہاتھ میں ایک کتاب تفاصیل احکام شرعیہ کی لے لیجئے اور ایک نظر سے ایک ایک حکم جزئی کو دیکھتے جائیے، اور ایک نظر سے کسی غیر مطیع اُمتی

کی ایک ایک حالت کو جو اس جزئی کا محل اور متعلق ہے۔ دیکھتے جائیے، اور دونوں کو ملاتے جائیے، تو ایک حیرت عظیم ہوگی، کہ ــــ یا اللہ! ان حالتوں کے مرتکب کو کیا ان احکام سے کچھ مس معلوم ہوتا ہے ــــ؟

دین کے یہ اجزاء ہیں:۔

(۱) عقائد ــــ (۲) دیانات (مثل نماز، روزہ، طلاق، نکاح وغیرہ) ــــ (۳) معاملات (مثل۔ بیع وشراء وغیرہ) ــــ (۴) معاشرات (مثل طعام، لباس، کلام وسلام وغیرہ) (۵) اخلاق باطنہ (مثل ریا و اخلاص وکبر وتواضع وغیرہ)

عقائد میں مسلمانوں نے غنیمت ہے "انکار کا انقلاب" نہیں پیدا کیا، گو ان میں تدیّن کے رنگ میں کچھ تغیر وتبدل ہوا۔ جس سے وہ حد بدعت میں داخل ہوگئے، اور جس نے اہل باطل کو اسی تغیر کی اصلاح کے سبب سے اہل حق کا مخالف بنا دیا۔ غرضکہ نصوص کا انکار نہیں کیا گیا۔ البتہ تاویل باطل کی گئی ــــ یہ حالت عام مسلمانوں کی ہے۔!!

متجددین میں انکار کا انقلاب

مگر خاص خاص جدید تعلیم یافتوں نے "انکار کا انقلاب" بھی اختیار کیا، بلکہ انکار سے متجاوز ہوکر جمہور کے عقائد کے ساتھ استہزاء اور تمسخر سے پیش آنے لگے، جس پر حافظانِ حدود دین نے کفر کا فتویٰ لگایا۔ اور اس فتویٰ کی بدولت دوسری طرف سے ان کو "متعصب" کا لقب عطا ہوا۔ گو جو شخص کفر کی حقیقت سمجھے گا، وہ ان علماء کو اس فتویٰ میں نہ صرف معذور بلکہ خود بھی اس میں ان کے ساتھ بالاضطرار اتفاق کرے گا ــــ یہ تو پہلے جزو کے انقلاب کی کیفیت تھی۔

رہا دوسرا جزو ــــ دیانات ــــ اس میں عام مسلمانوں نے درجۂ بدعت کا بھی تغیر وتبدل نہیں کیا، مگر "ترک واہمال کا انقلاب" البتہ اختیار کیا، کہ کسی نے نماز وروزہ کو اس طرح خیرباد کہا، گویا اس کے ذمہ فرض ہی نہیں، کسی نے نکاح وطلاق کے ساتھ یہ ہی معاملہ کیا کہ عقیدے میں تو یہ ہی سمجھا کہ مسائل نکاح وطلاق دین میں داخل ہیں۔ ہماری رائے واختیار پر نہیں ہیں اسی طرح جس طرح علمائے دین بتلاتے ہیں۔

اسی لئے احکام دین کے مقابلہ میں ــــ اور احکام مخترع نہیں کئے گئے ــــ مگر عمل

اس کے ساتھ یہ رکھا کہ جہاں نفس کا غلبہ ہوا، وہاں تمتع کے لئے نکاح کا بھی انتظام نہیں کیا، جہاں کوئی دنیوی ننگ وناموس کے باقی رکھنے میں مصلحت دنیوی دیکھی، وہاں باوجود طلاق کے بدستور بیوی کو گھر میں رکھا، اور اس سے متمتع ہوتے اور بچے جنواتے رہے۔ اور خاص خاص جدید تعلیم یافتوں کو تو یہاں بھی انکار میں تردد نہیں ہوا۔

بہرحال عام مسلمانوں میں، جزو اوّل میں انقلاب تغیر ہوا تھا، اور یہاں جزو ثانی میں انقلاب ترک واہمال ہوا ہے۔

معاملات، معاشرات اور اخلاق اجزائے دین ہیں۔

اب رہ گئے بقیہ اجزائے ثلثہ ـــــ معاملات ـــــ معاشرات ـــــ اخلاق ـــــ ان تینوں میں مذکورہ "انقلابوں" سے بڑھ کر انقلاب ہوا ہے۔ یعنی عام مسلمانوں نے بھی اپنی بے خبری سے اُن کو جزو دین نہیں سمجھا، بلکہ دنیوی کارروائی سمجھ کر اس کے دستور العمل کو اپنی رائے واختیار پر مُفوّض سمجھا، اور چونکہ اغراض فاسدہ تھیں اور رائے میں زیغ تھا اس لئے اس کا ثمرہ یہ ہوا کہ ہر ہر حکم شرعی کے مقابلے ایک ایک کارروائی اور ایک ایک رسم اور ایک ایک عادت اختراع کی اور اس مجموعہ کو اپنا دستور العمل قرار دیا اور اس قرارداد میں ذرا بھی اپنے کو قصوروار یا خطا کار نہیں سمجھا، بلکہ بعض امور کو الٹا ہنر اور فخر سمجھا۔ اس طرح سے کہ مجموعی حالت کے دیکھنے والے کو یہ گمان ہوتا ہے کہ جیسے کسی نے قصداً ہر ہر حکم رحمانی کے مقابلے میں ایک ایک حکم نفسانی مستحسن سمجھ کر ایجاد کیا ہو۔

اور استحسان کی یہ علامت ہے کہ ان امور میں احکام حُقّہ کے داعی سے سخت مزاحمت کی جاتی ہے ـــــ سو درحقیقت یہ انقلاب بہت ہی بڑا انقلاب ہوا ـــــ کیونکہ اوّل کے دو انقلابوں میں اجزائے دین کو، دین سے خارج نہیں کیا گیا تھا اور ان اجزاء کے مقابلہ میں دوسرے امور کو من حیث الاستحسان تجویز کیا گیا تھا گو ایک جگہ تغیر وہ بھی من حیث التدین، اور دوسری جگہ ترک، وہ باعتقاد تقصیر واقع ہوا تھا، اور ان تینوں میں اجزائے دین کو، دین سے خارج کر دیا گیا اور بجائے ان اجزاء کے دوسرے احکام اختراع کئے گئے، اور اُن مخترعات کو اصل پر ترجیح دی گئی تو ظاہر ہے کہ یہ انقلاب اجزائے ثلثہ اخیرہ کا ان انقلابین اولین سے بدرجہا بڑھا ہوا ہے اور وقوع میں اظہر اور اکثر یہی اجزائے ثلثہ اخیرہ ہیں۔

کیوں کہ "عقائد" کا حصّہ گو الزام ہے مگر اظہر نہیں۔ اور "دیانات" کا حصہ خاص خاص اوقات میں ظاہر ہوتا ہے۔ پس وقوع میں اکثر نہ ہوا۔ اور یہ ثلٰثۃ اخیرہ اظہر بھی ہیں، اکثر بھی ہیں اور ان ہی میں یہ انقلاب عظیم واقع ہے۔

مسلمانوں سے اپیل

پس اس بناء پر دیکھنے والوں کو اکثر احاد امت میں بر وقت یہ انقلاب عظیم ہی نظر آوے گا، تو جو شخص بر وقت انقلاب عظیم دیکھے اور پھر یہ دعویٰ بھی سنے کہ "انا امتی لمحمد"، تو وہ سخت تحیر میں واقع ہو جاوے گا، کہ یا اللہ! یہ شخص کس امر میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق ہے، جو ایسا دعویٰ کرتا ہے؟

مسلمانو! اب بھی اپنی حالت پر آپ کو تنبیہ ہوا؟ اگر نہیں ہوا تو انا للہ!! اگر ہوا ہے، تو کیا اس کی اصلاح ضروری نہیں ہے؟ اگر ہے، تو کب اصلاح شروع ہوگی؟ کیا ان میں سے کسی چیز کا انتظار ہے؟ ـــــ شغل مانع ـــــ مرض معطل ـــ موت ـــــ یا وحی جدید، سو اس کی تو امید نہیں، فبای حدیث بعدہٗ یومنون (اس کے بعد کون سی بات پر ایمان لاؤ گے) اور امور بالا کا واقع ہونا مستبعد نہیں، بلکہ موت تو متیقن ہے مگر کیا اس وقت کچھ کر و سکو گے؟؟

مسلمانو! جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے، اسی انقلاب کی، جس کا اس زمانہ میں وقوع ہو رہا ہے بطور پیشن گوئی کے خبر دی تھی، الناس کابل مائۃ لاتجد فیھا راحلۃ (عوام سواونٹوں جیسے ہیں تم ان میں ایک بھی سواری کے لائق نہیں پاؤ گے) ورنہ وہ زمانہ تو خیریت کا تھا واللہ اعلم وھو الموافق۔

طریق اصلاح انقلاب

جاننا چاہیئے کہ یہ "انقلاب" ایک روحانی مرض ہے اور جس طرح جسمانی امراض کے خاص اسباب ہوتے ہیں اور ان کی اصلاح و معالجہ ان اسباب کے ازالہ سے ہوتی ہے۔ اسی طرح اس مرض روحانی (انقلاب) کے بھی خاص اسباب ہیں اور ان کا ازالہ ہی اس کے معالجہ و اصلاح کا طریق ہے۔ اب اسباب کی تشخیص اور ان کے ازالہ کی تدبیر، بس یہ ہی دو امر مرجع اہتمام قرار پائے۔

امر اول:۔ یعنی "تشخیص اسباب انقلاب" اس میں تامل و تدبر و تتبع کرنے سے معظم اسباب دو امر ثابت ہوئے۔

(۱) ایک قلّت علم یعنی ناواقفی و بے خبری۔

(۲) دوسرا ضعف ہمت، یعنی قصد وارادہ کی کمی یا فقدان

سبب اوّل سے خود احکام ضروریہ وواقعیہ ہی مخفی رہے ہیں۔ اور سبب ثانی سے باوجود خبر اور آگاہی کے نوبت، عمل کی نہیں آتی۔

امر ثالث:۔ یعنی "ان اسباب کے ازالہ کی تدبیر" اور یہ ہی بڑا امر ہے۔ جس کے لئے توجہ تام وقوت متفقہ کی سخت احتیاج ہے۔

سو دونوں سببوں میں سے ہر ایک کے ازالہ کی تدبیر جدا ہے۔ پس بے خبری کے ازالہ میں تو معلم اور متعلم یعنی خواص، علماء احکام اور عوام وطالبان احکام دونوں کو دخل ہے۔ اور ہر ایک کے لئے جداگانہ ضروری دستور العمل ہے۔

مردوں کا دستور العمل

طالبان احکام کا دستور العمل یہ ہے کہ ان میں جو زیادہ فارغ ہیں۔ جیسے اہل تنعم واہل ثروت، وہ اپنی اولاد کو علوم دینیہ کے لئے فارغ کردیں۔ گو ضروریات دنیاوی کے لئے لسان ملک وفنون رائجہ کی بھی تحصیل کا مضائقہ نہیں، مگر یہ درجہ تبعیت سے متجاوز نہ ہونے پاویں۔ پس اولاد تو یوں درست ہوئی۔ اور خود کوئی وقت معین کرکے کسی عالم یا کامل الاستعداد طالب علم کے پاس جاکر یا اس کو بلاکر، اگر علوم عربیہ سے مناسبت ہو تو وہ زیادہ بصیرت کا آلہ ہے۔ ورنہ اردو ہی کے مفید اور ضروری رسائل کو کسی محقق کے مشورہ سے تجویز کرکے سبقاً سبقاً، بہتر تو یہ ہی ہے کہ دو تین بار، ورنہ اقل درجہ تحصیلاً ایک ہی بار پھر مطالعتہً چند بار ان پر عبور کرلیں۔ مگر یہ رسائل ایسے ہوں۔ جن میں سب اجزاء دین کافی بیان ہوں۔ عقائد ـــــ دیانات ـــــ معاملات ـــــ معاشرات ـــــ اخلاق باطنہ (جن کا ذکر اس سے پہلے مضمون میں بھی ہوچکا ہے)

اور جن کو معاش کی ضرورت سے زیادہ فراغ نہیں ہے اور ۳، ۴ حرف شناس ہیں یا بآسانی ہوسکتے ہیں وہ اپنے لئے بھی اور اپنی اولاد کے لئے بھی بجائے علوم عربیہ کے وہی رسائل دینیہ اردو کے بطور درس طالب علمانہ کے تجویز کرلیں اور پھر بطور ورد کے، ان کا بار بار مطالعہ کیا کریں۔ اور جب تک درس کا انتظام نہ ہوسکے، بطور خود ہی دو چار ورق روزانہ بالالتزام مطالعہ کرلیا کریں اور موقع خلجان

میں خردرائی سے کام نہ لیں۔ بلکہ نشان بناکر چھوڑدیں۔ اور ماہر کے میسر ہونے کے وقت اس کی تحقیق کرلیں۔

اور جو لوگ حرف شناس نہیں ہیں۔ اور نہ باآسانی ہوسکتے ہیں۔ اور نہ ہی اپنے بچوں کو کسی وجہ سے اس کام کے لیئے فارغ کرسکتے ہیں۔ وہ ایسا انتظام کریں کہ ہفتہ میں، بہتر تو یہ ہے کہ روزانہ ایک ہی روز خاص مجلس علمی کے لیئے بالالتزام مقرر کریں۔ اور کوئی عالم یا صحبت یافتہ اہل علم جو ان رسائل کو اچھی طرح سمجھا ہو، تجویز کریں۔ اور اگر کسی عالم سے تجویز کرالیں، زیادہ احتیاط ہے۔ اور اس روز سب لوگ کسی خاص مقام، مسجد وغیرہ میں جمع ہوکر اس خواندہ وفہمیدہ شخص کو لاکر ایک معین وقت تک (مثلاً ایک گھنٹہ یا آدھا گھنٹہ) ان رسائل کو سنا کریں، اور سمجھا کریں۔ اور اگر ایسا شخص مفت نہ ملے۔ تو اس کی کچھ مالی خدمت کریں۔ اور اس سنانے والے شخص کو جہاں شبہ رہے پنسل وغیرہ سے نشان بناکر اس وقت اس کو رہنے دیں۔ پھر جب کوئی عالم میسر ہو۔ اس سے حل کریں۔ اور سب مجمع کو پہنچادیں۔

اور جہاں دیہات وغیرہ میں ایسا شخص نہ ہو۔ تو آپس میں مشروع طریقہ سے چندہ کرکے، اس چندہ سے کوئی ایسا آدمی باہر سے بلاکر رکھ لیں۔ اور یہ طریقہ جاری کریں۔

اور یہ تمام طبقات مذکورین، علاوہ اس تحصیل یا مطالعہ یا سماع رسائل کے، دو امر کا اور بھی التزام رکھیں۔

(۱) ایک یہ کہ اپنے اعمال واحوال میں جب کوئی امر جس کا حکم معلوم نہ ہو۔ پیش آوے فوراً علماء حقانی سے اس کو دریافت کریں۔ اور اگر بوجہ بعد کے زبانی نہ پوچھ سکیں۔ تو بذریعہ خط کے تحقیق کریں۔ اگر اوسط ایک مسئلہ روزانہ کے حساب سے تقریراً یا تحریراً پوچھ پاچھ رکھے تو سال بھر میں ساڑھے تین سو سے زائد، اور دس سال میں ساڑھے تین ہزار سے زیادہ مسئلے معلوم ہوسکتے ہیں۔ کہ بعض نام کے یا جدید عالموں کو بھی اتنے مسائل معلوم نہیں! اور کوئی بڑا مشکل کام نہیں ہے۔

(۲) دوسرے اس امر کا التزام رکھیں کہ علماء کی مجلس میں جایا کریں۔ خواہ خاص مجلس ہو جیسے جلسہ ملاقات وزیارت، خواہ عام مجلس ہو۔ جیسے جلسہ وعظ ونصیحت، اور جو سنیں دل سے

یاد رکھیں۔ یہ تو مردوں کا انتظام ہوا۔

عورتوں کا دستور العمل

اب عورتیں رہ گئیں، سو یہ مجموعی انتظام مذکورہ ان کے لئے اشکال سے خالی نہیں، اس لئے سہل تر ان کے لئے یہ طریق ہے کہ اگر معلمہ عفیفہ، دین دار مل جاوے، تو کمسن لڑکیوں کو اس کے ذریعہ سے قرآن مجید اور ایسے رسائل کی تعلیم دلاویں اور ان کے لئے "بہشتی زیور" کے دس حصہ بالکل انشاء اللہ تعالیٰ کافی ہیں بلکہ بانضمام گیارھویں حصہ مسمیٰ "بہشتی گوہر" کے مردوں کے لئے بھی کافی ہیں۔ اور اگر کوئی معلمہ ایسی نہ ملے یا کسی لڑکی کو فراغ یا مناسبت نہ ہو تو ان کو بھی بڑی عورتوں کے انتظام میں شامل سمجھا جائے اور وہ انتظام دو ہیں۔

ایک یہ کہ گھر کے مردوں میں سے اگر کوئی خواندہ ہو تو وہ روزانہ کچھ وقت معین کر کے سب گھر والیوں کو اس وقت جمع کر کے رسائل بالا سنایا کریں، سمجھایا کریں بلکہ کئی دَور ئے کر دیں۔

دوسرا انتظام یہ ہے کہ گاہ گاہ کسی مُتَوَرِّع مُتَبِّع سنت عالم کا گھر میں وعظ کہلا دیا کریں، کہ یہ عجیب موثر عمل ہے۔ یہ سب دستور العمل، طالبان احکام کے متعلق ہے۔

علماء کا دستور العمل

اب علماء احکام کا دستور العمل باقی رہا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً اس میں ساعی رہیں کہ ناواقفوں تک احکام پہنچائیں اور اس کی یہ صورتیں ہیں۔

① درس (گو بعوض ہو) اس میں علوم ضروریہ کو مقدم اور مُہتم بالشان رکھیں۔ دینیات سے حتی الامکان طالب علم کو پہلے فارغ کر دیں۔ اگر طالب علم دینی مختصرات یا اردو کے رسائل بھی پڑھے۔ اور اپنے پاس وقت ہو۔ تو ہرگز اس کے درس کو خلاف شان نہ سمجھے۔ طالب علم کے فضول سوال پر اس کو متنبہ کرے، جواب نہ دے۔

② دوسری صورت وعظ ہے۔ جس میں خطاب عام ہے۔ اس میں ضرورت وقت کا لحاظ رکھیں۔ جن امور میں لوگ اس زمانہ میں مبتلا ہوں، یا جن ضروریات میں فرو گذاشت کرتے ہوں۔ مدار بیان، اس پر رکھے۔ دوسرے مضامین اگر ہوں، تو بالتبع اور بقلت ہوں۔ اور یہ ضروری مضامین جمیع ابواب کے ہوں۔ صرف عقائد و دیانات پر اقتصار نہ کرے بلکہ معاملات و

معاشرات واخلاق سے بھی مشبع بحث کرے بلکہ بوجہ متروک ہونے کے یہ ثلثۂ اخیرہ زیادہ اہم ہو گئے ہیں۔ اور وعظ میں بات صاف کہے کہ سننے والوں کی سمجھ میں خوب آجاوے۔ مگر خشونت اور اشتعال انگیز طرز سے بچے۔ اور وعظ پر عوض نہ لے۔ البتہ اگر وعظ کا نوکر ہو، وہ اور بات ہے۔

(۳) تیسری صورت جواب ہے، استفتار کا خواہ زبانی سوال ہو، یا تحریری ہو۔ اس میں ان امور کا لحاظ رکھے۔

(۱) حتی الامکان جواب میں توقف نہ کرے۔

(۲) لایعنی سوال کا جواب نہ دے، بلکہ سائل کو متنبہ کردے۔

(۳) اگر سوال محتمل دو صورتوں کو ہو تو تشقیق سے جواب نہ دے۔ کیونکہ بعض اوقات سائل دونوں شقوں کا حکم سن کر ایک شق کو اپنے مفید مطلب سمجھ کر سوال میں اسی کا دعویٰ کرنے لگتا ہے جس کی وجہ سے سائل کا یا اس کے مقابل کا ضرر دینی یا دنیوی ہو جاتا ہے۔

(۴) عامی کو دلیل بتلانے کا التزام نہ کرے کہ اکثر اس کے فہم سے خارج ہو گی۔

(۵) ہاں! دوسرے علمار مصححین کی سہولت کے لئے اگر دلیل کی طرف اشارہ کردے یا کوئی عبارت بلا ترجمہ نقل کردے، مستحسن ہے۔

(۶) اگر قرائن سے معلوم ہو کہ سائل غائب، اس تحریری جواب کو اچھی طرح نہ سمجھے گا۔ یا سمجھنے میں غلطی کرے گا جواب لکھ کر لکھدے کہ کسی عالم سے اس جواب کو زبانی حل کرے۔

(۷) اگر قرائن سے معلوم ہو کہ سوال برائے تعنت ہے، جواب نہ دے۔ غرض اہل سے دریغ نہ کرے، نااہل کو منہ نہ لگاوے۔

(۴) چوتھی صورت تالیف وتصنیف ہے۔ خواہ اشتہار ہو، یا اخبار ہو یا رسالہ وکتاب ہو۔ اس میں بھی ضرورت وقت کا لحاظ اور عبارت میں سلامت اور کفایت کی رعایت ہو۔ اور اگر اللہ تعالیٰ معاش کی کوئی صورت اور سبیل عطا فرمادے تو اپنی تصانیف کی خود تجارت نہ کرے۔

یہاں تک بیان تھا، بے خبری کے ازالہ کی تدبیروں کا، آگے بیان ہے، ضعف ہمت کی ازالہ کی تدبیر کا۔

ضعف ہمت کی ازالہ کی تدبیریں؟ صحبت شیوخ کاملین۔

تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ امور ذیل کو تقویت ہمت میں خاص اثر اور دخل ہے۔

ایک ان میں سے صحبت شیوخ کاملین کی ہے۔ جن کی یہ علامتیں ہیں۔

(۱) بقدر ضرورت علم دین رکھتا ہو۔

(۲) عقائد و اعمال و اخلاق میں شرع کا پابند ہو۔

(۳) دنیا کی حرص نہ رکھتا ہو۔

(۴) کمال کا دعویٰ نہ کرتا ہو، یہ بھی شعبہ دنیا ہے۔

(۵) کسی شیخ کامل کی صحبت میں چندے رہا ہو۔

(۶) اس زمانے کے منصف علماء و مشائخ اس کو اچھا سمجھتے ہوں۔

(۷) بہ نسبت عوام کے خواص یعنی فہیم، دین دار لوگ اس کی طرف زیادہ مائل ہوں۔

(۸) اس سے جو لوگ بیعت ہیں، ان میں اکثر کی حالت باعتبار اتباع شرع و قلت حرص دنیا کے اچھی ہو۔ وہ شیخ تعلیم و تلقین میں اپنے مریدوں کے حال پر شفقت رکھتا ہو۔ اور ان کی کوئی بری بات دیکھے یا سنے تو ان کو روک ٹوک کرتا ہو۔ یہ نہ ہو، کہ ہر ایک کو اس کی مرضی پر چھوڑ دے اس کی صحبت میں چند بار بیٹھنے سے دنیا کی محبت میں کمی اور حق تعالیٰ کی محبت میں ترقی محسوس ہوتی ہو۔

(۹) خود بھی وہ ذاکر شاغل ہو۔ اس لئے کہ بدون عمل یا عزم عمل، تعلیم میں برکت نہیں ہوتی۔ اور صدور کشف و کرامت استجابت دعا و تصرفات لوازم شیخت سے نہیں۔

غرض ایسے حضرات کی صحبت، خاص طور پر مؤثر ہے۔ مگر اس صحبت کی تاثیر میں شرط یہ ہے کہ اس میں نیت بھی یہ ہی ہو کہ میرے قلب میں رغبت طاعت اور نفرت معاصی پیدا ہو۔ اور اس کے ساتھ اس کا بھی التزام رہے کہ اپنی کیفیات قلبیہ کی شیخ کو اطلاع دیکر جو معالجہ تجویز فرمایا جائے اس پر کاربند ہو۔

دوسرا امر، ان میں سے بوقت میسر نہ آنے صحبت کاملین کے اہل اللہ کے، حالات ت کا مطالعہ یا استماع ہے مگر ان سے مقالات متعلقہ اسرار مسائل غامضہ تصوف ہیں۔

ان میں ہرگز مشغول نہ ہو۔ البتہ علوم معاملہ یعنی تربیت باطن وتہذیب نفس کے بارہ میں جو کچھ ان کے اقوال ہیں۔ وہ سرتاپا عمل درآمد بنانے کے قابل ہیں۔

تیسرا امر، ان میں سے مراقبہ موت ومابعد الموت ہے۔ مراد اس سے ابتدار نزع روح سے دخول جنت یا نار تک جو احوال پیش آنے والے ہیں۔ مثلاً سوال نکرین وعذاب ونعیم قبر وحشر ووزن اعمال وحساب وجزاء وعبور صراط وغیرہ۔ سب کو کسی وقت فراغ میں بالالتزام روزانہ کم از کم بیس منٹ سوچا کرے تقویت ہمت میں جن ملکات کو دخل ہے۔ اس مراقبہ سے ان کا کمال پیدا ہو جاوے گا۔ جیسے زہد وخشیت وامثالہا۔

پس یہاں پر بیان ختم ہو گیا۔ یعنی اسباب انقلاب کے ازالہ کی تدبیر کا، پس طریقہ اصلاح مکمل طور پر مشخص ہو گیا۔ وللہ الحمد۔

اور لطف یہ ہے کہ نہایت سہل اور ایسا عام اور تام کہ ادنیٰ توجہ سے تمام امت باسرع اوقات اپنی اصلاح کر سکتی ہے آگے نفع حاصل کرنے والوں کی توفیق ہے ؎

ما نصیحت بجائے خود کردیم	روزگارے دریں بسر بردیم
ترجمہ: ہم نے اپنی جگہ یہ نصیحت کردی	ترجمہ: کتنا عرصہ اس میں صرف کیا
گر نیاید بگوش رغبت کس	بر رسولاں بلاغ باشد وبس
ترجمہ: اگر ہماری یہ نصیحت کسی کو پسند نہ آئے	ترجمہ: تو پھر جان لو کہ ایلچی پر صرف پہنچانا ہے اور بس

(تذییل)

علماء احکام کے دستور العمل کا متمم ایک اور امر بھی ہے۔ یعنی امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور اس میں بعض مواقع پر غیر علماء بھی شریک ہیں۔ یعنی خاص لپنے ان متعلقین پر احتساب کرنا جن پر قدرت ہے۔ علماء کے ساتھ مخصوص نہیں۔ البتہ عام احتساب، یہ خاص ہے علماء کے ساتھ اور عوام کی تصدی اس کے لئے اکثر موجب فتنہ وعداوت ہو جاتی ہے نیز عوام اکثر احتساب کی حدود بھی نہیں جانتے۔ اس سے غلو فی الدین کی نوبت آجاتی ہے۔ نیز اکثر عوام نفس کو مہذب کئے ہوئے نہیں ہوتے۔ اور ان کے احتساب میں بکثرت

نفسانیت ہوتی ہے۔

اس معنی کے افادہ کے لئے بعض مفسرین نے وَلْتَكُن مِّنكُمْ میں مِن کو تبعضیہ کہا ہے۔ اور یہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کہیں واجب ہوتا ہے، جہاں فاعل بے خبر ہو یا فاعل پر پوری قدرت ہو۔ یا قبول کی پوری توقع ہو، ورنہ مستحب ہے۔

منجملہ اس کے آداب کے یہ ہے کہ اول خلوت میں کہے اور نرمی سے کہے اس کے بعد اگر مصلحت ہو، علانیہ کہے اور سختی سے کہے ورنہ اعراض کرے اور دعا کرے۔

منجملہ اس امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے کفار کی تبلیغ بھی ہے۔ خواہ بذریعہ تقریر خواہ بذریعہ تحریر اپنے ملک کے کفار کو بھی اور دوسرے ملک کے کفار کو بھی اور یہ بوجہ عموم شیوع احکام دینیہ کے گو اس وقت واجب نہیں رہا لیکن اگر کوئی ہمت کرے عین عزیمت ہے اور اس غرض کی تحصیل وتکمیل کے لئے اگر ان اقوام کی زبان بھی سیکھ لے تو بشرط خلوص نیت عین طاعت ہے جیسا اس وقت کوئی شخص انگریزی وغیرہ اسی غرض سے حاصل کرنا چاہئے۔

تکمیل

تبلیغ احکام کے متعلقات ہی میں سے ان احکام کی ایک خاص حفاظت بھی ہے۔ یعنی اصول و فروع اسلام پر جو حملے یا آمیزشیں ہیں خواہ وہ اہل کفر ہوں یا اہل بدعت، ان کو دفع کرنا۔۔۔۔۔ تاکہ طالبان حق شبہات سے محفوظ رہیں۔ اور اس مقصود کے لئے اگر اہل باطل پر ردّ وقدح کرنے کی حاجت ہو، یا ان سے مناظرہ کرنا مصلحت ہو، اس سے بھی پہلو تہی نہ کرے۔ اور اس زمانہ پرآشوب میں مناظرہ اگر مشروع ہے تو اسی غرض سے ورنہ تعصب اس درجہ ترقی پر ہے کہ مناظرہ سے احقاق حق، مقصود ہی نہیں رہا۔ اور اس ردّ وقدح یا مناظرہ کے لئے اگر اہل باطل کے علوم وفنون حاصل کرنا ضروری ہو۔ وہ بھی طاعت ہے۔ جیسے اس وقت سائنس وغیرہ سیکھنا۔

یہاں تک تدبیریں ہیں اصلاح کی اور اس کے بعد بھی بڑی ضرورت دعا والتجا بجناب حق ہے ؎

این ہمہ گفتیم ولیک اندر بسیچ
بے عنایات خدا ہیچیم وہیچ

ترجمہ: ہم نے سب کہدیا، لیکن حقیقت میں بات یہ ہے
ترجمہ: کہ حق تعالیٰ کی عنایتوں اور بندگان حق

بے عنایات حق وخاصان حق | گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

ترجمہ: حق کی مہربانیوں کے بغیر اگر کوئی | ترجمہ: فرشتہ بھی ہو تو اس کا اعمال نامہ بھی سیاہ ہوگا

سدِ موانع اصلاح انقلاب

اس سے سابق انقلاب امت کی اصلاح کی تدبیر کی تعیین وتفصیل مذکور تھی چونکہ ہر تدبیر پر عمل کرنے کے لئے، ساتھ اس کے موانع تاثیر سے تحرز بھی واجب ہوتا ہے۔ جس طرح امراض جسمانی میں پرہیز کی ضرورت سمجھی جاتی ہے۔ اس لئے ان تدابیر اصلاح کے ساتھ ان امور سے بچنا بھی ضروری ہوگا جو ان کے اثر میں خلل انداز ہیں۔

بیان اس کا یہ ہے کہ ان تدابیر میں سے بعض علماء کے متعلق تھیں۔ یہاں ان کے باب میں کلام مقصود نہیں۔ کیونکہ وہ خود جانتے ہیں۔ صرف ان میں جو عوام کے متعلق ہیں۔ ان پر بقدر ضرورت لکھا جاتا ہے۔ سو اس باب میں یہ امور بتلائے گئے تھے۔

(۱) کتب دینیہ کا پڑھنا یا دیکھنا یا سننا،

(۲) علماء دین سے مسئلہ پوچھنا،

(۳) وعظ سننا۔

(۴) صحبت اہل کمال

(۵) گھر والوں کو خود پڑھانا یا سنانا یا کسی کے ذریعہ سے پڑھوانا، سنوانا،

ان امور پنجگانہ میں سے ہر ایک میں بعض لوگ بے احتیاطیاں کرتے ہیں۔ جو معالجہ مطلوب میں بد پرہیزی کا حکم رکھتی ہیں۔ بالترتیب ہر ایک کے متعلق مختصراً تنبیہ ضروری ہے۔

امر اول یعنی کتب دینیہ کا پڑھنا یا دیکھنا یا سننا

اس کے متعلق آج کل بعض بکثرت یہ غلطی کرتے ہیں کہ جو کتاب دین کے نام سے دیکھی یا سنی خواہ اس کا مضمون حق ہو یا باطل خواہ اس کا مصنف ہندو ہو یا عیسائی یا دہری ہو یا مسلمان پھر مسلمان بھی گو صاحب بدعت ہی ہو ـــــ غرض کچھ تفتیش نہیں کرتے اس کا مطالعہ شروع کر دیتے ہیں۔

اور اسی میں وہ مضامین آ گئے جو کسی مسئلہ کے متعلق اخبارات میں چھپتے رہتے ہیں۔ سو اس میں چند مضرتیں ہیں۔

بعض اوقات بوجہ کم علمی کے یہ ہی امتیاز نہیں ہوتا کہ ان میں کون مضمون صحیح ہے؟ کون غلط؟ کسی غلط کو صحیح سمجھ کر، عقیدہ یا، عمل میں خرابی کر بیٹھتے ہیں۔ بعض اوقات پہلے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ امر غلط ہے مگر بعض مصنفین کا طرز بیان ایسا تلبیس آمیز یا دل آویز ہوتا ہے کہ دیکھنے والا فی الفور اس سے متاثر ہو جاتا ہے اور اس کے مقابلہ میں اپنے پہلے اعتقاد کو ضعیف اور بے وقعت خیال کر کے بعض دفعہ تو اس پہلے کو غلط اور اس پچھلے کو صحیح سمجھ لیتا ہے۔ اور بعض دفعہ اس کو گو قبول نہیں مگر متزلزل و مذبذب ہو کر کبھی دل میں رکھتا ہے۔ اور پریشان ہوتا ہے اور کبھی دوسروں سے تحقیق کرنا چاہتا ہے مگر چونکہ اس میں کچھ غموض ہوتا ہے جس کے ادراک کے لئے اس کا علم و ذہن کافی نہیں ہوتا، اس لئے سمجھ میں نہیں آتا اور بے سمجھے لایعنی سوال کر کے دوسروں کو پریشان کرتا ہے۔ اور اپنے فہم کا قصور، فہم میں نہیں آتا۔ اور جواب دینے والوں کو جواب سے عاجز سمجھ کر ان کے علم یا اخلاق میں تنگی کا حکم لگا کر ان سے بدگمان ہو جاتا ہے اور بھی انواع مفاسد پیدا ہو جاتے ہیں۔

عالم دین کی ضرورت

ان سب کا انسداد یہ ہے کہ کوئی کتاب کوئی رسالہ کوئی تقریر تاوقتیکہ کسی محقق عالم کو نہ دکھلائیں۔ اور اس سے رائے نہ لیں، ہرگز نہ دیکھیں۔

اخبارات کے بعض مفاسد اس قسم کے احقر نے ایک مستقل تحریر مسمیٰ بہ "اخبار بینی" میں ایک زمانہ میں لکھے تھے۔ جس پر بلا تدبر بعض معترضین نے غل مچایا مگر وہ تحریر بغور پڑھنے کے قابل ہے اس سے یا اس سے یہ ہرگز مقصود نہیں کہ کسی اخبار یا کسی کتاب کا مطالعہ ہر حالت میں حرام ہے!

مقصود صرف یہ ہے کہ چونکہ ان چیزوں میں بعض اوقات ایسے مفاسد ہوتے ہیں اور ان مفاسد سے بچنا ملت اسلامیہ میں واجب ہے اور بچنا بدون معرفت یعنی عالم محقق سے مشورہ لے کر اس کا اتباع ضروری ہوگا۔ افسوس ہے! کہ باوجود وضوح اس امر کے پھر اس ممانعت کو تنگ خیالی و تعصب پر محمول فرمایا جاتا ہے۔ کیا کوئی خیر خواہ باپ اپنے بچے کو زہر ملی ہوئی مٹھائی کے کھانے سے روکے، کوئی عاقل، اس باپ کو متعصب یا تنگ خیال کا لقب دے گا؟ یا غایت رافت کے ساتھ اس کو متصف

کہے گا؟ ــــ اور اگر کوئی کہے کہ ہم خذ ما صفا ودع ما کدر۔ ترجمہ (اچھی چیز کو لے لو اور بری چیز کو چھوڑ دو) کے طور پر اس کو دیکھتے ہیں۔

سو اس کا جواب، اوپر کی تقریر سے واضح ہوگیا ہے کہ اس امتیاز کے لئے علم کامل وفہم وافی کی حاجت ہے اور کلام اس کے فاقد[ف] میں ہے۔ رہا کسی کا اپنے کو فاقد نہ سمجھنا، یہ معتبر نہیں۔ بلکہ کسی عالم ماہر کا کسی کو فاقد کہنا۔ اس کے اثبات کے لئے کافی ہے۔

توراۃ کے مطالعہ سے ممانعت۔

اور یہی وجہ ہے کہ جناب رسول کریم ونبی حکیم علیہ صلوۃ اللہ تعالیٰ والتسلیم نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے راسخ العلم والعمل شخص کو ــــ توراۃ کے مطالعہ سے منع فرمایا۔ باوجودیکہ وہ فی نفسہٖ آسمانی کتاب تھی۔ گو اس میں تحریف بھی ہو گئی تھی اور پھر مطالعہ بھی تنہا نہ تھا بلکہ خود ...... حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا رہے تھے۔ اور اس میں جز محرف کا معین ومبین ہوجانا ظاہر تھا۔ اس کے بعد کسی فساد کے ترتب کا احتمال ہی نہ تھا مع ہذا پھر اس مصلحت سے کہ آئندہ کو یہ عمل ان مفاسد کے باب، مفتوح ہونے کا سبب نہ بن جائے کس سختی سے منع فرمایا؟ اور کیسی ناخوشی ظاہر فرمائی! جیسا کہ حدیث دارمی میں مذکور ہے۔

ان دلائل حسیہ وحدیثیہ کے بعد امید ہے، کہ اہل انصاف، مصلحت اندیش کو، کوئی خدشہ نہ رہا ہوگا اور جبکہ اس تقریر سے وہ کتابیں وغیرہ بھی تحرز قرار پائیں۔ جن میں مصالح کے ساتھ بعض مفاسد بھی ہوں۔ سو جن میں سرتاسر مفاسد ہی ہوں، جیسے ناول وغیرہ، جن سے اعمال واخلاق کا بڑا حصہ نہایت گندہ ہو جاتا ہے۔ ان کا مطالعہ کس طرح جائز سمجھا جائے گا؟ بالخصوص نوجوانوں اور عورتوں کو بلکہ اگر ایسی کتابیں گھر میں دیکھی جائیں، آگ میں جلا دینا چاہئے۔ یہی ان کا حق ادا کرنا ہے۔

مختصر نصاب

آب ذیل میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عام لوگوں کے لئے ایک مختصر نصاب، قابل مطالعہ کتب کا معین کردیا جائے تاکہ ان میں مشغول رہ کر مخدوش کتب سے محفوظ رہیں۔

ف - اس جگہ فاقد سے مراد وہ شخص ہے جو کامل دینی سمجھ نہ رکھتا ہو ۱۲ - محمد علی عفرلہٗ

(۱) بہشتی زیور گیارہ حصے (۲) تعلیم الدین (۳) فروع الایمان (۴) جزاء الاعمال (۵) تبلیغ دین (۶) قصد السبیل (۷) شوق وطن ـــ اگر اس سے زیادہ مطول ومفصل کی ضرورت ہو۔ کسی عالم محقق سے دریافت کر لیا جائے۔ تمام ہوا بیان امر اول کا۔

امر دوم: یعنی علماء دین سے مسئلہ پوچھنا

اس میں چند غلطیاں کی جاتی ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ کیف ما اتفق کسی سے مسئلہ پوچھ لیتے ہیں۔ بعض اوقات تو یہ بھی نہیں تحقیق کرتے کہ یہ شخص واقعی میں عالم بھی ہے یا نہیں؟ کسی کا نام ـــ "مولوی" سن لیا اور اسی سے دین کی باتیں پوچھنے لگے اور بعض اوقات عالم ہونا معلوم ہوتا ہے مگر یہ نہیں دیکھتے کہ یہ کس مشرب کا؟ کس عقیدہ کا ہے۔ ایسے شخص کے جواب سے بعض اوقات تو عقیدہ یا عمل میں خرابی ہو جاتی ہے اور بعض اوقات تردد وشبہ میں پڑ کر پریشان ہوتا ہے یا پریشان کرتا ہے۔ جیسا کہ امر اول کے بیان میں گذر چکا ہے۔

(۲) دوسری غلطی یہ کی جاتی ہے کہ ایک مسئلہ کو کئی کئی جگہ پوچھتے ہیں اور بعض اوقات جواب مختلف ملتا ہے تو اس وقت یا تو تعین راجح میں پریشان ہوتے ہیں یا جس میں نفس کی مصلحت ہوتی ہے۔ اس پر عمل کرتے ہیں اور کبھی اس کی عادت ہو جاتی ہے تو استفتار سے یہی مقصود ہوتا ہے ـــ کہ نفس موافق جواب ملے اور جب تک ایسا جواب نہیں ملتا، برابر اس کد وکاوش میں رہتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ وضع تدین سے بمراحل بعید ہے سراسر اتباع ہوی وتلعب فی الدین ہے

(۳) ایک تیسری غلطی، اس دوسری غلطی سے یہ پیدا ہوتی ہے کہ بعض اوقات ایک مجیب کا جواب دوسرے مجیب کے سامنے نقل کر دیا جاتا ہے۔ چونکہ بعض اوقات طبیعت کا رنگ خاص ہوتا ہے۔ بعض اوقات نقل کا لب ولہجہ کچھ معارضانہ ہوتا ہے اس لئے کبھی اس مجیب کی زبان سے دوسرے مجیب کی نسبت یا اس کے جواب کی نسبت کوئی نا ملائم لفظ نکل جاتا ہے پھر یہی ناقل یا دوسرا اس مجیب تک اس کو پہنچا دیتا ہے پھر وہ کچھ کہہ دیتا ہے اس کی خبر اس پہلے تک پہنچتی ہے۔ اور بعض دفعہ بلکہ اکثر ان منقولات میں بھی بہت کچھ لفظی یا معنوی تغیر وتبدل کر دیا جاتا ہے۔ اور اس طور

پر باہم ایک فساد عظیم ان میں برپا ہو جاتا ہے۔

ایک غلطی یہ ہے کہ غیر ضروری مسئلے پوچھے جاتے ہیں۔

ایک غلطی یہ ہے کہ مسائل کے دلائل دریافت کئے جاتے ہیں جن کے سمجھنے کے لئے علوم درسیہ کی حاجت ہے اور چونکہ مسائل کو وہ حاصل نہیں اس لئے دلیل کو سمجھتا نہیں اور اگر اسی خیال سے کوئی مجیب دلیل بتلانے سے انکار کرتا ہے تو اس مجیب غریب کو بد خلقی پر محمول کیا جاتا ہے۔

ایک غلطی یہ کی جاتی ہے کہ کسی سے کسی مسئلہ میں مباحثہ شروع کرتے ہیں۔ پھر اپنی تائید کے لئے فتویٰ حاصل کرتے ہیں اور وہ فتویٰ اپنے مخالف کو دکھلا کر اس پر احتجاج کرتے ہیں پھر وہ اپنے موافق فتویٰ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اس طرح خواہ مخواہ باہم جنگ وجدل کیا کرتے ہیں۔ حالانکہ عوام کو اس میں پڑنا موجب خطر ہے۔ اگر ان سے کوئی اہل باطل اُلجھے تو علماء کا حوالہ دیکر اس کو قطع کر دیا جائے۔ اگر غرض ہو گی آپ پوچھے گا۔

غلطیوں کی اِصلاح کا طریق

ان سب غلطیوں کی اصلاح اس سے ہو سکتی ہے کہ اپنا دستور العمل اس باب میں یہ رکھیں کہ جب کوئی ضروری بات پیش آوے، اپنے عمل کرنے کے لئے نہ کہ مباحثہ کے لئے، ایسے شخص سے مسئلہ پوچھیں جس کا معتبر و محقق ہونا صحیح ذریعہ سے پہلے معلوم ہو۔ اور اس پر اعتماد و اعتقاد بھی ہو۔ اور دلیل دریافت نہ کریں۔ اور کسی دوسرے عالم سے بلا ضرورت نہ پوچھیں۔ اور اگر باوجود ان سب رعائتوں کے اس کے جواب میں شبہ رہے۔ اور شفانہ ہو تو ایسے ہی صفت کے دوسرے عالم سے پوچھ لیں اور اگر جواب پہلے کے خلاف ہو تو پہلے کا جواب اس کے سامنے اور اس کا جواب پہلے کے سامنے نقل نہ کریں۔ اور جس قول پر قلب مطمئن ہو۔ اس پر عمل کر لیں اور یہ ہی عمل اس حالت میں کریں، جبکہ بلا مراجعت دوسرے عالم کے خود بخود جواب، اول کے خلاف کوئی جواب اس باب میں گوش زد ہو جائے۔

استفتاء کے آداب

اور اگر استفتاء تحریراً ہو۔ تو ان رعایات کے علاوہ اور بھی بعض رعائتوں کا لحاظ رکھیں یعنی

* سوال کی عبارت اور خط بہت صاف ہو۔

* حتی الامکان فضول، غیر متعلق باتیں اس میں نہ لکھیں۔

* اپنا پتہ اور نام صاف لکھیں۔ اگر کئی بار ایک ہی جگہ استفتے جاویں تب بھی ہر خط میں ......

* اپنا پتہ اور نام صاف لکھیں۔ اور جواب کے لئے ٹکٹ ضرور رکھدیا کریں۔ بلکہ اگر سوال دستی بھی بھیجیں تب بھی جواب کے لئے ٹکٹ رکھدیں اور پتہ اپنا پورا لکھدیں۔ شاید اس وقت جواب مسئلہ کا نہ دے سکیں تو بعد میں ڈاک میں بھیج دیں گے۔ ورنہ ٹکٹ واپس آجائے گا۔

* اگر کئی سوال ہوں تو کارڈ پر نہ بھیجا کریں۔ اور کبھی ایسا اتفاق ہوجائے تو ان سوالوں پر نمبر ڈال کر ان کی ایک نقل اپنے پاس بھی رکھ لیں اور مکتوب الیہ کو اطلاع دیدیں کہ ہمارے پاس سوالات کی نقل نمبروار ہے۔ آپ اعادہ سوال کی تکلیف نہ کریں۔ نمبروں کی ترتیب سے صرف جواب لکھدیں۔

امر سوم یعنی وعظ سننا

جس قسم کی غلطیاں امر اوّل میں کی جاتی ہیں۔ اسی قسم کی غلطیاں لوگ یہاں کرتے ہیں کیوں کہ تحریر و تقریر دلالت و احکام و آثار میں متقارب ہیں۔ یعنی لوگ ہر قسم کے واعظوں کا وعظ سن لیتے ہیں۔ اس کے وہ ہی مفاسد ہیں۔ جو امر اوّل میں تھے اور ان کا وہ ہی انسداد ہے جو مفاسد متعلقہ امر اول کا تھا۔

وعظ سننے کے آداب

جب کوئی واعظ جدید آوے، اپنے شہر یا قریب کے کسی عالم معتبر سے اس واعظ کی حالت پوچھ لے۔ اگر وہ اطمینان دلاوے تو وعظ سنے، ورنہ، نہ سنے کیونکہ بعض واعظ جاہل ہوتے ہیں اور بعض بدمذہب اور ان میں بعض اپنے مدعا کو ذہن میں جما دینے میں ملکہ رکھتے ہیں۔ اور بعض ایسے چالاک ہوتے ہیں کہ اوّل اوّل مخاطبین کے موافق کہتے ہیں پھر بعد مناسبت و موانست اپنے مسلک کی دعوت شروع کرتے ہیں بقول مولانا رحمۃ اللہ علیہ ؎

زانکہ صیاد آورد بانگ صفیر

شکاری سیٹی کی آواز نکالتا ہے

تا کہ گیرد مرغ را آن مرغ گیر

اس لئے کہ وہ پرندہ کو پکڑ لے

پس محتاط کو یہ طریقہ رکھنا چاہئیے ؎

دشمن ارچہ دوستانہ گویدت

دشمن اگرچہ آپ کو دوست خطاب کرکے پکارے

دام دان گرچہ ز دانہ گویدت

تو اس کو فریب سمجھو، اگرچہ وہ کہے کہ یہ موتی ہے

اور یہ شیوہ اختیار نہ کریں ؎

لختے بردازدل گذرد ہرکہ بہ پیشم

جو میرے سامنے سے گذرتا ہے وہ میرے جگر کا ایک ٹکڑا لیجاتا ہے

من تاش فروش دل دیوانہ خویشم

میں اپنے دل دیوانہ کی پھانک بیچنے والا ہوں۔

اور اگر باوجود احتیاط کے کوئی بات مشتبہ کان میں پڑ جائے، علماء محققین سے اس کی تحقیق کرلیں۔

امر چہارم یعنی اہل کمال کی صحبت

اس میں جو دھوکہ ہوتا ہے وہ بہت عام ہے یعنی جو علامتیں اہل کمال کی شناخت کی ہیں ان کی رعایت نہیں کی جاتی جن کو احقر نے مضمون سابق میں "قصد السبیل" سے نقل کیا ہے اس کا انسداد ان علامات کی رعایت ہے۔ بقول مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ ؎

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست

خبردار! بہت شیطان انسان کی شکل میں ہیں

پس بہر دستے بناید داد دست

پس ہر ہاتھ کو ہاتھ سے نہ ملانا چاہیئے

بری صحبت کے نقصانات

اسی کے ذیل میں اس صحبت کی مضرت بھی سمجھ لینا چاہیئے جو مقتدا بنا کر نہ ہو۔ محض دوستی کے طور پر ہو مگر وہ دوست بدین ہو ـــــ یہ بھی غلطی عظیم ہے۔ تجربہ سے ایک دوست کا اثر طبعًا دوسرے دوست پر ضرور آتا ہے اور مضر اثر، جلد آتا ہے۔ اس لئے ارشاد نبوی ہے المرءُ علی دین خلیلہٖ فلینظر من یخالله ــــ (انسان اپنے دوست کے طریقے پر ہوتا ہے۔ چاہئیے کہ وہ دیکھ لئے کہ کون اس سے دوستی گانٹھتا ہے؟) ـــــ البتہ جو ملاقات بقدر ضرورت ہو، وہ مستثنٰی ہے۔

امر پنجم یعنی گھر والوں کو خود پڑھانا

اس میں جو غلطیاں ہوتی ہیں، ان کا مجموعہ امور اربعہ مذکورہ کے بیان میں، منتشر طور پر علاج آگیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے، کہ گھر والوں کے لئے جو کتابیں تجویز کی جاویں۔ یا جو واعظ بلایا جائے ان میں رعایت امور سابقہ ملحوظ ہوں۔ اور یہ امر تصریح و تخصیص کے ساتھ اس میں قابل ذکر ہے کہ سیانی لڑکی کا مُعلّم نامحرم جوان یا میانی عمر کا جائز نہ رکھا جائے۔ وَاٰخِرُ دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین ۰

قرآن مجید کے بارے میں کوتاہیاں

(اصلاح معاملہ بہ قرآن مجید)

اس سے سابق کے مضامین میں انقلاب و اصلاح کے باب میں جو کلام ہوا تھا۔ وہ مجملی اور کلی طریق پر تھا چونکہ جزئیات خاصہ کو ان پر منطبق کرنا، طلب صادق وفہم صائب کو مقتضی ہے اور اُن دونوں کی کمی اکثر طبائع میں مشاہد ہے اس لئے مضمون مذکور کے نفع میں تام ہونے کے لئے اس کی حاجت محسوس ہوئی کہ بعض ایسی جزئیات کو جو کہ مہم اور کثیر الوقوع ہیں، لبطور انموذج مگر بقدر کافی، اسی سلسلہ میں مفصلاً و مصرحًا بھی بیان کردیا جاوے۔ چنانچہ اس مضمون سے اس کا آغاز ہے اور یہ امر بھی ضروری الذکر ہے کہ زیادہ حصہ اس سلسلہ کا اعمال ـــ اخلاق ـــ معاملات ـــ معاشرات کے متعلق ہوگا۔ اور یوں اتفاقًا کسی عقیدہ سے سادہ طرز پر کوئی بحث آجائے ممکن ہے، اب اس کا سلسلہ شروع کرتا ہوں۔

قرآن مجید کے معاملہ میں کوتاہیاں

قرآن مجید کے معاملہ میں چند کوتاہیاں کی جارہی ہیں۔

ایک یہ کہ بعض لوگ تو اس کے پڑھنے کو قابل اہتمام نہیں سمجھتے۔ پھر ان میں بھی دو گروہ ہیں۔

ایک یہ کہ ان کا عدم اہتمام محض عملاً ہے۔ یعنی اس کا استحسان یا نافع ہونا تو ان کے اعتقاد میں ہے مگر بوجہ غفلت کے اشتغال یا دوسری حاجات معاشیہ کے اس کو حاصل نہیں کرتے، نہ اپنی اولاد کے لئے اس کی سعی کرتے ہیں اس گروہ کی حالت ایک درجہ میں اخف ہے کیونکہ یہ لوگ ایک امر نافع کے تارک ہیں۔ کسی امر مضر کے مباشر و مرتکب نہیں، کیونکہ پورے قرآن کا پڑھنا مجموع امت کے اعتبار سے بغرض اس کی حفاظت کے فرض الکفایۃ ہے، البتہ قدر ما یجوز بہ الصلوٰۃ فرضٌ علی العین ہے۔ اور قدر ما یتأدیٰ بہٖ واجب القرأۃ واجبٌ علی العین ہے۔ تو یہ لوگ کسی فرض یا واجب علی العین کے تارک نہیں ہوئے۔ گو ایک برکت سے محروم ہیں اسی وجہ سے ہم نے اس کو، کوتاہی کی فہرست میں شمار کیا ہے۔

مکاتب قرآن کی ضرورت اور چندے کے آداب

علاج اس کا یہ ہی ہے کہ ان لوگوں کو اِدھر متوجہ کیا جائے۔ اور جتنا ان کا خرچ دُنیوی سمجھا جائے کسی قدر امداد مالی سے اس کا تدارک کیا جائے۔ کم از کم اُن بچوں ہی کو خوراک و پوشاک کے لئے وظیفہ دیا جائے۔ اور ہر بڑے گاؤں میں ایک ایک مکتب قرآن مجید کا قائم کیا جائے اور وہاں کے گرد و نواح کے دیہات کے بچوں کو اس میں تعلیم دی جائے۔

بڑوں کو بھی جب فرصت میسر ہو، تھوڑا وقت اس میں دیا جائے۔ یہ ممکن ہے کہ جنہوں نے شروع کیا ہے بوجہ قلت مناسبت کے یا بسبب عروض عوارض کے سب ختم نہ کر سکیں۔ لیکن تاہم ایک عدد عظیم ختم کرنے والوں کا اس سے بھی حاصل ہو جائے گا اور ایسے مکتبوں کا چونکہ خرچ زیادہ نہ ہو گا۔ اس لئے بیرونی امداد کی طرف مضطر نہ ہوں گے، ہر جگہ کے مکتب کے لئے خود وہاں کے چند صاحبوں کی امداد کافی ہو سکتی ہے مگر اس امداد سے اس کا لحاظ رہے کہ ــــــ "کسی شخص پر دباؤ ڈال کر یا شرما کر اس سے وصول نہ کیا جائے کہ علاوہ خلاف دین ہونے کے اور بے برکتی کے ایسے چندوں کو ثبات بھی نہیں ہوتا۔"

۲ دوسرا گروہ وہ ہے کہ ان کے اس عدم اہتمام کا منشا رسوءِ اعتقاد ہے یعنی تحصیل الفاظ کو ایک فضول و لایعنی حرکت بلکہ معاش مُخل سمجھ کر مضر جانتے ہیں اور پڑھنے والوں کو "احمق"

اور تاریک دماغ خیال کرتے ہیں۔ اور دوسروں کو بھی تلبیس میں ڈالتے ہیں۔

کوئی صاحب کہتے ہیں کہ جب معنے نہ سمجھے تو طوطے کی طرح پڑھنے سے کیا فائدہ ؟ کوئی صاحب کہتے ہیں کہ جب دو سال اس میں صرف ہو گئے یا حفظ کرنے میں دماغ صرف ہو گیا، پھر علوم معاش کے وقت میں گنجائش نہیں ہو گی یا اس میں دماغ کام نہ دے گا۔ کوئی صاحب کہتے ہیں کہ بچوں کو قرآن مجید پڑھانے میں اس کی بے حرمتی ہوتی ہے۔ لڑکے بے وضو ہاتھ لگاتے ہیں۔ سیپارے پھاڑتے ہیں کہیں بے تعظیمی سے رکھ دیتے ہیں۔ اس لئے ادب کا مقتضا یہ ہے کہ ان کو پڑھایا نہ جائے .... اس قسم کی باتیں ابلہ فریب تراشتے ہیں۔

یہ حضرات غور فرمائیں کہ فضول اس کو کہتے ہیں، جس میں کوئی فائدہ نہ ہو۔ اور جو شخص خدا کو خدا، رسول کو رسول اور دونوں کے کلام کو صادق مانتا ہے وہ اس کا انکار نہیں کر سکتا ہے۔ کہ فائدہ منحصر نہیں ہے فائدہ دنیویہ میں، پھر محض اس کے انتفاء سے مطلق کا انتفاء کیسے لازم آیا ؟ ... یہ مسئلہ عقلیہ ہے۔ کہ خاص کا انتفاء مستلزم نہیں ہوتا عام کے انتفاء کو۔

ہر حرف کے بدلہ دس نیکیاں

جب مخبر صادق علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے کلام ہدایت فرجام سے ثابت ہے کہ خالی الفاظ پڑھنے سے بھی ایک ایک حرف پر دس دس نیکیاں ملتی ہیں اور ثابت ہے کہ خالی الفاظ کا پڑھنا بھی اعظم سبب ہے، حق تعالیٰ کی توجہ اور قرب کا،

ہاں! کوئی ان نیکیوں کو اور حق تعالیٰ کی توجہ اور قرب ہی کو مد فضول میں شمار کرے تو اس مقام پر اس سے گفتگو نہیں ہے۔ مخاطب خاص وہ ہی شخص ہے جو خدا اور رسول کی عظمت اور صدق کا قائل ہو۔ اور جو اسی کا منکر ہو۔ اس کو بجائے اس وقت مخاطب بنانے کے قیامت کے روز انشاء اللہ تعالیٰ دکھا کر کہا جائے گا۔ هٰذا الذی کنتم بہ تکذبون (مطففین) یہ ہی ہے جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے۔

احمق کون ؟

یہ حضرات غور فرمائیں کہ اب پڑھنے والے احمق ہوئے یاان کو احمق کہنے والے ؟ اور اگر اب بھی سمجھ نہ آیا ہو تو بس یہ کہہ کر بات کو ختم کیا جائے ، ان تسخروا منا فانا نسخر منکم کما تسخرون فسوف تعلمون من یاتیہ عذاب یخزیہ ویحل علیہ عذاب مقیم ہود ۳۰ یعنی اگر تم ہنستے ہو ہم سے ، تو ہم ہنستے ہیں تم سے جیسے تم ہنستے ہو - اب جلد جان لوگے کہ کس پر آتا ہے عذاب کہ رسوا کرے اس کو اور اترتا ہے اس پر عذاب دائمی ۔

یہ حضرات غور فرمائیں کہ جب الفاظ کا فائدہ علاوہ معانی کے فائدہ کے مستقل بھی ہے تو پھر اس کو طوطے کی سی پڑھائی کہنا کیسے صحیح ہے ؟ ہم نے بہت سے انگریزی طالب علم دیکھے ہیں کہ وہ اقلیدس کی کسی شکل کا ثبوت نہیں سمجھتے مگر پھر بھی اس امید پر عبارت یاد کر لیتے ہیں ، کہ امتحان میں عبارت لکھ دیں گے چنانچہ وہ ایسا ہی کرتے ہیں ، اور پاس ہو جاتے ہیں - چونکہ سمجھنے کے علاوہ اس پر بھی یہ فائدہ خاص ، پاس ہو جانے کا مرتب ہوتا ہے . ہم نے کسی کو اس پر بیکار ہونے کا حکم لگاتے نہیں دیکھا - پھر ان سارے قضایا کی مشق کے واسطے بس دین ہی رہ گیا ہے - افسوس ! افسوس !

یہ حضرات غور فرمائیں کہ کیا کبھی جاہ و عزت کی طلب کے لئے کوئی بڑا سفر انگلستان وغیرہ کی طرف کرنے میں یا کسی دربار میں رسائی کی کوشش کرنے میں یا کسی حاکم اعلیٰ کی خوشنودی و تقرب کی امید میں مالی خرچ یا بار گوارا نہیں کیا جاتا ؟ تو کیا یہ افسوس کی بات نہیں ہے ؟ کہ خدا کی رضا و قرب و عنایت کی اتنی بھی وقعت نہیں ہے ؟ وَمَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ - اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی قدر نہیں کی جتنا اس کی قدر کا حق تھا -

حفظِ قرآن سے قوتِ حافظہ بڑھتی ہے اور علومِ معاشیہ میں کام دیتی ہے -

یہ حضرات غور فرمائیں کہ حفظ کرنے میں اگر اعتدال کے ساتھ مشقت ہو تو اس میں دماغ کا زیادہ کام نہیں ، زیادہ کام ذہانت کا ہے ، جیسا کہ ایک ڈاکٹر نے بھی بیان کیا ، البتہ کسی قدر

اشتراک قوت حافظہ کا ہے۔ جوکہ قوی دماغیہ سے ہے، سو حکمار نے اس کی تصریح کی ہے، کہ جس قوۃ سے اعتدال کے ساتھ کام لیا جائے، تو وہ اس کی ریاضت ہے، اور اس ریاضت سے اس قوت میں ترقی ہوتی ہے۔ سو اس بنار پر تو "حفظ قرآن سے قوت حافظہ بڑھے گی جو آگے علوم معاشیہ میں کام دے گی،، اور اس حافظہ کے بڑھ جانے سے دوسرے علوم میں دوسرا شخص جو کام چھ ماہ میں کر سکتا ہے۔ یہ شخص اتنا کام چار ماہ میں کر سکے گا۔ سو حفظ قرآن میں اتنی مدت بھی صرف نہ ہوگی۔ جتنی کفایت آگے نکل آئے گی ۔۔۔۔ !!

البتہ جس کو حفظ سے مناسبت ہی نہ ہو۔ اس کا ذکر نہیں ہے۔ ایسے شخص کے لئے حفظ کرانے کا ہم بھی مشورہ نہیں دیتے۔

یہ عذر تو سب سے زیادہ عجیب ہے ! کہ قرآن کی بے حرمتی ہوتی ہے کیا یہ حضرات، خدا کو مافی الضمیر پر حاضر و ناظر اعتقاد اور خیال کر کے اس پر قسم کھا سکتے ہیں ؟ کہ بچوں کو قرآن نہ پڑھانے کی رائے اس نیت پر مبنی ہے کہ قرآن کی بے حرمتی نہ ہو کیا خدا سے بھی اپنے اس مخفی حیلے کو چھپا سکتے ہیں ؟ اگر یہ ہی نیت تھی تو اچھا ہوش و عقل آنے کے بعد کتنے صاحبوں نے تحصیل قرآن کی طرف توجہ کی ، بہرحال اس گروہ کی حالت پہلے گروہ سے زیادہ خطرناک ہے۔ اور پڑھنے کا اہتمام نہ کرنا دونوں میں مشترک ہے پس ایک کوتاہی تو یہ کی جاتی ہے۔

دوسری کوتاہی یہ ہوتی ہے کہ بہت لوگ پڑھتے پڑھاتے ہیں۔ مگر پڑھ کر پھر اس کا نام تک نہیں لیتے بلکہ ان میں جو ـــــ حافظ ہیں وہ فخر کرتے ہیں کہ ہم نے سال بھر تک کھول کر بھی نہیں دیکھا باوجود اس کے ہم نے رمضان میں سنا دیا۔ اس ناواقفی کی بھی کوئی حد ہے ؟ کہ جو بات عیب کی تھی اسکو ہنر سمجھکر اس پر فخر کیا جاتا ہے ۔۔۔۔ !!

جس چیز کا انسان ارادہ کر لیتا ہے کسی نہ کسی صورت میں اس کو کر ہی لیتا ہے۔

ان صاحبوں کو سمجھنا چاہیئے کہ مقصود پڑھنے سے تو یہ تھا کہ ہمیشہ اس کی تلاوت سے برکات حاصل کی جائیں، جب یہ نہ ہوا تو پڑھا نہ پڑھا برابر ہو گیا۔ پھر تجربہ سے معلوم ہوا ہے۔ اور ایک حدیث میں بھی یہ ہی مضمون آیا ہے کہ قرآن مجید نہ پڑھنے سے اس سے ایسی بے مناسبتی ہو جاتی

ہے کہ پھر دیکھکر بھی نہیں چلتا۔ یہ تو ناظرہ خواں کے بھولنے کی حد ہے اور حافظ کے بھولنے کی حد یہ ہے کہ حفظ نہ پڑھ سکے، صحیح یہ ہی ہے اور نسیان قرآن پر حدیثوں میں وعید شدید آئی ہے، پھر یہ کہ اتنے دنوں کی، کی کرائی محنت جو کہ پڑھنے میں برداشت کی تھی۔ اس کے ضائع کر دینے کیلئے دل کیسے گوارا کرتا ہے؟ دوام تلاوت میں بعض لوگ کم فرصتی کا عذر کرتے ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ جس چیز کا انسان ارادہ کر لیتا ہے کسی نہ کسی صورت میں اس کو کر ہی لیتا ہے۔ خاص کر جبکہ کام بھی آسان ہو۔ کیا یہ بھی کوئی مشکل کام ہے؟ کہ ۲۴ گھنٹے میں سے آدھا گھنٹہ کہ مجموعہ روز و شب کے ساتھ ۱/۴۸ کی نسبت رکھتا ہے، نکال کر اس میں اگر ناظرہ خواں ہے تو ایک پارہ اور اگر حافظ ہے تو ایک یا ڈیڑھ پارہ بے تکلف پڑھ لیا کرے اور اتفاقاً ناغہ ہو جانا دوسری بات ہے اس سے زیادہ وقت تو فضولیات وخرافات میں صرف ہو جاتا ہے جس میں نہ نفع دین نہ نفع دنیا۔

کیا تو بہ تو بہ قرآن مجید کی ان فضولیات کی برابر بھی وقعت نہیں ہے! کہ فضولیات کے لیے تو فرصت ہو جایا کرے اور قرآن مجید کے لیے نہیں ہوتی؟

تیسری کوتاہی یہ ہے کہ بعض دواماً بھی پڑھتے ہیں مگر اس کی تصحیح کی طرف اصلاً توجہ نہیں فرماتے نہ مخارج کی خبر نہ صفات کا اہتمام نہ نقص و زیادت سے تحاشی،

کوئی صاحب "ض" کو صاف مخرج "ظ" سے ادا کرتے ہیں اور کوئی صاحب مخرج "د" سے ث ـــ س ـــ ص میں ان کے نزدیک کوئی فرق ہی نہیں، الف کے موقع پر نرا فتح پڑھنا اور فتح کی جگہ الف ملا دینا، بعض کی عادت ہو گئی ہے۔ نہ بے موقع وقف کر دینے سے اجتناب کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس سے بعض مواقع پر معنی میں فساد ہو جاتا ہے۔ اگر سانس ٹوٹنے سے اس کی طرف مضطر ہو۔ تو ایسا کرے کہ جس لفظ پر وقف کیا ہے۔ اس کا پھر آگے بڑھنے میں اعادہ کرے۔ البتہ وصل سے ایسا فساد لازم نہیں آتا۔

اہل علم کی کوتاہیاں

نہایت افسوس سے کہا جاتا ہے! کہ اس کوتاہی میں اہل علم کا نمبر غیر اہل علم سے کچھ بڑھا ہوا ہے۔ حتیٰ کہ ایک صاحب سورہ ناس میں "من الجنّۃ والناس" کو اس طرح پڑھتے ہیں۔

من الجنات والنس " پھر بعضے ان میں مساجد کے امام ہوتے ہیں۔ اس وقت اس غلطی کا اثر دوسروں تک بھی دو طور سے پہنچتا ہے۔

ایک یہ کہ اگر کوئی مقتدی صحیح خوان ہوا۔ تو ان کی نماز ان امام صاحب کے پیچھے نہیں ہوتی اور چونکہ غلط خواں کا حکم صحیح خواں کی نسبت سے اُمّی کا سا ہے بہ نسبت قاری کے، اس لئے اس خاص صورت میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ نہ امام کی نماز ہوتی ہے نہ دوسرے مقتدیوں کی، پس کتنی بڑی تباہی کی بات ہے؟

دوسرے اس طور سے کہ یہ امام صاحب اگر زمرہ اہل علم ہوئے، تو علماء کی عوام میں سخت بے وقعتی ہوتی ہے جس کا اثر ایک گونہ علماء کے اتباع و اقتداء تک بھی سرایت کر سکتا ہے ہر چند کہ تجوید کے وجوب کے متعلق کلام طویل و مقتضی تفصیل ہے مگر اتنی قدر میں کسی کو کلام نہیں کہ جس قسم کی غلطیوں کا ذکر اوپر ہوا ہے ان کی تصحیح واجب علی العین ہے جب تک کہ عدم قدرت و عدم مساعدت لسان متیقن نہ ہو جائے۔ جس کی موٹی دلیل یہ ہے کہ بدون اس قدر تصحیح کے قرآن کی عربیت باقی نہیں رہتی اور عربیت بدلالت خصوص لوازم قرآن سے ہے۔ پس اس کے نہ رہنے سے قرآن نہ رہے گا۔ پس اس کی ضرورت میں کیسے اشتباہ ہو سکتا ہے؟

اس میں قرآن کی یا عربی کی کیا تخصیص ہے؟ ہر زبان کی صحت اس کے خاص طرز ادا پر موقوف ہے مثلاً لفظ "پنکھا" اور "رنگ" میں اخفا ہے۔ اگر نون، میں اظہار کیا جاوے یقیناً لفظ غلط ہو جاوے گا — اور لفظ "کھنبا" او"دنبہ" میں اقلاب ہے، اگر یہ نہ ہو تو یقیناً لفظ غلط ہو جائے گا۔ مگر بات یہ ہے کہ قلوب میں ادراک نہیں رہا۔ نعماء آخرت کی رغبت، نعماء دنیا کے برابر نہیں رہی انا للہ وانا الیہ راجعون (بقرہ [۱۵۶]) (ہم اللہ تعالیٰ ہی کا مال ہیں، اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں)

تصحیح قرآن صرف دو ہفتہ میں

کل حروف اٹھائیس ہیں۔ ان میں بعض بعض تو قریب قریب صحیح نکلتے ہیں۔ ان کو مستثنیٰ کر کے جن میں اہتمام کی حاجت ہے، تقریباً ایک ربع یعنی سات ہیں، جیسے ث — ح —

د ۔ ص ۔ ض ۔ ط ۔ ظ اور جو بالکل دیہاتی ہیں۔ ان کے لئے اتنے ہی اور ہیں جیسے خ ۔ ز ۔ ش ۔ ع ۔ غ ۔ ف ۔ ق ۔ اگر کسی ماہر کو تلاش کر کے ایک گھنٹہ روزانہ مشق کے لئے نکالا جائے تو روزانہ ایک حرف کی ضروری مشق ہو سکتی ہے جس میں ایک ہفتہ اور دیہاتی کے لئے دو ہفتہ کافی ہیں۔ اگر احتیاطاً اس سے دونی مدت لی جائے۔ تو آدھا مہینہ اور ایک مہینہ غایت غایت صرف ہوتا ہے تو کیا دین کی اتنی بڑی ضرورت کے لئے اپنی اتنی بڑی عمر میں سے اتنا حصہ بھی نہیں دے سکتے ہو؟ کتنا بڑا غضب اور ستم ہے؟

اسی طرح فتح اور الف کی مقدار کا فرق، اگر ایک پارہ میں اس کی درستی ہو جائے تو تمام قرآن یکساں ہی تمام کے لئے کافی ہے۔ اگر ایک رکوع روزانہ درست کر لیا جائے، تو یہ کام بھی پندرہ بیس روز سے زیادہ کا نہیں ہے۔ پھر بقیہ قرآن بھی ہے۔ تھوڑا تھوڑا کر کے کسی ماہر کو سنا دینا۔ جو متفرق اوقات میں نہایت سہل ہے زیادہ اطمینان اور احتیاط کی بات ہے۔

بعض لوگوں کو ماہر قرآۃ میسر نہ آنے کا بہانہ ہوتا ہے لیکن اول تو اتنی تھوڑی مہارت رکھنے والے اکثر جگہ ایک دو پائے جاتے ہیں اور اگر بالفرض کوئی میسر نہیں تو چند آدمی مل کر کسی ماہر کو بلا کر رکھ سکتے ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ جہاں کوئی طبیب نہیں رہا۔ بستی والوں نے چندہ کر کے تنخواہ دار طبیب کو رکھا ہے۔ پس فرق وہی ضرورت اور عدم ضرورت کے اعتقاد یا استحضار اعتقاد کا ہے۔ یا بستی میں سے دو چار ہونہار شخصوں کو سفر میں بھیج کر ماہر بنوا سکتے ہیں۔ حق تعالیٰ کے عموم کلام میں یہ صورت بھی داخل ہے۔ فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین التوبہ [۱۲۱] سو کیوں نہ نکلا؟ ہر فرقہ میں سے ان کا ایک حصہ تاکہ سمجھ پیدا کریں دین میں) بلکہ اگر باہر سے کسی ماہر کو بلا کر رکھا جائے یا بستی میں سے کسی کو باہر بھیج کر ماہر بنوایا جائے تو اس میں ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا۔ اور ایسا ہونا بھی چاہیئے کہ بچے جس وقت قرآن پڑھیں، پڑھنے کے ساتھ ہی اس تصحیح کا اہتمام رہے یعنی اس میں گونہ تکلیف ہے کہ غلط یاد کر کے پھر تصحیح کی جائے اگر ابتدا ہی سے صحیح پڑھایا جائے، پھر بالخصوص زمانہ صبا میں تو یہ صحت ان کے لئے مثل امر طبعی کے ہو جائے اور مشقت کا ایک بڑا حصہ مختصر ہو جائے۔

امام مقرر کرنے کے آداب

اس کا بھی التزام رکھیں کہ جب کسی کو مسجد میں امام مقرر کریں۔ کسی ماہر کو اس کی متعدد مختلف سورتیں سنوادی جاویں۔ اگر وہ صحت کی تصدیق نہ کرے تو کسی ماہر کو تلاش کریں۔ اگر ارزاں نہ ملے گراں لاویں۔

کیسی ظلم کی بات ہے؟ کہ ہر دینوی کام کے لئے ذی ہنر اور ذی لیاقت آدمی ڈھونڈا جاتا ہے حتی کہ لوہار۔ معمار۔ نجار۔ بلکہ گانے بجانے والا تک بھی، اور خدا کے روبرو جو سب کیطرف سے وکیل بن کر کھڑا ہوتا ہے وہ چھانٹ کر ایسا رکھا جاتا ہے جس میں نہ کمال نہ جمال، تمام محلہ میں جو ناکارہ۔ اندھا۔ چندھا۔ فاترالحواس۔ گنوار۔ بدتمیز۔ جاہل۔ ہو غرض جو کسی مصرف کا نہ رہے، اس کو امامت کے لئے انتخاب کیا جاتا ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وانا الیہ راجعون البقرہ [۱۵۵] ہم تو اللہ ہی کا مال ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔

مشائخ اور اہل مدارس کیلئے دستور العمل

اہل مدارس اس کا التزام رکھیں کہ جو طالب علم ان کے مدرسہ میں داخل ہونا چاہیں امتحان داخلہ کا ایک جزء اور اجزاء سے زیادہ نہیں، تو برابر درجہ میں سہی صحت قرآن کو بھی قرار دیں ۔ اور بدون تجربہ صحت یا بعض حالات میں کم از کم وعدہ تصحیح تو ضرور لے لیا جاوے بدون اس کے داخل نہ کریں اور وعدہ کی صورت میں جتنے سبقوں کا وہ مستحق ہے ان میں سے ایک سبق کی جگہ اس تصحیح کو رکھیں اور اس مرحلے کو طے کرنے کے بعد پورے سبقوں کی اجازت دیں۔ اور نیز جن مدارس میں گنجائش ہے ان کو ایک مدرس تجوید کا مدرسہ میں بڑھانا ضرور ہے۔ اس طریق سے یہ فن عام ہو سکتا ہے۔

اسی طرح مشائخ کو چاہیئے کہ اپنے مریدوں کو خصوصی خلفاء کو صحت قرآن پر مجبور کریں۔ کیا ظاہر یا باطن کا مقتدا بنایا جائے؟ اور بچوں سے بھی کم ہو، کیا یہ معیوب نہیں؟

تجوید میں افراط و تفریط

چوتھی کوتاہی یہ ہے کہ بعضے تصحیح و تجوید کو بھی ضروری سمجھتے ہیں مگر کاوش اور بحث ہی تک پہنچ کر رہ جاتے ہیں۔ جیسا اس وقت لوگ ض ــ ظ میں الجھنے والے دیکھے جاتے ہیں۔ مگر انشاء اللہ تعالیٰ ادا کے نام خاک بھی نہیں، بعضے عمل تک پہنچنے کا ارادہ کرتے ہیں مگر اس کی حقیقت سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں۔ یعنی صرف لہجہ کا نام قرارت سمجھ کر اسی کا اہتمام کرتے ہیں۔ اور یا تو خود کوئی طبعی لہجہ اختراع کرتے ہیں اور یا کسی مشاق کی نقل اتار لیتے ہیں اور اتار چڑھاؤ صحت وزن میں اس قدر غلو کرتے ہیں کہ بعضے ضروریات یا مستحسنات قرآۃ بھی فوت ہو جاتے ہیں، یعنی حرف گھٹا بڑھا دیتے ہیں۔ یا غنہ یا مد حذف کر دیتے ہیں تاکہ وزن ٹھیک رہے!!

سو اس کی نسبت سرکار نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ اقرؤا القرآن بلحون العرب واصواتها وایاکم ولحون اهل العشق واهل الکتابین[1]۔ (تم قرآن شریف کو عربوں کے طریقے اور ان کے لہجے میں پڑھو عاشقوں اور اہل کتاب کے طریقوں سے بچو)

یعنی ایسے لحن سے منع فرمایا ہے اور اسکو لحون عرب سمجھنا خطاء عظیم ہے۔ جیسا شراح حدیث نے تصریح کی ہے بلکہ یہ لحن اہل عشق و اہل کتاب میں داخل ہے جس کو منع فرمایا ہے اور اگر یہ لحن عرب ہوگا تو لحن اہل عشق کون ہوگا؟ پس خود حدیث کے الفاظ تو اس زعم کا تخطیہ کر رہے ہیں۔ اور لہجہ کا اہتمام تجوید میں تفریط ہے اور بعضے حقیقت صحیح سمجھتے ہیں۔ مگر خوش لہجگی کے ایسے مخالف ہیں کہ اس کا اہتمام بلیغ کرتے ہیں کہ تحسین فوت نہ ہونے پائے اور کسی کو ذرا تحسین صوت کرتا دیکھتے ہیں تو اس پر گانے کا طعن کرتے ہیں اور یہ تجوید میں افراط ہے۔ مثل تفریط مذکور کے یہ بھی نصوص کے خلاف ہے۔

حسنِ صوت اور گانے کا فرق

زینوا القرآن باصواتکم اور نحوہ حدیث قولی (قرآن شریف کو اپنی آوازوں کے ساتھ مزین

---

[1] مشکوۃ شریف ص ۱۹۱ عن حذیفۃ رضی اللہ تعالیٰ، بحوالہ بیہقی ۱۲ محمد علی غفرلہ۔

کرو) اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس عرض پر کہ لو علمت انک تستمع لقرائی لحبّرتہٗ تحبیراً ے۲ ادنحوہ (اگر میں جانتا کہ آپ میری قرأۃ سُن رہے ہیں تو میں اس کو اور سنوارتا) آپ کا انکار نہ فرمانا حدیث تقریری اس تحسین صوت بالقصد کی مشروعیت و مطلوبیت میں نص صریح ہیں - اور یہ ہی ہے وہ تغنی جس کا امر چند حدیثوں میں مروی ہے اور اس میں اور گانے میں فرق ظاہر ہے یعنی گانے میں تو لہجہ مقصود اور دوسرے قواعد تابع ہیں۔ اگر لہجہ کے بنانے میں قواعد رہ جاویں تو پروا نہیں کی جاتی اور تحسین صورت میں قواعد مقصود اور حسن صوت تابع ہے یعنی اگر قواعد کو محفوظ رکھکر خوش آوازی ہو سکے تو اس کی رعایت کی جاتی ہے ورنہ اس کی پروا نہیں کی جاتی ہے ———— اور بلا مقصد اگر کسی شخص کی قرأۃ کا کوئی جز کسی قاعدہ موسیقی پر بھی طبیعت کے تناسب یا موزونیت کی وجہ سے منطبق ہو جاوے تب بھی وہ گانے میں داخل نہیں، جیسا کہ خود قرآن مجید میں شعریت کی جابجا نفی کی گئی ہے، مگر بعض عبارت یقیناً اوزان شعر پر منطبق ہیں۔

جیسے ثم اقررتم وانتم تشھدون ثم انتم ھٰؤلاء تقتلون البقرہ [۸۳] پھر تم نے اقرار کر لیا اور تم جانتے ہو پھر تم وہ لوگ ہو کہ ویسے ہی خون کرتے ہو آپس میں) فاعلاتن فاعلاتن فاعلات پر منطبق ہے مگر باوجود انطباق، ہرگز اس کے پڑھنے والے کو شعر کا پڑھنے والا نہ کہا جائے گا۔

البتہ اگر لقصد تطبیق پڑھے گا شعر پڑھنے والا، اور قرآن میں ایسا کرنے سے ناجائز فعل کا ارتکاب کرنے والے کہا جائے گا۔ بس یہی حالت لہجہ کی بالقصد تطبیق کے ہے غرض اس چوتھی کوتاہی کی دو جانبین ہیں۔ تفریط، افراط، دونوں سے بچنا یہ وہ ہے جس کو لحون عرب واصواتہا (عربوں کا طریقہ اور ان کی آوازیں) فرمایا گیا ہے۔

تجوید لارضاء خلق ؟

پانچویں کوتاہی یہ کہ بعضے تجوید پر قدرت حاصل کر لیتے ہیں۔ مجالس یا حالت امامت میں جب پڑھنے کا اتفاق ہوتا ہے اس پر عمل بھی کرتے ہیں مگر جب خلوت میں تلاوت یا حالت

انفرادیں نماز ادا کرتے ہیں۔ اس وقت اس کی طرف التفات بھی نہیں کرتے جس سے معلوم ہو کہ قرآن کی تصحیح سے غرض، ارضاء خلق تھی نہ کہ ارضاء خالق! کیا کسی فعل سے کسی ثمرہ کے ترتب کے لئے قوت واستعداد کا مرتبہ کافی ہے؟ یا صدور وفعلیت کی ضرورت ہی کیا تجوید پر صرف قدرت ہونے سے تجوید کے ثمرات مثل ادائے واجب وتضاعف اجر ورضائے حق وادائے حق حاصل ہوسکتے ہیں؟ یا اس کے عمل واجراء کی بھی ضرورت ہے؟

کیا کسی خارشی کو محض نسخہ کے یاد کرلینے سے اچھا ہوتا ہوا بھی دیکھا ہے؟ یا اس کے استعمال کی بھی ضرورت ہوتی ہے؟ بالخصوص سری نمازوں میں تو غُنّہ اور مدو اظہار واخفاء کا تو کیا ذکر ہے؛ غالباً بلکہ یقیناً مخارج وصفات حروف پر بھی نظر نہیں ہوتی جو کہ لوازم حروف سے ہیں اور وہ نہیں تو حروف نہیں، اور جب حروف نہیں، جو کہ بسائط ہیں تو قرآن کی عبارت نہیں جو کہ مرکب تھی، اور جب عبارت نہیں تو قرأت نہیں، تو نماز کہاں؟ فلیتدبّروا الیتذکّروا (بار بار غور وفکر کریں) اور یوں ابتلاء عام کو پیش نظر رکھ کر اس پر فتویٰ نہ دینا یہ دوسری بات ہے مگر ترک واجب کے گناہ سے بچنے کے لئے بھی عموم بلویٰ کافی ہوسکتا ہے۔ ومن لنا بذلک (اس کی گارنٹی دیتا ہے؟) اور اگر مستحسنات سے قطع نظر کی جائے مگر ضروریات کی حفاظت سے تو چارہ نہیں!

معانی قرآن سے غفلت

چھٹی کوتاہی یہ ہے کہ قرآن کے معنی جاننے کی رغبت جس قدر کہ کم پائی جاتی ہے، قریب قریب نہ ہونے کے ہے، سخت افسوس کی بات ہے! کہ جو اصل مدار ہے اسلام کا، جو منبع ہے تمام دینی علوم کا، جو اساس ہے دارین کے فلاح کا، جو خاص علاقہ ہے معاملہ وخطاب کا، اللہ تعالیٰ ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور آپ کی امت کو نہ خبر، نہ خبر کا شوق، ہماری اس جمود وخمود کی کوئی انتہا بھی ہے!! ...... شاید بعض طالب علم ناز کرتے ہوں کہ ہم کو تو شوق تھا جب ہم نے تفسیر پڑھی سو کہنا تو اور بات ہے۔ اور انصاف سے کہنا اور بات ہے۔

اگر انصاف سے غور کریں تو اس کا نام رغبت رکھنے سے خود ان کو ضرور شرم آوے گی۔ غور

کر کے بتلادیں کہ اگر تفسیر، درس میں داخل نہ ہوتی، کیا اُس وقت بھی پڑھتے ؟ چنانچہ جو کتاب تفسیر کے درس میں داخل ہے۔ اس سے زیادہ بھی کوئی پڑھتا ہے؟ بلکہ اس سے بھی مختصر کردینے پر نظر ہوتی ہے۔ اگر آخر سال میں پانچ پارے جلالین کے رہ جاویں تو کیا آئندہ سال یا پھر کسی موقع پر اس کو پڑھتے ہیں؟ یا مار مار کر جلالین ہی ختم کرلی، تو کیا تمام ضروری مضامین پر اس سے عبور ہو گیا ؟

کیا مدارک یا ابو السعود یا پوری بیضاویؒ[ؒ] میں کوئی مضمون جلالین سے زائد نہیں ہے، پھر اس کو کوئی پڑھتا ہے ؟ میں سچ کہتا ہوں، اگر جلالین بھی درس میں نہ ہوتی تو اس کو کوئی بھی نہیں پڑھتا، اور جلالین بھی پڑھی تو کیا پڑھی ؟ اس کو ختم کرکے اتنی استعداد بھی تو نہ ہوئی، کہ اگر بدون جلالین کے خالی غیر مترجم قرآن ان کے ہاتھ میں دیدیا جائے، کہ ایک رکوع کا ترجمہ اور ضروری حل کردو، تو اسی کو حل کر سکیں ؟ ہرگز نہ کرسکیں گے۔ ہاں جلالین منگا کردے دو، تو کچھ دال دلیا کرلیں گے، اس سے ثابت ہوا کہ قرآن کے معنی مقصود حاصل کرنے نہ تھے، بلکہ جلالین مقصود تھی۔ پھر کیا اس کو شوق و رغبت قرآن کہا جا سکتا ہے ؟ میری رائے میں خاص اس جزو کا کہ بدون جلالین کے مطلبِ قرآن نہ بیان کرسکیں گے۔

اہل مدارس کو مشورہ

تدارک یہ ہے کہ اہل مدارس طرز تعلیم میں کچھ ترمیم کریں، جیسے بعضی متون بدون شرح کے پڑھائی[۱] جاتی ہیں۔ اسی طرح جلالین سے پہلے قرآن مجید بھی بدون کسی خاص تفسیر کے زبانی حل کے ساتھ پڑھایا جایا کرے[۲]۔

یا تو پورا قرآن پہلے پڑھا دیا جائے یا ایسا کریں کہ مثلاً ربع پارہ اوّل خالی قرآن میں پڑھا دیا پھر اسی قدر جلالین پڑھادی اور مدرس اپنی سہولت کے لئے خواہ جلالین پاس رکھیں یا اور کوئی مبسوط تفسیر، تو طلباء کو اسی طرح پڑھنے میں اسی طرح یاد کرنے کی اور مطالعہ کرکے حل کرنے کی عادت

---

[۱] الحمدللہ دارالعلوم کراچی میں شروع ہی سے اس مبارک طریق پر کام جاری ہے ۱۲ محمد علی عفرلہٗ

[۲] جلالین، مدارک، ابوالسعود، بیضاوی الفان قرآن شریف کی مشہور تفاسیر ہیں ۱۲ محمد علی

پڑجاوے گی۔

پس اس جزو کا بہت آسانی سے تدارک ہوجاوے گا۔ چونکہ جلالین میں جمیع فنون تفسیر مذکور نہیں، اس لئے کم از کم اتقان کو ضرور داخل درس کیا جاوے، یہ بیان تھا بد رغبتی کی کوتاہی کا۔

معانیٔ قرآن میں رغبت کرنے والوں کی بے پرواہی۔

ساتویں کوتاہی ان کی ہے، جن کو معانی قرآن کی کسی درجہ میں رغبت ہے۔۔۔۔۔ مگر کوتاہی یہ ہے کہ وہ بدون اس کے، کہ کسی استاد سے یہ فن حاصل کیا ہو یا دوسرے علوم عالیہ ودرسیہ پڑھے ہوں اردو کا کوئی ترجمہ یا تفسیر خرید کر (گو مصنف کا معتبر ہونا بھی محقق نہ ہو یا اس میں احتیاط ہی کی ہو) بطور خود اس کا مطالعہ شروع کردیتے ہیں۔ پھر ان میں بھی دو قسم کی جماعت ہیں ـــ ایک معتقد علماء کی ـــ دوسرے کچھ انگریزی پڑھ کر یا انگریزی خوانوں کے پاس رہ کر خود اجتہاد کا دعویٰ کرنے والے ـــ مشترک خرابی تو یہ ہے کہ اس حالت میں فہم معانی میں بکثرت غلطیاں رہ جاتی ہیں چنانچہ اس پر واقعات کثیرہ شاہد ہیں اور راز اس میں یہ ہے کہ

(۱) اوّل تو ایک زبان جب دوسری زبان میں ترجمہ ہوکر آتی ہے۔ ضرور بعض مفہومات اصلی رنگ پر نہیں رہتے۔

(۲) دوسرے بہت سے مقامات میں خود اجمال ہے، جو بدون تفصیل کے وجوہ متعدد کو محتمل ہوتا ہے، بعض وجوہ کی تعیین بلا دلیل کرلی جاتی ہیں، جس طرح قانون کی کوئی کتاب اردو کے بڑے فاضل کو دی جائے اور وہ اس کو بیان کرے مگر قانون دان اس کو سن کر بہت جگہ غلط بتلادے گا۔

(۳) تیسرے یقیناً فہم قرآن میں بعض دوسرے فنون نقلیہ وعقلیہ کی حاجت ہے، جو شخص اُن سے بے خبر ہے وہ قطعًا غلطی میں پڑے گا۔

دوسری جماعت میں بالخصوص یہ خرابی ہے کہ ان کی غلطی پر بھی اگر کوئی مطلع کرے تو وہ اپنے کو اس بتلانے والے سے افضل اور عاقل سمجھ کر اس کی نہیں سنتے اور عقیدے میں یا عمل میں اس غلطی پر جم جاتے ہیں، پھر بعض اوقات بنا فاسد علی الفاسد کے طریق پر دوسرا اور فاسد کو اس پر

متفرغ کر لیتے ہیں۔

طریق اصلاح

ان دونوں یعنی چھٹی اور ساتویں کوتاہی کے مجموعہ کی اصلاح یہ ہے کہ اگر کسی قدر علم یا صحبت علماء کی برکت سے فہم مع حرف شناسی حاصل ہو۔ تب تو کسی محقق عالم سے کوئی ترجمہ یا مختصر یا متوسط تفسیر دریافت کر کے ان ہی عالم سے سبقاً سبقاً تمام قرآن کا ترجمہ بالتفسیر خوب سمجھ کر ختم کر لیں اور بعض مقامات جو باوجود سمجھانے کے سمجھ میں نہ آویں، یا کچھ شبہ رہے، اس کے درپے نہ ہوں، بس زبانی مقصد شرع، اس عالم سے دریافت کر کے اس پر اعتقاد رکھ کر تفتیش چھوڑ دیں۔ اور ایسے مقامات پر نشان بنا دیں۔ پھر جب تلاوت کریں تو تھوڑا سا مطالعہ اس ترجمہ یا تفسیر کا بھی کریں۔ انشاءاللہ تعالیٰ اس طرح معانی قرآن سے مناسبت بڑھ جائے گی کہ یاد اور فہم دونوں میں سہولت اور ترقی ہو گی اور اس میں سہولت اور ترقی ہونے سے طبعاً رغبت بڑھے گی، پھر دوام آسان ہو جائیگا اور تدبر و عمل میں بھی جن کا ذکر آگے آتا ہے اس سے اعانت ہو گی۔ اور اگر اس قدر استعداد نہیں ہے تو پھر اس کے معانی پر مطلع ہونے کا سہل طریقہ یہ ہے کہ

معانی قرآن پر مطلع ہونے کا سہل طریقہ

چند اشخاص مل کر، اگر کوئی عالم بلا تنخواہ میسر ہو جاویں تو فبہا، ورنہ تنخواہ پر رکھ کر ان سے استدعا کریں کہ روزانہ یا چوتھے پانچویں روز معین وقت پر ایک یا نصف رکوع کا خلاصہ، مطلب، عام فہم زبان میں بطور وعظ فرما دیا کریں۔ اسی طرح قرآن کو ختم کر دیں۔ اگر ہمت ہو تو پھر دورہ شروع کر دیں اور جو شبہ پیدا ہو، اس کو زبانی پوچھیں جو سمجھ میں نہ آوے اس کو چھوڑ دیں اور حکم شرعی پوچھ کر اس پر کاربند رہیں۔

قرآن کے الفاظ و معنی میں کوتاہیاں۔

آٹھویں کوتاہی، جو الفاظ و معنی دونوں کے متعلق ہے وہ یہ ہے ـــــ کہ بعضے لوگ الفاظ

یا معانی کو کسب دنیا کا ذریعہ بناتے ہیں مثلاً

* بعض تراویح میں اجرت پر سناتے ہیں۔
* بعضے مردوں پر پڑھکر اُجرت لیتے ہیں ـــ یہ طلب مال تھا۔
* بعضے تعریف کرانے کی غرض سے مجالس میں یا محاریب میں امام بن کر پڑھتے ہیں ـــ یہ طلب جاہ ہے، اور یہ سب الفاظ کے ذریعہ سے ہے۔
* بعضے واعظ کہہ کر نذرانہ لیتے ہیں۔ بلکہ پہلے ہی نرخ طے کر لیتے ہیں۔
* بعضے شہرت کے لئے وعظ کہتے ہیں ـــ یہ معانی کے ذریعہ مال یا جاہ کی تحصیل ہے

مسئلہ منصوصہ و اجماعیہ ہے کہ طاعت پر اُجرت لینا اور اسی طرح کا ریاءً کرنا معصیت ہے البتہ الفاظ میں تعلیم پر اُجرت لینا بقول مفتیٰ بہ اور رُقیہ پر اجرت لینا بناءً علیٰ انہ من اعمال الدنیویۃ .... اسی طرح معانی میں اگر وعظ کا نوکر ہی ہو اس وقت تنخواہ لینا یہ مستثنیٰ ہے۔ یہ مستثنیٰ اور بعض کتب فقہیہ میں جو مذکر (واعظ) کو کچھ مال لینے کی اجازت لکھی ہے۔ اس کا محمل یہ ہی ہے ورنہ مجتہدین کے کلیہ سے غیر مجتہدین کا کسی جزئیہ کو استثنار کرنا غیر معتبر ہے۔

اصلاح کی ضرورت

اس کی اصلاح میری رائے میں دو ہیں۔

ایک یہ کہ ایسے لوگوں کو کوئی دنیا کا کام بھی سکھلایا جائے تاکہ وہ مضطر ہو کر دین کو حرفہ نہ بنائیں۔ اور اس کے لئے سہل صورت یہ ہے کہ امراء چندہ کرکے جابجا صنعت و حرفت کے مدرسے کھلوادیں اور بچپن ہی سے سب کو کوئی نہ کوئی دستکاری ضرور سکھلائی جاوے۔

دوسری یہ کہ جو کسی وجہ سے نہ سیکھیں یا سیکھنے سے معذور ہوں اور اس لئے وہ خدمت دین ہی کے لئے فارغ ہوں تو بلا تعین لوگوں کو اتنی خدمت کرنی چاہیئے کہ ان کی ضروری حاجات تو پوری ہوتی رہیں تاکہ ان کی نیت بگڑنے نہ پائے۔

یہ کوتاہی الفاظ و معانی کے متعلق تو وہ تھی جس میں الفاظ و معانی کو بحال خود باقی رکھکر اس سے دنیوی غرض حاصل کی گئی۔ اس سے اقبح اور اشنع وہ ہے کہ ایسی اغراض مال و جاہ کے لئے

الفاظ یا معانی میں تحریف کا ارتکاب کیا جائے، جیسے بعض جاہل حفاظ کو دیکھا جاتا ہے کہ امتحان کے طور پر پوچھا کرتے ہیں . . . . . کہ بتلاؤ کہ الحمد میں شیطان کا نام کے جگہ آیا ہے ؟ پھر خود افادہ فرماتے ہیں کہ سات جگہ،

- ذُلِل
- ہِرَب
- کنس [1]
- کنع

اسی طرح سات گنوا دیتے ہیں ـــــ پہلے انہوں نے دلل کو ترکیب دی ہے۔ الحمدُ کے آخر اور للہ کے اول سے اور ہرب کو للّٰہ کے آخر اور ربّ العالمین کے اول سے اور کنع کو ایاک کے آخر اور نعبدُ کے اول سے اور کنس کو ایاک کے آخر اور نستعینُ کے اول سے، . . . .

اس کے لغو ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے ؟ یہ امر قیاسی تو ہے نہیں، نقل کی ضرورت ہے۔ پس ان سے تصحیح نقل کا مطالبہ کافی ہے۔

بچپن میں ایک حافظ صاحب سے سنا تھا کہ بتلاؤ " لکوبل " کہاں آیا ہے ؟ پھر فرمایا مِن قبلک وبالاٰخرۃ الخ

ایک صاحب نے فرمایا تھا، کہ قرآن میں ایک جگہ ہے اِدھر اللہ اُدھر اللہ، بیچ میں اونٹنی کا بچہ، یعنی اس آیت میں فقال لھم رسولِ اللہ ناقۃ اللّٰہ، الشمس [۱۲] (پھر کہا ان کو اللہ کے رسول نے، خبردار رہو! اللہ کی اونٹنی سے) اور بہت سی ایسی خرافات گڑھ رکھی ہیں۔ یہ تصرف فی الالفاظ ہے۔

معانی میں تصرف فاسد

بعضے معانی میں تصرف فاسد کرتے ہیں بعضے محض بعض لوگ شہرت یا تجارت کے لئے قرآن مجید کا ترجمہ یا تفسیر محض اپنی رائے سے یا اہل زمانہ کے مذاق کے اتباع سے لکھ لکھ کر شائع کرتے

---

[1] پانچواں نام کبو، چھٹا تعل اور ساتواں لعل ہے ۱۲ مولانا محمد عاشق الٰہی صاحب مدظلہ

ہیں اور اس زمانہ میں اس کا فسادِ عظیم برپا ہے، ائمہ فن نے تصریح کردی ہے کہ جبتک فنون عربیہ وعلوم شرعیہ میں کہ تعداد ان کی چودہ، پندرہ تک پہنچی ہے طاقت ومہارت نہ ہو تو تفسیر میں کلام کرنا حرام ہے۔ کیا اہل تحقیق کے تراجم وتفاسیر کافی نہیں ہیں؟ جو ان آراء کاسدہ داہواء فاسدہ کی حاجت ہوئی ؎

فی طلعۃ الشمس مایغنیک عن زحل

سورج کے ہوتے ہوئے زحل کی کیا ضرورت ہے؟

اس لئے ساتویں کوتاہی کے آخر پر جو مضمون عرض کیا ہے اس کو پھر یاد دلاتا ہوں کہ ـــــــ ایسے تراجم وتفاسیر کی خرابیوں میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

آدابِ تلاوت میں کوتاہیاں

نویں کوتاہی یہ ہے کہ اس کی تلاوت کے وقت اس کے آداب کا لحاظ نہیں کیا جاتا نہایت بے دلی سے، بے رغبتی سے، بے عظمتی سے، جتنا پڑھنا ہوا جھٹ پٹ بوجھ سا اتار کر نام کر کے اٹھ کر چلتے ہوئے، بالخصوص رمضان میں تو بعض حفاظ ایسا پڑھتے ہیں کہ قرآن کے حقوق بھی فوت ہوتے ہیں اور مقتدیوں کے حقوق بھی!

بعض نے تلاوت میں ایک اور طریق اختراع کیا ہے کہ ـــــــ ایک قاری نے ایک آیت پڑھی دوسرے نے دوسری بلکہ کبھی ایک نے آیت کا ایک ٹکڑا پڑھا اور دوسرے نے پورا کیا، بعض دفعہ سب مل کر گلا ملا کر پڑھتے ہیں اور اگر ایک کی سانس لینے سے دوسرا آگے بڑھ گیا تو وہ پھر درمیان کے اجزاء چھوڑ کر آگے سے شریک ہو جاتا ہے۔

یہ سب ظاہر ہے کہ ادب قرآن کا ضائع کرنا ہے اور اس میں تغنّی مذموم وقطعِ کلمات اور اختلالِ نظم یہ مفاسد علیحدہ رہے۔

تلاوت کے آداب

تلاوت کے آداب بہت ہیں مگر طریق ذیل انشاء اللہ تعالیٰ سب کا جامع ہے۔

* - جب قرآن پڑھنے کا ارادہ کرے، وضو کرکے روبقبلہ، اگر سہل ہو، ورنہ جیسے موقع ہو خشوع کے ساتھ بیٹھے۔

* - یہ تصور کرے کہ حق تعالیٰ مجھکو فرمائش کرتے ہیں کہ ہم کو پڑھ کر سناؤ۔

* - یہ تصور کرے کہ اگر کوئی مخلوق مجھ سے ایسی فرمائشیں کرتی تو میں کیسا پڑھتا؟ تو خدا تعالیٰ کی فرمائشیں کی تو زیادہ رعایت چاہیئے اور اس کے بعد تلاوت شروع کرے۔

اور جب یہ تصور ضعیف ہو جائے تلاوت بند کرکے اسی مراقبہ کو پھر تازہ کرے، البتہ اگر تکثیرِ تلاوت مقصود ہو اور اتنی مہلت نہ ہو کہ مقید ہو کر بیٹھ سکے تو ان آداب میں تخفیف ہو سکتی ہے۔ مگر تجوید بقدر واجب میں تخفیف ممکن نہیں۔

عمل سے غفلت

دسویں کوتاہی یہ ہے کہ بعضے سب طرح کے لیپ پوت کر لیتے ہیں مگر جو نزول سے مقصود اعظم ہے، اور قرآن کا سب سے بڑا حق ہے یعنی ــــ عمل، اس کا کچھ بھی اہتمام نہیں کرتے، چونکہ اس کے اعتقاد کی ضرورت میں کسی کو کلام نہیں اس لئے ہم اس میں تطویل نہیں کرتے۔ البتہ یہ امر قابل تنبیہ ہے کہ "عمل کا طریقہ وہی معتبر ہے جو سلف نے بتایا" اور عمل کرنے میں ان سب علوم کو دخل ہے جن کا صحیح و حجت ہونا خود قرآن نے بتلایا ہے۔ یعنی حدیث و فقہ و کلام و تفسیر الیض و تصوف، جو سلف کے خلاف نہ ہو۔

افسوس! بعضے لوگ اس وقت قرآن کا اتنا ہی حق سمجھتے ہیں کہ اس کی قسم کھالی، بیمار کو اس کی ہوا دے دی، اس سے فال نکال لی، بچہ کا نام نکال لیا، چوری کے شبہ میں لوٹے پر "یٰسین" پڑھ کر اس کو گھما دیا، کوئی مرگیا دو چار ختم پڑھوا دیئے، یا کہیں کہیں دستور ہے کہ ایک قرآن کے عوض میت کے سارے گناہ فروخت کر ڈالے یا تعویذ بنا کر بازو پر باندھ لیا۔

افسوس! کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تیئس سال تک اس کا نزول اور مخالفین کی اذیت پر تحمل بس ان ہی مقاصد کے لئے تھا؟؟

یہ دس کوتاہیاں ہیں جو بطور نمونہ کے بیان کی گئیں کسی میں ایک ہے، کسی میں متعدد، کسی

ہیں مجموع اور یہ سب متعلق تحصیل کے تھیں، اب اس کے ملحقات میں سے ایک کوتاہی۔ استماع کے متعلق ذکر کرکے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

الفاظ و معنی کے آداب میں کوتاہیاں

وہ گیارہویں کوتاہی یہ ہے کہ اس کے الفاظ یا معنیٰ کا ادب بھی ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ چناں چہ جہری نماز میں "قراۃِ امام" کی طرف توجہ نہیں کی جاتی حالانکہ امر فاستمعوا لہٗ سورہ الاعراف [۲۰۳] (تو اس کی طرف کان لگائے رہو) کو داخل نماز کے وجوب کے لئے کہا گیا ہے، خارج نماز کے تلاوت کرنے والے کی آواز پر اپنے دنیوی مخاطبات میں آواز کو بلند کیا جاتا ہے حالانکہ لا ترفعوا اصواتکم فوق صوتِ النبی (سورہ الحجرات) [۱] یعنی بلند نہ کرو اپنی آوازیں نبی کی آواز سے) علماء نے درس حدیث کے وقت رفع صوت کو منع کیا ہے۔ فضلاً عن القرآنِ (چہ جائیکہ قرآن مجید)۔

اگر کوئی پڑھنے والا غلط پڑھتا ہے اس کو بتلایا نہیں جاتا، حتیٰ کہ اساتذہ اپنے شاگردوں سے سنتے ہیں اور نہیں ٹوکتے اور وہ غلطیاں عمر بھر کے لئے ان کی گلوگیر ہو جاتی ہیں ...!!

بعض حفاظ تراویح میں دوسری جگہ جاکر پڑھنے والوں کو کبھی کھنکھٹا کر، کبھی کھنکھار کر، کبھی غلط بتلا کر پریشان کرتے ہیں، کیا قرآن مجید سننے کا یہی ادب ہے؟

اور اسی طرح استماع معانی یعنی وعظ کے وقت بعضے آدمی آپس میں باتیں کیا کرتے ہیں۔ حالاں کہ آیۃ واذا قرئ القرآن الخ (اور جب قرآن پڑھا جائے)۔ سے اور آیہ فما لھم عن التذکرۃِ معرضین (پھر کیا ہوا ہے ان کو کہ نصیحت سے منہ موڑتے ہیں) سے یہ حرام ہے ہاں کسی عذر سے وہاں نہ بیٹھ سکنا یا اٹھکر چلے جانا، مضائقہ نہیں وہاں حاضر رہ کر دوسری طرف مشغول ہونا یہ مذموم ہے۔

غرض یہ سب مذکورہ کوتاہیاں اور جو ان کے اشباہ و نظائر ہوں ان سب کا تدارک کرنا ضروری ہے۔ جیسا ہم مضمون کے درمیان میں ہر ایک کے تدارک کا نہایت آسان، آسان طریقہ بھی بتلاتے آئے ہیں، ورنہ اندیشہ ہے کہ قیامت میں کہیں ہماری وہی حکایت نہ ہو۔ وقال الرسول یارب اِنّ قومی اتخذوا ھذا القرآن مھجوراً۔ الفرقان [۲۹] (اور کہا رسول نے اے میرے رب میری قوم نے ٹھہرایا ہے اس قرآن کو جھک جھک) پھر اس وقت کی حالت دیکھ کر یہ کہنا پڑے۔

نعوذ باللہ من غضب اللہ وغضب رسول اللہ (یعنی ہم اللہ سے اللہ کے غضب سے اور اللہ کے رسول کے غضب سے پناہ پکڑتے ہیں) مگر وقت ہوگا کہ لاینفع النادم ندمہ حیث ان الندم عمل وھو دار الجزاء لا دار العمل۔ اللھم وفقنا لما تحب وترضیٰ واجعل آخرتنا خیرًا من الاولیٰ (یعنی شرمسار کو شرمندگی نفع نہ دے گی اس وجہ سے کہ ندامت ایک عمل ہے اور وہ دار الجزاء ہے نہ کہ دار العمل۔

قرآن سے نام نکلوانا ادب کے خلاف ہے

نیز بعض متفرق کوتاہیاں قرآن مجید کے معاملہ میں کہ اس کے الفاظ یا معانی یا نقوش یا اس کے مقاصد و اغراض ادب کے خلاف ہیں۔ اور بھی خیال میں آئیں وہ بلا لحاظ کسی خاص ترتیب کے معروض ہیں۔

(۱) بعض کی عادت ہے کہ بچہ کا نام رکھنے کے لیے قرآن مجید میں کسی خاص طریقہ سے جو خود ان کا مقرر کیا ہوا یا ان کے کسی معتقد فیہ سے (عام اس سے کہ اس اعتقاد کا مبنیٰ صحیح ہو یا غلط) منقول ہوتا ہے غور کرتے ہیں تو اتفاق سے اس موقع پر کوئی نام لکھا ہوا مل گیا تو وہ، ورنہ کوئی حرف جو شروع سطر وغیرہ میں مل گیا لے کر اس حرف سے جو نام شروع ہو وہ نام متعین کر دیتے ہیں۔ اور اگر جاہل ہوئے تو خود سمجھتے ہیں ورنہ دوسرے جاہل کو یوں سمجھاتے ہیں کہ قرآن مجید سے اس نام کا رکھنا نکلا ہے بعضے اس نام نکلوائی پر کچھ نذرانہ بھی وصول کرتے ہیں اور جہلا یہ سمجھ کر دیتے ہیں کہ حضرت نے بڑی توجہ سے عالم غیب کا راز منگا دیا ہے ان کی خدمت ضروری ہوگئی ہے۔ —— قرآن مجید میں جس غرض کے لیے موضوع نازل ہوا ہے جس کی تصریح خود کلام مقدس میں ہے۔ کتابٌ انزلناہ الیک مبارکٌ لیدبروا آیاتہ ولیتذکر اولوا الالباب (ص : ۳۸) یعنی (برکت والی کتاب ہے جو ہم نے آپ کی طرف اتاری ہے تاکہ دھیان کریں لوگ اس کی باتوں پر اور تاکہ سمجھیں عقل والے)۔ جس کا حاصل دین کا علم و عمل ہے، اور اگر اس پر کوئی شخص کاربند ہو اور برکت کے لئے اپنی کسی مباح غرض میں بھی اس سے کچھ اقتباس کرلے تو مضائقہ نہیں۔ بشرطیکہ اس میں کسی حد شرعی سے تجاوز نہ ہو لیکن قرآن مجید سے ان اغراض میں ایسے طور پر کام لینا کہ گویا قرآن

اسی کام کا رہ گیا ہے۔ جس کا قرینہ اور علامت یہ ہے کہ اس کے علم اور اس پر عمل کی طرف کبھی توجہ نہ کی جائے مگر ایسے موقعوں پر قرآن یاد آئے کیا یہ ظلم وضع الشئی فی غیر محلہ (بیجا استعمال) نہیں ہے؟ پھر اس پر اور مزید اگر یہ سمجھا جائے کہ اس بچہ کا یہ نام ہونا یہ مفہوم قرآنی ہے، کیا یہ افترا علی اللہ نہیں ہے؟ خاص کر وہ دوسری صورت کہ اگر حرف "خ" نکل آیا تو خدا بخش نام کو قرآن مجید کی طرف منسوب کرنا افترا در افترا ہے... !!

پھر اس پر کچھ وصول کر لینا کریلا اور نیم چڑھا کی مثال کا مصداق ہے۔ کیا یہ اشترار دنیا بالقرآن کی اقبح الافراد نہیں ہے؟

اگر نام برکت کا مقصود ہے اول تو وہ قرآن کے ایسے مطالعہ پر موقوف نہیں، حضرات انبیاء علیہم السلام کے نام پر، نام رکھ دو، اور "اسماء حسنی الہیہ" میں سے کسی نام کے ساتھ عبد لگا کر رکھ دو، بالخصوص عبداللہ و عبدالرحمان کی بالتعیین ترجیح وارد ہے، اور اگر قرآن سے ہی اس نام کا تلبس مقصود ہے تو کسی عالم محقق سے رجوع کیجئے، وہ قرآن کے کسی مضمون یا کسی لفظ کی مناسبت کے لحاظ سے خواہ، قرآن دیکھ کر ایسے طریقہ سے کہ اس میں غلو نہ ہو جیسا عنقریب نمبر ۲ میں آتا ہے۔
یا قرآن کی بے دیکھے کسی اپنی محفوظ آیت سے کوئی نام بتلادیں گے، نہ بس کی ضرورت، اور نہ اس اعتقاد کی اجازت کہ قرآن میں اس نام رکھنے کا حکم نکلا ہے،

اس قسم کی خرابیاں ان بندگان زر نے پھیلائی ہیں جو عوام کی نظر میں کوئی دینی امتیاز رکھتے ہیں۔ مثلاً خود مکر و فریب سے پیر بن گئے ہیں، یا کسی بزرگ کی اولاد میں ہوئے فی الواقع یا بالادعا ایسے امور کی نسبت حضرت عارف شیرازی[1] کا ارشاد ہے۔ د

دام تزویر مکن چوں دیگران قرآن را (قرآن کو دوسروں کی طرح جھوٹ کا پھندہ نہ بناؤ۔

---

[1] خواجہ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ (۷۱۵ھ / ۱۳۱۵ء) ان کی زندگی میں سات بادشاہ یکے بعد دیگرے حکمراں ہوئے۔ حافظ قرآن، عارف باللہ تھے، تفسیر، کشاف کا حاشیہ لکھا، معقول و منقول کی تطبیق کی۔ شیراز کے سبزہ زار "خاک مصلیٰ" میں (۷۹۱ھ / ۱۳۸۵ء) میں دفن کئے گئے۔ تاریخ وفات بھی "خاک مصلیٰ" سے برآمد ہوئی ہے۔ بجو تاریخش از خاک مصلیٰ ۷۹۱ھ یعنی اس کی تاریخ کو خاک مصلیٰ سے تلاش کرو۔ ۱۲ محمد علی

قرآن سے فال نکالنا

(۲) بعضے کسی مقصدِ مباح یا غیر مباح میں اوفق بالمصلحۃ پہلو کی تعیین کے لیے اور بعضے اس سے بڑھ کر کسی گذشتہ واقعہ کے معلوم کرنے کے لیے قرآن مجید میں فال دیکھتے ہیں اس کے کسی مضمون سے اپنے مطلب کے مناسب کوئی بات نکال لیتے ہیں، اور اس کی صحت کے معتقد ہوتے ہیں۔

افسوس! یہ آفت نیم علم لوگوں میں ہے، کیونکہ بے علم آدمی مضمون ہی کو نہیں سمجھے گا جو ماخذ ہے "فال" کا بخلاف امراءِ اول کے نام لکھا ہوا دیکھ لینا، یا کسی حرف کا کوئی نام سوچ لینا یہ تو عامی بھی کر سکتا ہے۔

ہاں زبردستی کوئی بے علم یہاں بھی بین السطور ترجمہ دیکھ کر یا کسی ذی علم سے اس آیت کا ترجمہ پوچھ کر نیم عالموں میں داخل ہو جائیں تو اور بات ہے،

بہر حال یہ کام وہ کریگا جو اول قرآن کو الٹا سیدھا کچھ سمجھے اس لیے ان لوگوں پر زیادہ افسوس ہے، اور اس ناتمام علم سے اس کو "استخارہ" پر قیاس کیا جاتا ہے جب مقیس علیہ ثابت ہو تو مقیس بھی جائز!

بعض فال دیکھنے والوں کا یا اکثر ان عام لوگوں کا جو جلسۂ فال میں موجود ہوں، یہ اعتقاد ہوتا ہے، کہ گویا خدائے تعالیٰ نے قرآن سے یہ خبر دیدی ہے، تو اب اس میں احتمال نقیض کا احتمال محال ہے، اور نہایت جرأت سے کہتے ہیں کہ واہ صاحب! کیا قرآن میں غلط لکھا ہے؟ افسوس! ان حرکات پر ہنسی شروع ہو کر اخیر میں رونا آتا ہے!

خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ نمبر ایک میں جو بعضی شکایتیں مذکور ہوئی ہیں کہ ـــــــ قرآن مجید کے علم و عمل کو چھوڑ کر، اس سے یہ کام لینا، یا اس کو مدلول قرآن اور فرمودۂ حق سمجھنا جو کہ افرادِ ظلم و افترا سے ہیں، یہاں بھی یاد دلائی جاتی ہیں کہ دونوں جگہ مشترک ہیں، اور ان کے علاوہ اور بھی بعض خاص تنبیہات قابل عرض ہیں۔

قرآن مجید میں تمام علوم ہونے کے معنی

مثلاً اس میں اس اعتقاد کے ساتھ کہ قرآن مجید میں اس واقعہ کے متعلق یہ خبر نکلی ہے ۔
" قرآن مجید میں تحریفِ معنوی لازم آتی ہے "۔ کیونکہ ظاہر بات ہے، کہ قرآن کی تفسیر دوسری ہے جس میں یہ واقعہ ہرگز داخل نہیں اور اگر کسی پڑھے لکھے ...... کو یہ شبہ ہو کہ قرآن مجید میں تمام علوم ہیں جیسا کسی بزرگ کا قول ہے ؎

جمیع العلم فی القرآن لکن تقاصر عنہ افہام الرجال ط
تمام علم قرآن میں ہے لیکن لوگوں کی ، عقلیں اس کے سمجھنے سے عاجز ہیں

سو یہ واقعہ بھی اسمیں ضرور ہے ، چنانچہ بعض اہلِ کشف نے قرآن مجید سے قیامت تک کی پیشین گوئیاں کی ہیں، اور وہ صحیح بھی ہوئی ہیں، سو جواب یہ ہے کہ قرآن مجید میں تمام علوم کے ہونے کے یہ معنی ہی مسلّم نہیں کہ علم " کونیات " کو بھی عام ہے بلکہ وہ ...... علم شرعیات ہے کہ قرآن اس کے تمام اصول پر حاوی ہے مگر وجہ دلالت و طریق استنباط، بعض علوم میں غامض ہے ، کہ بعضے علماء بھی نہیں سمجھ سکتے، اس لیئے دوسرے حجج کی حاجت واقع ہوئی ۔
رہا بعض عرفاء کا کچھ " کونیات " کو مستنبط کرنا تو وہ از قبیل تفسیر نہیں ہے ، جیسا اہلِ فال کا اعتقاد ہے، بلکہ از قبیل تعبیر ہے کہ ______ اصول اس کے خود دقیق ہیں، جو اہلِ فال کے خواب میں بھی نہیں آئے ، اور باوجود اس تمام دقت کے پھر وہ ظنّی ہیں، کیونکہ وہ خود اصول ہی کشفی ہیں، جن کی ظنی ہونے پر اہلِ حق کا اتفاق اور ان کے کلام میں اس کی تصریح ہے ، پھر اس فال دیکھنے والے کو بزرگوں کے اس قول و عمل سے انتفاع کا کیا حق رہا ؟

فال اور استخارہ کا فرق ؟

مثلاً اس کا استخارہ پر قیاس کرنا، کہ محض قیاس باطل ہے کئی وجہ سے ایک، تو یہ کہ استخارہ دلیل شرعی سے ثابت ہے ، اور یہ بقیود مذکورہ کسی دلیل صحیح سے ثابت نہیں۔

---

[1] استخارہ کا مفہوم خیر طلب کرنا ہے نہ کہ خبر ! عبدالرؤف

دوسرے یہ کہ خود مقیس علیہ بھی واقعاتِ گذشتہ کی تحقیق کے لئے نہیں،
مثلاً کسی کے یہاں چوری ہو جائے، تو استخارہ اس غرض کے لئے نہ جائز، اور نہ مفید کہ چور معلوم ہو جائے، جیسا فال والے، اس قسم کی حکایتوں کو نہ بطور ظرافت کے بلکہ بطور اعتقاد کے بیان کیا کرتے ہیں۔

استخارے کے ساتھ اعتقادِ باطل کا ہونا

کسی بادشاہ کا موتیوں کا ہار گم ہو گیا تھا، اس نے دیوانِ حافظ میں فال دیکھی، رات کا وقت تھا، چراغ ایک کنیز کے ہاتھ میں تھا، یہ مصرع نکلا ؎

چہ دلاور ست دُزدی کہ بکف چراغ دارد

یعنی چور کتنا بہادر ہے، جس کے ہاتھ میں چراغ ہے

بس بادشاہ نے فوراً اسی کنیز کو پکڑ لیا، اور تلاشی لینے سے اس کے پاس برآمد ہوا۔ اوّل تو ان قصّوں کی کوئی سند صحیح نہیں، ثانیاً اگر ایسا واقعہ ہوا ہو تو اتفاق پر محمول ہوگا، کیونکہ ملازمت کی کوئی دلیل نہیں، اور اگر تجربہ سے ملازمت پر استدلال کیا جائے، تو ہم بطور معارضہ کہتے ہیں، کہ اگر ایسا ہوا ہے، تو "بیس بار اس کے خلاف ہوا کہ فال میں کچھ نکلا اور واقعہ کچھ اور تھا" تو تجربہ یعنی تکرارِ مشاہدہ سے ملازمت ثابت ہوئی یا عدمِ ملازمت؟
غرض فال کا مقیس علیہ یعنی استخارہ، واقعۂ گذشتہ کے "علم" کیلئے نہ مفید اور نہ جائز،

تا بفال چہ رسد

اور اگر کوئی استخارہ کو اس غرض کے لئے سمجھے ہوئے ہے تو وہ اپنے غلط خیال کی اصلاح کرے کہ "بالکل اعتقادِ باطل ہے"
اور یاد رکھنا چاہیئے کہ جس طرح اس سے واقعۂ گذشتہ نہیں معلوم ہوتا، اسی طرح واقعۂ آئندہ بھی کہ فلاں بات یوں ہو گی، معلوم نہیں کیا جا سکتا،

بس استخارہ[1] کا صرف ...... اتنا اثر ہے، کہ جس کام میں تردد ہو، کہ یوں کرنا بہتر ہے ؟ یا یوں ؟ یا یہ کہ، کرنا بہتر ہے ؟ یا نہ کرنا ؟ تو اس عمل مسنون سے (کہ حاصل اس کا دعا ہے اس امر کی کہ جو میرے لئے مصلحت ہو میرا قلب اس پر مطمئن ہو جائے اور ویسا ہی سامان غیب سے ہو جائے) دو اثر ہوتے ہیں۔

* قلب کا اس شق پر مجتمع ہو جانا،
* اور اس مصلحت کے اسباب میسّر ہو جانا، بلکہ خواب نظر آنا بھی ضروری نہیں ــ

من قال سوی ذاک فقد قال محالا۔ یعنی (جس نے اس کے علاوہ کہا بیجا کہا)

اور بعض بزرگان دین سے جو بعضے "استخارے" اس قسم کے منقول ہیں جس سے واقعہ صراحۃً یا اشارۃً خواب میں نظر آجائے، سو وہ استخارہ نہیں ہے، بلکہ خواب نظر آنے کا عمل ہے۔

پھر یہ اثر بھی اس کا لازمی نہیں، خواب کبھی نظر آتا ہے، کبھی نہیں۔ ــــــــــ

ــــــــــ اور خواب بھی اگر نظر آیا تو وہ محتاج تعبیر ہے، اگرچہ صراحت سے نظر آئے، پھر تعبیر بھی جو کچھ ہوگی وہ ظنی ہے یقینی نہیں، اس میں اتنے شبہات تو بتو ہیں پس اس کو استخارہ کہنا یا مجاز ہے اگر ان بزرگوں سے یہ تسمیہ منقول ہو، ورنہ اغلاط عامہ سے ہے۔

اسی لئے محققین ایسے امور، اپنے خاص ہی لوگوں کو بتلاتے ہیں کہ ان کے قلوب بھی منور ہوتے ہیں اور عقائد بھی مطہر ہوتے ہیں، طہارتِ عقیدہ کی بدولت غلو فی الدین (دین میں حد سے زیادہ بڑھنا) سے محفوظ ہوتے ہیں، اور نورانیت کے قلب کے سبب ان کا انکشاف و منام راجح الصدق ہوتا ہے جو حقیقت ہے ظن کی، ورنہ عوام پر تو اضغاثُ احلام (پراگندہ خواب) ہی غالب ہوتے ہیں مثلاً ایسی فال وغیرہ کی بنا اور اعتماد پر کسی مسلمان سے بدگمان ہو جانا اور کسی قول یا فعل یا خیال غیر مشروع کا مرتکب ہو جانا یہ خاص خرابیاں اس عمل فال میں ہیں اور یہی حکم سب ہے عارفین کے کلام سے فال لینے کا غرض یہ عمل مروج طریق پر بالیقین مذموم ہے۔

---

[1] اگر کوئی مندرجہ ذیل دعا ۴۰ مرتبہ بعد نماز فجر ہر روز پڑھا کرے اور اپنے جائز مقصد کے لئے دعا کرے تو ان شاء اللہ حاجت پوری ہوگی۔

یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ بِرَحْمَتِکَ اَسْتَغِیْثُ اَصْلِحْ لِیْ شَاْنِیْ کُلَّہٗ وَلَا تَکِلْنِیْ طَرْفَۃَ عَیْنٍ "محمدؐ"

اگر کسی طالب کو یہ وسوسہ ہو کہ اس تقریر سے تو فال کا محض بے اصل ہونا ثابت ہوتا ہے۔
حالانکہ احادیث میں صاف موجود ہے یعجبہُ الفال الصالح اونحوہٗ - اسی طرح اکثر بعض معتبر بزرگوں
سے قرآن یا کلام عرفاء سے تفاؤل لینا منقول ہے۔

تو جواب اس کا یہ ہے کہ منشاء اس شبہ کا اشتراک لفظی ہے، ایک شریعت کی اصطلاح ہے
وہ ثابت اور ایک غلاط کی اصطلاح ہے وہ غیر ثابت۔

اس ثابت بالسنہ وعن الاکابر کی اصل آتنی ہے کہ کسی شخص کو کچھ تشویش یا فکر ہے اس وقت
اتفاق سے یا کسی قدر قصد سے کوئی لفظ خوشی و کامیابی کا اس کے کان میں پڑا یا نظر سے گزرا تو رحمتِ
الٰہیہ" سے جو امید ہر مسلمان پر فرض ہے اور اس کو کبھی پہلے سے تھی، وہ اس لفظ سے اور قوی ہوگئی
پس حاصل اس کا ـــ تقویتِ رجاء رحمت ہے اس سے آگے اختراع اور ابتداع ہے۔

قرآن مجید، عملیات اور ناجائز اغراض

(۳) بعضے قرآن مجید کو ناجائز اغراض میں، بطورِ عملیات برتتے ہیں، یہ تو عملی تقصیر ہے اور پھر
غضب یہ کہ اس کو برا نہیں سمجھتے اور یوں کہتے ہیں کہ صاحب ہم کوئی "سفلی عمل" تو نہیں کرتے
قرآن کی آیتیں پڑھتے ہیں ـــ یہ علمی یعنی اعتقادی تقصیر ہے۔

اول تو اگر جائز ہی اغراض میں عملیات کے طور پر مگر غلو کے ساتھ برتے، یعنی نہ علم سے غرض
رکھے نہ عمل سے، جب قرآن کی یہ آیتیں ڈھونڈھی جائیں تو اسی غرض سے کہ اس سے دنیا کا فلاں
کام ہو جاتا ہے اور اس سے فلاں مطلب نکلتا ہے۔ جیسے بعض امراء کے گھر میں اسی غرض سے
رکھا رہتا ہے کہ

* جب کوئی بیمار ہوگیا، اس کو قرآن کی ہوا دیدی۔
* ایک مصحف نہایت خفی قلمی یا مطبوع تعویذ بنا ہوا رکھا رہتا ہے، جب کوئی بیمار ہوا گلے میں
ڈال دیا۔ وَمِثْلُ ذَالِكَ

ـــــــــــــــ

سلہ

اس کا بھی اس تقریر سے جو نمبر اول میں مذکور ہے غیر مرضی ہونا ثابت ہے اور اگر وہ اغراض بھی ناجائز ہوں جیسے :-

(۱) یٰسین پڑھ کر چور کا نام نکالنا۔

(۲) ناجائز موقع پر محبت کی تدبیر یا زوجین میں یا باہم اقارب میں تفریق کی یا بلا اذنِ شرعی مطلق دو شخصوں میں تفریق کی تدبیر کرنا۔

(۳) کسی کو ہلاک کر دینا۔

(۴) دستِ غیب کے ایسے عمل کرنا کہ روپے رکھے ہوئے مل جایا کریں۔

(۵) جنّات کو تابع کر کے ان سے کام لینا گو جائز ہی کام ہو اور ناجائز کا تو کیا پوچھنا ...؟

پس اگر ایسے ناجائز اغراض ہوں تو ناجائز کام کے قصد و اہتمام کا معمولی گناہ تو ہے ہی جو سب جانتے ہیں، یہاں وہ گناہ اس لئے اور بھی شدید ہو جائے گا کہ اس شخص نے "کلام پاک کو ناپاک غرض کا آلہ بنایا"

پس اس کی ایسی مثال ہو گئی جیسے نعوذ باللہ کوئی قرآن کو بازاری عورت کی خرچی میں دیکر منہ کالا کیا کرے کوئی مسلمان جس میں ذرا بھی دین کی عظمت ہو اس کو جائز سمجھ سکتا ہے؟

اور اگر ان اغراض کے ناجائز ہونے میں خفا رہو، تو مفصّلاً اہل فتویٰ سے تسلی کر لیجئے۔

مختصراً اتنا یہاں بھی لکھے دیتا ہوں کہ اوّل تو چور کا نام نکلنا اس عمل سے کچھ تعلق نہیں رکھتا، یہ عامل کے یا کسی صاحبِ مجلس کے خیال کا تصرف ہے، اس کا سمجھنا مسمریزم جاننے پر موقوف ہے اور حاضرات وغیرہ جو عامل لوگ کرتے ہیں وہ اگر سب نہیں تو اکثر تو اسی قبیل سے ہیں تو اس صورت میں قرآن پڑھنا یہ نرا دھوکہ دینا ہے!

پھر یہ کہ جو نام نکلتا ہے اس کے صحیح ہونے کی کوئی دلیل نہیں، اکثر ایسا ہوتا ہے جب چاہے آزما لیا جائے کہ ایک عامل کے عمل سے ایک شخص کا نام نکل آیا، دوسرے کے عمل سے دوسرے شخص کا، مگر جو شخص پہلے کو چور سمجھتا ہو وہ اس دوسرے عامل کے پاس سے اس وقت بالکل علیحدہ ہو جانا چاہئیے، جب یہ ایسی بودی ــــ بنیاد ہے تو کسی شخص کو محض اس بنیاد پر چور سمجھ لینا یقیناً یا ظناً کہاں جائز ہوگا؟ پھر اگر اس پر تشدد کیا یا زبان سے اوروں کے

روبرو اس کا نام لیا تو یہ گناہ اور بڑھنے شروع ہوئے۔

دستِ غیب سے آمدنی اور تسخیرِ جنات ناجائز ہے

اور حُبّ و بغض مذکورین اور اہلاک کا ناجائز ہونا تو محتاجِ بیان نہیں۔ شاید دستِ غیب بالمعنی المذکور یا تسخیرِ جنات بغرضِ مباح میں شبہ ہو، تو سمجھ لیجئے کہ اس دستِ غیب میں یہ ہوتا ہے کہ جنات اس کام پر مسلّط ہو جاتے ہیں کہ بعضے عمل میں تو وہی روپیہ جس کو یہ خرچ کر چکا ہے وہ جہاں بھی ہو وہاں سے اٹھا لاتے ہیں اور بعض عمل میں دوسرا روپیہ جس جگہ سے ان کے ہاتھ آئے نکال لاتے ہیں۔

سو اس کی تو ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص خاص اس کام کے لئے آدمیوں کو نوکر رکھے کہ چوری کر کر کے مجھکو دیا کرو، اس نے یہی کام جنات سے لیا۔ اور چوری کے ناجائز ہونے کا کس کو انکار ہو سکتا ہے؟ اور اگر شبہ ہو کہ ممکن ہے کہ وہ جن اپنے پاس سے لے آتے ہوں تو چوری کہاں ہوئی؟ سو اوّل تو امکان سے دوسرے احتمالات کی نفی نہیں ہو سکتی، دوسرے اگر اپنے ہی پاس سے لاویں تب بھی ظاہر ہے کہ خوشی سے نہیں لاتے۔ ورنہ اوروں کو لاکر کیوں نہیں دیتے؟ محض جبرِ عمل سے لاتے ہیں تو کسی کو مجبور کرنا کہ اپنا مال مجھ کو دیدے خود حرام ہے اور اس تقریر سے تسخیرِ جنات کا ناجائز ہونا سمجھ میں آجائے گا۔

یعنی کسی آدمی سے جو نہ اس کا غلام شرعی ہو، نہ نوکر ہو، نہ اس کے زیرِ تربیت ہو، کوئی کام جبراً لیا جائے گو وہ کام گناہ کا نہ ہو تو یہ ظلم اور تعدّی ہے اس عامل نے اسی طرح اس جن سے کام لیا ہے جو عمل سے مقہور ہو چکا ہے اور یہ وسوسہ تو نرا جاہلانہ ہے کہ اسماء و کلمات الٰہیہ سے عمل چلانا کیسے گناہ ہو گیا؟

دیکھئے اگر کوئی شخص بڑا مجلّد قرآن زور سے کسی کے سر میں اس طرح مار دے کہ وہ مر جائے تو کیا یہ قتل اس وجہ سے کہ بواسطہ قرآن مقدس کے ہوا ہے، جائز ہو جائے گا؟ اور کیا عدالت اس پر داروگیر نہ کرے گی؟ کہ اس نے تو قرآن سے مارا ہے، اس لئے مجرم نہیں، بس اسی سے اس کو بھی سمجھ لیجئے البتہ اگر قرآن مجید کے علم و اتباع کو اصلی کام سمجھکر اس پر کاربند ہو اور کسی موقت

پر کسی جائز کام کے لئے کوئی آیت پڑھ لکھے تو نا جائز نہیں۔

قرآن مجید کو آلۂ کسب بنانا

(۴) بعض لوگوں نے قرآن مجید کو آلۂ کسب دینا و جلب مال کا بنا رکھا ہے، مختلف طور سے۔

بعض تو تراویح میں اُجرت پر سُناتے پھرتے ہیں، بعضے مردوں پر تیجے میں یا چالیسویں تک یا اس کے بعد بھی پڑھنے کا پیشہ کر لیتے ہیں، ان کا نا جائز ہونا مُکرّرات و مُرّات علماء کے فتاویٰ میں طے ہو چکا ہے۔

بعض تو اور بھی غضب کرتے ہیں یعنی یہ بھی نہیں کہ صرف عقدِ اجارہ کے بعد ہی پڑھا کریں بلکہ پہلا جو پڑھا ہوا ہے، اس کو کچھ لے کر بخشتے ہیں یہ تو اچھا خاصہ مبادلہ اور بیع ہے، جو اس اجارہ سے بھی بڑھکر ہے کہ اجارہ میں بعض اہل تحمل تاویل تو چلاتے ہیں گو چلتی نہیں، یہاں تو اس کی بھی گنجائش نہیں۔

بعض اس کے مطالب کے بیان، یعنی وعظ پر نذرانہ لیتے ہیں اور فی نفسہ اس کے جائز و نا جائز ہونے میں تو سردست اس لئے کلام نہیں کرتا کہ اس میں طول ہے، لیکن جو ہیئت اس کی شائع ہے کہ اس کو پیشہ مستقل بنا لیا ہے، اسی لئے سفر کرتے ہیں، زبان سے مانگتے ہیں، جس امر حق سے نذرانہ میں کمی آنے کا اندیشہ ہو اس کو بیان نہیں کرتے اور اس " حرفہ " میں سہولت دیکھ کر سینکڑوں جاہل ..... واعظ بن کر خلقِ خدا کو گمراہ کر رہے ہیں کیا ان مفاسد پر نظر کر کے بھی اس کو جائز کہا جا سکتا ہے ؟

البتہ تعلیم قرآن کی نوکری اور اسی طرح واعظ کی نوکری، اس میں اگر اور کوئی خرابی نہ ملالے تو مضائقہ نہیں۔

قرآن میں تحریف

(۵) قرآن مجید کی آیات کو بعض اوقات غیر معنی مقصودہ میں نطقاً یا کتابتہً برتا جاتا ہے۔

مثلاً جنتری پر یہ آیت لکھدی لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم (التین) [-۴] یعنی (ہم نے بنایا آدمی خوب سے انداز ے پر) جس کا حاصل یہ دعویٰ ہے کہ ہماری جنتری " احسن تقویم " یعنی عمدہ جنتری ہے، یا کسی کتاب کی لوح پر کوئی آیت لکھدی جس میں مطبع یا صاحب مطبع کے نام کے نام کے مناسب کوئی لفظ یا معنی ہوں یا کوئی شخص لے گذرا ہے " باؤ " یہ کہہ دیا کہ اس کی مذمت قرآن میں ہے باؤ بغضب من اللہ (البقرہ) [۶۱] (پھر اللہ کا غصہ لے کر) یہ سب تحریف ہے جس سے توبہ واجب ہے، اور بعض اوقات اس میں بعضے اہل علم جن کو کسی دوسرے فن میں زیادہ عفو وانہماک ہوتا ہے مبتلا ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ احقر نے ایک معقولی کے کلام میں اس جملۂ قرآنیہ الا لنعلم من یتبع (البقرہ) [-۱۴۳] (مگر اس واسطے کہ معلوم کریں کون تابع رہے گا) کے مشہور اشکال کے جواب میں یہ توجیہہ دیکھی ہے کہ مراد یہاں "علم تفصیلی" ہے۔ جو حادث ہے، پس اب وہ اشکال نہ رہا، حالانکہ یہ کھلی تحریف ہے کیوں کہ اصطلاحِ معقول پر علم تفصیلی عینِ معلومات ہے، تو اس کو علم کہنا محض اصطلاح ہے بطور اس کے علم کے ہوگیا ہے، سو وہ معنی مصدری نہیں ہے کہ اس سے نعلم کا اشتقاق ماننا صحیح ہو اور علم تفصیلی جس سے نعلم مشتق ہوسکتا ہے، وہ معنی مصدری لغوی ہے اور اس کے معنی ہیں انکشاف ایک جزئی کا، سو وہ جب حق تعالیٰ کی طرف منسوب ہوگا اس کا مصداق ومنشاء انتزاع قدیم ہوگا اور اس کے مقابل جو اجمالی ہے اللہ تعالیٰ اس سے منزہ ہے۔ اور جو علم اجمالی اہلِ معقول کی اصطلاح ہے وہ عین ذات ہے۔ سو ان اصطلاحوں کے خلط سے کس قدر خبط ہوگیا۔

اسی طرح "صوفیہ کی تفسیر کو تفسیر سمجھنا جائز ہے" تحقیق اس کی احقر نے " کلید مثنوی" میں لکھی ہے اور اقتباس ہماری اس مبحث سے خارج ہے کہ حقیقت میں اس کا ایراد من حیث القرآن نہیں ہے بلکہ تشبیہہ بالوارد فی القرآن وشتان بین التمثیل والتبدیل۔

سلہ مہاراجہ رنجیت سنگھ والی پنجاب نے ایک صاحب سے کہا کہ ہمارا نام قرآن شریف میں نہیں ہے؟ انہوں نے کہا حضور! موجود ہے۔ دیکھیے قرآن میں کان من الکفرین۔ "کان" کو کانا پڑھا، رنجیت سنگھ کانے تھے ۱۲

(۶) بعض لوگ قرآن کو بے وضو چھوتے ہیں یا لکھتے ہیں، اس میں کاپی نویس اور تعویذ لکھنے والے بہت مبتلا ہیں، اسی طرح ورق بردار اور پتھر جمانے والے یا پریس مین، ان سب کو باوضو رہنا چاہیئے۔ ورنہ پاک کپڑے سے چھوئیں۔

(۷) بعضے لوگ قرآن مجید کو پشت کی طرف یا اپنی نشست کی جگہ سے نیچے یا متبذّل جگہ پر رکھدیتے ہیں۔ یا قرآن کے اوپر کوئی کتاب یا قلم دوات وغیرہ رکھدیتے ہیں یا قرآن میں دوسرے کاغذات یا غلاف میں قرآن کے اوپر عینک وغیرہ رکھدیتے ہیں، یہ سب خلاف ادب ہے۔ البتہ سفر میں اگر اسباب وصندوق وغیرہ میں مستور ہو تو بمجبوری بعض آداب میں تخفیف ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اس پر بہت متبذّل میلے کپڑے کا غلاف باوجود وسعت بدلنے کے ایک گونہ قلتِ ادب ہے، گو درجہ حرمت تک نہ سہی،

(۸) قرآن مجید جب ایسا کہنہ ہو جائے کہ اس سے انتفاع ممکن نہ ہو، تو اس کو پاک جگہ دفن کر دینا چاہیئے۔ مگر اس پر مٹی نہ ڈالے بلکہ جس طرح مسلمان میت کی قبر میں تختے وغیرہ رکھ کر مٹی دیتے ہیں اسی طرح کرنا چاہیئے۔

ایسے ہی اگر کوئی قرآن ایسا غلط لکھا ہو کہ اصلاح دشوار ہو تو اس کو بھی دفن کر دینا چاہیئے اس میں اکثر لوگ جو سستی کرتے ہیں وہ "دریدہ" ہو کر منتشر ہو جاتا ہے اور افسوس ہے! کہ وہ ردی میں جا کر دواؤں کی پڑیوں میں یا بچوں کے بعض کھلونوں میں استعمال کیا جاتا ہے ایسا کرنا ہم لوگوں کی کتنی بے غیرتی ہے ۔۔۔۔!!

(۹) جس روشنائی میں کسی نجس چیز کا میل ہو اس سے قرآن لکھنا یا جس کپڑے میں ایسا قوی شبہ ہو اس کا غلاف بنانا یا جس وارنش میں ایسی چیز ہو اس کو جلد پر ملنا یہ سب گناہ ہے، چنانچہ ظاہر ہے۔

(۱۰) قرآن کی کتابت یا طباعت میں تصحیح کا اہتمام نہ کرنا یہ ایسی بلا کی بات ہے جس کا ضرر دور تک اور دیر تک وبال جان رہے گا، جتنے لوگ پڑھیں گے اور جب تک (خواہ دو سو برس کیوں نہ ہوں) یہ مصاحف رہیں گے، اس بانی مسبب کو اس گناہ کا حصہ ملتا رہے گا۔

اس وقت ذہن میں یہی "امور عشرۃ" حاضر ہوئے لیکن اگر کوئی امر رہ بھی گیا ہوگا تو انشاء اللہ تعالیٰ ان میں جو اصول کی جا بجا تقریر ہوئی ہے وہ امر بھی ان میں داخل ہوگا۔

وَاللّٰهُ الْمُوَفِّقُ لِكُلِّ مَا يَرْضٰى اَللّٰهُمَّ وَفِّقْنَا لِمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰى۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق میں کوتاہیاں

(اصلاح معاملہ متعلق بحضرت رسالت صلی اللہ علیہ وسلم)

آپ کے جو احسانات وعنایات امت کے حال، پر متوجہ و مبذول ہیں، ان کی کمیت وکیفیت پر نظر کرکے یہ حکم یقینی ہے، آپ کے حقوق امت کی گردن پر اس قدر کثیر ہیں کہ قیامت تک ان سے سبکدوشی قریب بہ محال ہے، لیکن باوجود کثرت کے وہ سب حقوق تین کلی کے احاطہ میں آئے ہوئے ہیں۔

(۱) محبت!

(۲) متابعت،

(۳) عظمت،

اور ہر چند کہ ان تینوں میں اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے باہم ایسا تعلق اور تلازم ہے کہ ایک کا وجود بغیر دوسرے کے ممکن ہی نہیں، لیکن بلاخیالِ معنی اگر صرف صورت کے درجہ کا لحاظ کیا جائے تو یہ تینوں کہیں کہیں علیحدہ علیحدہ بھی خیال میں آسکتے ہیں۔

اس وقت چونکہ اکثر طبیعتیں محض صورت پر قناعت کئے ہوئے ہیں، اس لئے ان امور کا جدا جدا موجود ہونا بکثرت واقع ہو رہا ہے اور اس معاملہ میں یہی بڑا جدید انقلاب ہے جس سے سلف صالح مبرا تھے، چنانچہ ان حضرات کے تاریخی واقعات کو جو کہ مشہور اور کتب

احادیث سیر میں مذکور ہیں۔

اس وقت کے اکثر مسلمانوں کے معاملات کے ساتھ (جن میں کچھ بطورِ نمونہ کے ذیل میں بعنوان کوتاہی مرقوم ہوتا ہے) موازنہ کرنے سے اس حکم کی صحت بداہۃً معلوم ہو سکتی ہے اور اس مضمون سے اسی انقلاب پر تنبیہ اور اس کی اصلاح کی طرف ترغیب توجہ مقصود ہے۔

جنابِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ متجددین کا معاملہ

حاصل اس کا اختصار کے ساتھ یہ ہے کہ جو طبائع زمانہ کے "جدید رنگ" میں رنگے گئے ہیں ان میں تو یہ کوتاہی مشاہد ہے کہ وہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف اس قدر دلچسپی رکھتے ہیں کہ دوسری اقوام یا مذاہب سے مقابلہ کی گفتگو کے موقع پر آپ کی سوانح عمری میں سے یا آپ کے بعض اقوال وافعال کی حکمتوں میں سے (خواہ ان کی حقیقت تک ان کے ذہن کو رسائی ہوئی یا نہ ہوئی ہو) صرف وہ حصہ جس کو تمدن سے تعلق ہے محض اس غرض سے بیان کر دیتے ہیں کہ آپ کی عظمت اور آپ کے قانون کی عزت ظاہر ہو جاوے، اور اسی کو ـــــ اسلام کی خدمت اور آپ کے "ادائے حقوق" کے لئے کافی سمجھتے ہیں۔ باقی نہ اتباع کو ضروری سمجھتے ہیں، نہ محبت کا کوئی اثر پایا جاتا ہے۔

بلکہ اتباع کو تعصب اور محبت کو وحشت سمجھتے ہیں اور سببِ خفی اس کا یہ ہے کہ اس زمانہ میں سب سے بڑا مقصد ـــــ جاہ وعزت کو دیا گیا ہے، جس کے مطلوب ہونے کا ہم کو بھی انکار نہیں، مگر کلام اس میں ہے کہ آیا وہ مطلوب بالعرض ہے یا خود مطلوب بالذات ہے؟

بہرحال چونکہ اس کو کمال بالذات سمجھا جاتا ہے، اس لئے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے لاتُعدُّ ولاتُحصیٰ کمالاتِ حقیقیۂ عظیمۃُ الشان میں سے ان کی نظر اسی کا انتخاب کرتی ہے اور دوسرے کمالات کا مثل محبتِ الٰہی وخشیت وزہد، صبر وتربیتِ روحانی، ومجاہدہ، وشغل بحق و دیگر فضائل علمیہ وعملیہ کا کبھی ان کی زبان پر نام بھی نہیں آتا۔

جس کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ گویا آپ خاص اسی غرض کے لئے مبعوث فرمائے گئے تھے کہ ایک

جماعت کو قوم بنا کر، اس کو دنیاوی ترقی کے وسائل کی تعلیم فرمادیں، تاکہ وہ دوسری قوموں پر سابق وفائق رہ کر، دنیا میں شوکت کے ساتھ زندگی بسر کرسکیں۔

کیا قرآن مجید وحدیث میں گہری نظر کرنے والا آپ کی تعلیم کا یہ خلاصہ نکال سکتا ہے؟

اہل اللہ کی صحبت وملازمت کا التزام ضروری ہے

ان صاحبوں کو اپنی اصلاح کے لئے اس کی سخت ضرورت ہے کہ علماءِ محققین وعُرفاء متحققین اہل دل کی صحبت وملازمت کا التزام کریں اور ان کی خدمت میں کچھ عرصہ تک بالکل سکوت اختیار کرکے رہیں، خود ان کے اقوال متفرقہ وارشاداتِ مختلفہ سے انشاء اللہ تعالیٰ ایک بڑی فہرست خیالات کی درست ہوجاوے گی، اس کے بعد جو شبہات رہ جاویں ان کو ادب کے ساتھ ان کے حضور میں پیش کریں اور توجہ وانصاف کے ساتھ جواب سنیں۔

ان کو اس زمانۂ سکوت میں جو اصول وقواعد سننے اور ذہن نشین کرنے کا اتفاق ہوا ہے، وہ اصول ان جوابوں کے سمجھنے میں نہایت معین ہوں گے اور اطمینان وشفائے کلی میسر ہوگی۔

اس طریقِ اصلاح کو جو حکمی مجرب ہے، سرسری خیال نہ فرمادیں اور نیز حدیث میں "کتابُ الرّقائق وابوابُ الزّھد"، کا بار بار مطالعہ فرمادیں یہ کلام تو ان لوگوں کے مذاق پر تھا جو نئی روشنی کے تابع ہو رہے ہیں۔

اہلِ محبت کی کوتاہیاں

اب دوسرے باقی حضرات کی کیفیت معروض ہے کہ ان میں سے بعض میں محبت کے ظاہری آثار بھی پائے جاتے ہیں، مثلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں اشعار مدحیہ پڑھنا یا شوق سے سننا ان سے متاثر ہونا، کیفیت طاری ہوجانا، کبھی نعرہ لگانا، کثرت سے آپ کے ذکر مبارک کی مجالس منعقد کرنا، وَمِثلِ ذَالِکَ

لیکن ان میں یہ کوتاہی دیکھی جاتی ہے کہ اس کو کافی سمجھکر حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ فرمودہ احکام کی بجاآوری اور متابعت کے اہتمام کو ضروری نہیں جانتے، اول تو

خود ان اعمال مذکورہ میں بھی، جن کو وہ محبت کے عنوان سے اختیار کرتے ہیں بسا اوقات حدودِ شرعیہ کو محفوظ نہیں رکھتے، پھر دیگر اعمال و معاملات میں تو نہ عنوانِ محبت رہتا ہے، نہ اعمالِ محبت!

- کسی کو نماز کا یا جماعت کا اہتمام نہیں
- کسی کو رشوت و ظلم سے باک نہیں
- کوئی مسکرات اور حرام لذات میں مبتلا ہے۔
- کوئی شرکیات و بدعیات کو دین سمجھکر کر رہا ہے، سبب اس کا بے علمی یا کم علمی ہے یا غلط علمی !!

اس کی اصلاح یہ ہے کہ کتب حدیث میں سے ★ ابوابُ الایمان ★ وابوابُ العلم ★ وباب الاعتصام؟ بالکتاب والسنۃ ★ ابوابُ الفتن ★ ابواب الصفۃ جہنم واحوالُ القیامۃ کو مدت تک مطالعہ میں رکھیں اور ان ابواب کے مطالعہ سے علماءِ متبعینِ سنت سے محبت اور ان کی شناخت ہو جاوے گی اس وقت ایسے حضرات کی صحبت اختیار کرنا، اس اصلاح اور علاج کی تکمیل اور پختگی ہوگی۔

اپنے کو مقدس اور دوسروں کو جہنمی سمجھنے والوں کی کوتاہیاں

اب صرف ایک جماعت اور رہ گئی کہ جن کو "احکام" کی متابعت کا ضروری ہونا پیشِ نظر ہے اور کم و بیش اس کا اہتمام بھی ہے، مگر کوتاہی اتنی ہے کہ ان میں کیفیتِ خشوع اور لین کی نہیں آئی، جو غلبۂ محبت کو لازم ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ ابھی ان میں اتباع کی حلاوت جو کہ محبتِ خاصہ کا اثر ہے پیدا نہیں ہوئی۔

پس ان کا طرزِ عمل بالکل ایسا ہے، جیسے کسی نوکر کو اپنے آقا سے صرف "ضابطہ کا تعلق ہو کہ خدماتِ مفوضہ میں تو فروگذاشت نہیں کرتا ——— مگر وقت پورا کر دینے کے بعد) نہ ایک منٹ ٹھیرتا ہے، نہ کبھی کوئی زائد خدمت کرتا ہے، نہ آقا کا کبھی ذکرِ خیر کرتے ہوئے دیکھا گیا، نہ آقا کے اہل و عیال کا ادب و احترام کرتا ہے نہ اپنے خواجہ تاش لوگوں سے (یعنی ایک آقا کے نوکروں سے) کوئی واسطہ سلام و کلام کا رکھتا ہے یہ تو خشکی ہی تھی اس سے بڑھکر

یہ کرتا ہے کہ بجز اپنے سب خواجہ تاشوں کو نافرمان اور حقیر سمجھکر ان سے لڑتا بھڑتا ہے اور اپنی بجا آوریٔ خدمت پر ہمیشہ ناز اور فخر کرتا ہے اور اس وجہ سے سب سے الجھتا ہے اور جنگی فہمائش کرنے کا آقا نے نرمی کے ساتھ حکم دیا ہے، ان سے یہ سختی کرتا ہے اور جن "کوتاہیوں" سے آقا درگذر کر دیتا ہے، یہ ان میں بھی مدعی بن کر کسی کو مارتا ہے اور کسی کو گالی دیتا ہے ظاہر ہے اس صورت میں یہ "نوکر" آقا کی نظر سے گر جائے گا۔ اور ان بداخلاقیوں کی بدولت، جو کہ آقا کی مرضی کے بھی خلاف ہیں، اس کی خدمت کا اثر اور ثمرہ بھی ضعیف ہو جائے گا۔

بعینہٖ یہی حالت ان لوگوں کی ہے جو کسی قدر نماز، روزہ اور بعض معاملات بھی درست کر کے، اپنے کو مقدس اور متبع اور تمام دنیا کو فاسق، بدعتی، کافر، جہنمی سمجھ بیٹھتے ہیں اور خفیف خفیف امور میں بھی ان سے الجھتے ہیں اور ہر شخص سے فساد و فتنہ کرتے ہیں۔

بعضے ان عوام سے گذر کر علماء اور بعض ائمہ یا حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان میں بدگمانی کر کے بدزبانی کرنے لگتے ہیں، اسی کو دین کی بڑی حمایت اور خدمت سمجھتے ہیں......!!

جس ذات مقدسہ کے اتباع کا دعویٰ ہے، خود آپ کے ساتھ یہ برتاؤ ہے کہ آپ کا نام مبارک ادب سے لیتے ہیں، نہ کبھی آپ کا ذکرِ مبارک شوق سے کرتے ہیں، نہ کبھی ذکرِ مبارک سن کر گداختہ ہوتے ہیں، نہ درود کا کوئی معمول انہوں نے ٹھہرایا ہے نہ آپ کے محبوبوں (یعنی علماء و صحابہ و اہل بیت) سے ان کو کوئی تعلق، محبت و احترام کا معلوم ہوتا ہے!

ان امور میں بعض تو موجب خسران و عصیان ہیں اور بعض سببِ حرمان ہیں کیونکہ اخلاق ظاہرہ و باطنہ کی اصلاح فرائض میں سے ہے، جس میں خلل اندازی عصیان ہے، اسی طرح آپکے وارثان علوم سے عظمت و احترام کا تعلق اور آپ کی امت سے شفقت و رحمت کا تعلق رکھنا بھی واجب ہے، جس کا ترک یقینی خسران ہے۔

باقی جو آداب خاصہ و حقوق محض عباداتِ نافلہ کے درجہ میں ہیں، ان کی کمی بھی "خاص برکات" سے محرومی تو ضروری ہے۔

اس کوتاہی کی اصلاح کاملین اہل اللہ کی صحبت اور کتب سیر نبویہؐ و حقوق مصطفویہؐ مثل "شفاء" قاضی عیاض رحمۃ اللہ وغیرہ اور کتب اخلاق و سلوک کا مطالعہ اور ان پر عمل کرنے کا اہتمام ہے۔

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چند تعلقات ؟

ہر امتی کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارے چند تعلقات ہیں۔

- ایک تعلق یہ کہ آپ نبی اور ہم .... اُمتی!
- آپؐ حاکم اور ہم محکوم،
- آپؐ دارین میں محسن، ہم زیر بارِ احسان
- آپؐ محبوب، ہم..... مُحب

اور ان میں سے ہر تعلق جب کسی کے ساتھ ہوتا ہے تو اس پر خاص خاص حقوق و آداب کا مرتب ہونا معلوم اور مسلّم، اور معمول ہے پس جب آپ کی ..... ذاتِ با برکات میں سب تعلقات مجتمع ہوں اور پھر سب اعلیٰ اور اکمل درجے کے تو آپ کے حقوق بھی ظاہر ہیں کہ کس قدر اور کس درجے کے ہوں گے، ان سب کے ادا کرنے کا دل سے اور التزام سے ایسا اہتمام کرنا چاہیئے کہ وہ کثرت عادت اور استحضارِ الفت سے شدہ شدہ طبعی ہو جاویں اور پھر بھی آپ کے حقوق کے مقابلہ میں اپنی اس خدمت کو در حقیقت اس کا نفع اپنی ہی طرف عائد ہے، ناتمام سمجھے۔

یہ مختصر مضمون ختم ہوا اور اس کے ختم ہونے کے وقت یاد آیا کہ احقر نے ایک رسالہ "نشر الطیب" متوسط حجم کا سیَر نبویہ میں لکھا ہے، میں امید کرتا ہوں کہ وہ اس مختصر کی شرح کے لئے کافی اور بقصدِ اعتقاد و عمل اس کا مطالعہ میں رکھنا، ان سب اصلاحات کے لئے انشاء اللہ کامل ہو سکتا ہے، دعائے[1] اشاعت فرمایئے والسلام۔

---

[1] یہ کتاب شائع ہو گئی ہے اور کتب مکتبہ دار العلوم سے طلب فرمایئے ۱۲

تتمۂ سابق

یہ تتمہ پہلے مضمون سے الگ کوئی مضمون نہیں ہے بلکہ ایک درجہ میں گویا اُسی کی تفصیل اور شرح ہے، مضمونِ سابق میں زمانہ کا رنگ قبول کرنے والی طبائع کی نسبت جس کوتاہی کا بیان ہوا ہے اس کا تتمہ یہ ہے کہ ایسے لوگ درحقیقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے تینوں حقوق میں تقصیر کئے ہوئے ہیں، متابعت و محبت کا وجود نہ ہونا تو ظاہر ہے اور پہلے مضمون میں اس کو صراحت سے بیان کر دیا گیا ہے البتہ ان کے اس عمل سے کہ ان کی زبان یا قلم سے بعض ایسے مضامین صادر ہوتے ہیں کہ ان سے آپ کی عظمت یا آپ کے قانون کی عزت ظاہر ہوتی ہے، یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ شاید وہ آپ کا حقِ عظمت ادا کرتے ہیں، لیکن اگر ذرا نظر کو عمیق کیا جائے تو ثابت ہو جائے گا کہ یہ احتمال بھی واقعیت نہیں رکھتا۔

جناب محمد مصطفےٰ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت بحیثیت حامل وحی ہونے کے

حقیقت یہ ہے کہ آپ کی جس عظمت میں گفتگو ہو رہی ہے وہ عظمت ہے جس کے ساتھ آپ حامل وحی ہونے کی حیثیت سے متصف ہیں اور ان لوگوں کی تحریر و تقریر میں نظر کرنے سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے قلوب میں آپ کی جو عظمت ہے، وہ اس حیثیت سے نہیں بلکہ ایک حکیم تمدن ہونے کی حیثیت سے ہے۔

کیوں کہ ان دو عظمتوں کے آثار کا موجود نہ ہونا ہمارے دعوے کی دلیل ہے۔ چنانچہ اعتقادِ عظمت نبوی کے آثار یہ ہیں کہ آپ کے احکام سنتے ہی یہ معلوم ہو کہ گویا حق تعالیٰ نے ہم سے خود فرما دیا ہے اور یہ کہ اس حکم کے قبول کرنے میں حکمت و مصلحت سمجھنے کا ہرگز انتظار نہ ہو۔

بلکہ اگر بادی النظر میں کسی حکمت کے خلاف بھی معلوم ہو، تب بھی اسی خوشی سے قبول کرے جیسے حکمت معلوم ہونے کے وقت کرتا اور نہ بدون حکمت سمجھے ہی اس حکم کی وقعت میں کچھ کمی

ہو بلکہ جس طرح ادنیٰ خدمت گار شاہی حکم سن کر مغلوب وَالِہٗ[1] ہو کر دیوانہ وار، اس کی بجا آوری کے لئے دوڑتا ہے اسی طرح اس کی کیفیت ہو جائے اور یہ کہ اس حکم کے خلاف کا مستحسن ہونا خیال میں بھی نہ آئے۔

بلکہ اجمالاً یوں سمجھیئے کہ بس تمام خیر و برکت اور حکمت و مصلحت اور فلاح و صلاح اسی میں منحصر ہے، خواہ ہمارا ذہنِ کوتاہ اس کی تفصیل تک پہنچے یا نہ پہنچے، بقول حضرت عارف گنجوی رحمۃ اللہ ؎

زبان تازہ کردن بآقرارِ تو　　　نینگیختن علّت از کارِ تو

(آپ کے اقرار کے ساتھ زبان کو تازہ کرنا ہے نہ کہ آپ کے کام میں کوئی علت نکالنا)

سب سے زیادہ سلیم و صالح طبائع کا حال

صرف حکیم ممدّن ہونے کے لحاظ سے، جو اعتقادِ عظمت ہوتا ہے اس کے آثار یہ ہیں کہ حکم سن کر اتنا ہی اثر ہو جو ایک مخلوق ذی رائے کی رائے کو سُن کر ہوتا ہے اور یہ کہ اس کے قبول کرنے میں یا اس کو بنظرِ وقعت دیکھنے میں اس کا بھی انتظار ہو کہ اس میں عقلی (اور عقلی میں بھی دینوی) مصلحت کیا ہے؟ جب تک مصلحت نہ معلوم ہو اس میں سخت تردد و خلجان رہے اور ہرگز اس پر عمل کرنے میں شرحِ صدر نہ ہو۔

خود بھی ایک قسم کی تنگی اور جبرِ و تحکّم کا سا اثر رہے اور دوسروں کے سامنے بھی اس کا دعویٰ کرتے ہوئے، ایک گونہ خجلت اور بے وقعتی کی سی کیفیت رہے۔ اور بار بار اس حکم کی جانب مخالف کی ترجیح کا حکم اور اس کی تمنا کا قلب پر غلبہ رہے اور ہرگز اس کے صحیح ہونے کا دل، کھول کر حکم نہ کر سکے۔

بلکہ اس میں فکر رہے کہ کسی طرح اس کا شرعی ہونا ثابت نہ ہو اور جب اور کچھ نہ ہو سکے تو بعض تاویلات سے اس حکم کے شرعی ہونے کا انکار کر دے، کبھی اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہونے میں شبہات پیدا کرے، بلکہ اس کو راویوں کی نقل کی غلطی

---

[1] وَلہ باب سمع سے آتا ہے وَالِہٗ اسم فاعل کا صیغہ ہے حیران ہونا ۱۲

یا ان کی رائے کی آمیزش کا اثر بتلاوے۔

کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہونے کو تسلیم کر کے خود آپ کی نسبت کسی ضرورت و مصلحت وقت کے اتباع کا دعویٰ کرے اور چونکہ وہ مصلحت باقی نہ رہی لہٰذا اس حکم کو بھی موجود نہ سمجھے، غرض ہزاروں حیلے نکالے، مگر اس حکم کو نہ مانے یا اگر مانے تو اعتقاد سے نہ مانے، بلکہ بدنامی سے بچنے کو یا قومی شیرازہ کے منتشر نہ ہونے کی ضرورت سے ملنے یا اعتقاد ہی سے مانے، مگر نشاطِ خاطر کے ساتھ نہ مانے، بلکہ مذہبی مجبوری سمجھ کر مانے اور یہ ان سب میں سے زیادہ سلیم و صالح طبائع کا حال ہے)

یہ وہ مراتب ہیں جو کم و بیش سب کفر سے ملے ہوئے ہیں، کوئی صریح کفر ہے کوئی خفی کفر ہے، کوئی کفر بننے کو ہے، کما لا یخفی علی المتفطن السلیم۔

جب دونوں اعتقادوں کے آثار جُدا جُدا معلوم ہو گئے، آگے ہر شخص کو مشاہدہ سے اپنے اندر بھی، ان آثار کا وجود و عدم معلوم ہو سکتا ہے اور اس سے ہمارے دعویٰ سابقہ کا صدق بخوبی واضح ہو جائے گا (اس مضمون کی شرح زیادہ تحقیق کے ساتھ مطلوب ہو، تو مضمون "عظمتِ وحی" رقمزدہ حضرت (شیخ الہند) مولانا محمود حسن صاحب دامت فیوضہم جزاء القاسم" کے نمونہ میں شائع ہوا ہے ملاحظہ فرما لیا جائے) ہماری اس تقریر کے یہ معنی نہ سمجھیں جائیں کہ احکامِ شرعیہ حکمت سے خالی اور عاری ہیں ما شا و کلا ـــــــــ بلکہ مقصود یہ ہے کہ ان کا اتباع اور ان کی خاص عظمت کا اعتقاد فہمِ حکمت پر موقوف نہ ہونا چاہیئے۔ ہاں وہ خود ایک مستقل علم ہے کہ اس کو اسرارِ شریعت کا لقب دیا جاتا ہے مگر اس کے اہل خواص علماء زبین ہیں عوام الناس کو اس سے بجائے نفع کے ضرر کا احتمال غالب ہے کئی وجہ سے۔

ایک اس لئے کہ ان میں سب تو منصوص ہیں نہیں اجتہادی بکثرت ہیں جن میں احتمال خطا کا بھی ہے سو اگر کبھی اس کا غیر صحیح ہونا ظاہر ہو گیا اور عامی کے خیال میں اس حکم کی وہی حکمت یقینی تھی تو اس کے صحیح نہ ہونے سے اس حکم کو غیر صحیح سمجھ بیٹھے گا۔ بخلاف خواص کے کہ وہ اس کو یقینی علت اور مبنی حکم کا نہ سمجھیں گے۔ اس لئے حکم میں ان کو کبھی کوئی خدشہ نہ ہو گا۔

دوم اس لئے کہ کبھی کوئی مبنی اور حکمت صحیح معلوم ہوگی لیکن بعض اوقات وہ وجہ اور حکمت اس عامی کی نظر میں باوقعت نہیں ہوگی تو اس حکم کو بھی بے وقعت سمجھنے لگے گا۔

ہر حکمت نہ علّت ہے اور نہ مقصود بالذات

سوم اس لئے کہ ہر حکمت علت نہیں ہوتی بعض اوقات عامی اس کو علّت اور اصلی سبب سمجھکر کسی موقع میں اس کے موجود ہونے سے حکم ہی کے غیر موجود ہونے کا حکم لگا دے گا۔

چہارم یہ کہ ہر حکمت مقصود بالذات نہیں ہوتی بعض اوقات عامی اس کو مقصود بالذات سمجھکر کسی محل و موقع میں حکمت کے حاصل ہوجانے کو کافی سمجھکر تحصیل حکم کی ضرورت نہ سمجھے گا اور ان دونوں صورتوں میں (سوم و چہارم) میں اجتہادِ باطل کا باب وسیع ہوجائے گا۔ مثلاً سفر میں مشقت پر نظر کرکے قصر کا حکم دیا گیا ہے لیکن یہ علّت نہیں حتیٰ کہ اگر سفر میں مشقت بھی نہ ہو تب بھی قصر ہے اور اس طرح وضو مشروع ہوا ہے۔ حکمتِ نظافت و طہارت ہے، لیکن اگر طہارت و نظافت حاصل ہو تب بھی وضوء سے استغنا نہ ہوگا۔

کُتّا پالنے کی ممانعت کی حکمت؟

پنجم یہ کہ عامی مخالفِ دین کے مناظرہ میں اس کو بیان کرے گا اور اگر وہ یقینی نہیں تو اس میں مخالف نے اگر خدشہ نکال دیا تو یہ مغلوب ہوجائے گا۔ اور اس میں اسلام کو اور اہل حق کو صدمہ پہنچے گا، مثلاً کسی نے کتا پالنے کی ممانعت کی یہ حکمت بیان کی کہ اس میں صفت سبعیت (درندگی) کی ہوتی ہے تو اگر کسی نے اس میں یہ خدشہ پیدا کیا کہ تعلیم کے بعد سبعیت نہیں رہتی، پھر کیوں ممنوع ہے؟ تو یہ شخص بہ زبان حال اس حکم کو بے بنیاد کہیگا۔ بخلاف راسخ فی العلم کے کہ وہ بجائے اس حکمت کے یہ کہے گا کہ ہمارے آقائے عظیم الشان کا یہ حکم ہے ہم نہیں جانتے کیا مصلحت ہے؟ تو اس شخص پر کوئی خدشہ ہی نہیں ہوسکتا۔ یہ شرح تھی مضمون متعلق حضرات محکوم[1] الجدت کی، اس کے بعد اس مضمون سابق میں ان لوگوں

---

[1] جدت پسندی کے خوگر حضرات مراد ہیں ۱۲

کی کوتاہی کا بیان ہے، جن میں ظاہراً بعض آثارِ محبت کے بھی پائے جاتے ہیں۔
اس میں یہ بھی مذکور ہے کہ خود اِن اعمالِ مذکورہ میں بھی جن کو عنوانِ محبت سے وہ اختیار کرتے ہیں، بسا اوقات حدودِ شرعیہ کو محفوظ نہیں رکھتے، اس کا تتمہ یہ ہے کہ یہ لوگ بھی درحقیقت تینوں حقوق کو ضائع کرتے ہیں، متابعت کی نفی تو ظاہر ہے۔

متابعت کی حقیقت

لیکن اگر غور کیا جائے تو ان کے قلب میں حقیقی عظمت و محبت بھی نہیں، گو زبان سے تعظیم و محبت کا دعویٰ کرتے ہیں، کیونکہ ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ اعتقادِ عظمت کے لئے یہ لازم ہے کہ اپنے ارادے اس معظم و مکرم کے ارادوں کے سامنے فنا ہوجائیں۔
چنانچہ کسی رئیس کے پاس کسی عظیم الشان باختیار افسر کا حکم ضابطہ کا یا نجی (ذاتی) کا فوری حاضری کے لئے آئے۔ اور فوری بھی ایسا کہ وہ حاکم دروازہ پر ٹھیر کر جلدی طلب کرے تو اس وقت ہم اس کی حالت کا اندازہ، اس کی حرکات سے کرتے ہیں کہ ان میں اختیاریت کی شان پر اضطراریت کی حالت کو غلبہ ہوتا ہے، حتیٰ کہ اکثر امور اس وقت معمول کے خلاف اس سے سرزد ہونے لگتے ہیں اور وقار و متانت سب مرتفع ہوجاتا ہے اور یہ سب علامت ہے فنارِ ارادہ کی اور منشار اس کا وہی اعتقادِ عظمت ہے۔
اور فنارِ ارادہ کے لئے یہ لازم ہے کہ متابعت تعمیلِ ارشاد میں مبادرت و سبقت ہو، جب متابعت نہ ہوئی تو ظاہر ہے کہ حقیقی عظمت بھی دل میں نہ ہوئی اور جس طرح غلبۂ عظمت سے ارادہ فنار ہوتا ہے اسی طرح غلبۂ محبت سے بھی فنارِ ارادہ پیدا ہوتا ہے، گو دونوں کیفیتیں جُدا جُدا قسم کی ہیں مگر فنارِ ارادہ دونوں کے لئے لازم اعم ہے۔
جیسے حرارت کہ نار کو بھی لازم ہے اور دھوپ کو بھی پس جس طرح حرارت کے نہ ہونے سے دھوپ اور آگ کا معدوم ہونا لازم آتا ہے، اسی طرح جب متابعت نہ ہوگی محبت و عظمت دونوں کے معدوم ہونے کا حکم کیا جائے گا۔
اسی معنی میں حضرت عبداللہ بن المبارک کا ارشاد ہے ؎

لو کان حبک صادقاً لاطعتہ ، اِنّ المحبّ لمن یحبّ مطیع ،

اگر تیری محبت سچی ہوتی تو، تو اس کی اطاعت کرتا ، بیشک عاشق ، محبوب کا فرمانبردار ہوتا ہے۔

البتہ ادنی درجہ کی محبت و اعتقادِ عظمت کا انکار نہیں کیا جاتا ، لیکن شرعاً مطلوب ہے ، ان دونوں کا غلبہ اور قوت جیسا کہ اس ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہوتا ہے

لا یومن احدکم حتّٰی اکون احب الیہ من ولدہٖ ووالدہٖ والناس اجمعین

تم میں سے کوئی مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے بیٹے ، باپ اور تمام لوگوں سے زیادہ عزیز نہ ہو جاؤں) اور ان لوگوں کا دیگر امورِ شرعیہ میں متابعت نہ کرنا تو ظاہر ہے۔

حضراتِ انبیاء وملائکہ علیہم السلام کی شان میں گستاخی

چنانچہ مضمونِ مذکور میں کچھ اس کی تفصیل بھی ہے لیکن خاص ان امور میں جن کو وہ عنوانِ محبت سے اختیار کرتے ہیں ، اس متابعت کا معدوم ہونا اس مضمون میں مجملاً بیان کیا گیا ہے کہ ان میں بھی اکثر اوقات " حدودِ شرعیہ " کو محفوظ نہیں رکھتے۔ اس کی تفصیل ان لوگوں کے ان طریقوں کے دیکھنے سے ہو سکتی ہے مثلاً

● — یہ کہ آپ کی مدائح میں اس قدر غلو اور مبالغہ کرتے ہیں کہ اس میں دوسرے حضراتِ انبیاء اور ملائکہ علیہم السلام کی شان میں گستاخی ہو جاتی ، مثلاً ؎

برآسمان چہارم مسیح بیمار است ۔۔۔ تبسم تو برائے علاج درکار است

(حضرت مسیح علیہ السلام چوتھے آسمان پر بیمار ہیں اور آپ کی مسکراہٹ علاج کے لئے درکار ہے)

اور مثلاً ؎

" شب و روز ان کے صاحبزادوں کا گہوارہ جنبان[1] تھا "

---

[1] ہلنے والا

"عجب ڈھب یاد تھا روح الامین کو بھی خوشامد کا"

نصوص قرآنیہ و حدیثیہ میں ان حضرات مقدسین کی تعظیم و ادب کا حکم وارد ہے پس ایسے طریقہ میں ترک متابعت نبویہ ہے۔

(۲) ● — یہ کہ بعض اوقات خود حق جل و علیٰ شانہٗ کے حضور میں گستاخی ہوتی ہے مثلاً ؎

پے تسکین خاطر صورت پیراہن یوسف محمدؐ کو جو بھیجا حق نے سایہ رکھ لیا قد کا

اور مثلاً ؎

طواف کعبہ مشتاق زیارت کو بہانہ ہے کوئی ڈھب چاہئے آخر رقیبوں کی خوشامد کا

نعوذ باللہ منہ اس کو ترک متابعت کی سب سے بڑی مثال سمجھنے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔؟

(۳) ● — بعض اوقات خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان مبارک میں گستاخی ہو جاتی ہے۔ مثلاً اس مصرع سے حضور پُرنور کو مخاطب بنانا ؎

"اے نرگس شہلائے تو اور وہ رسم کافری" ؎

الٰہی توبہ اس کو ترک متابعت کہہ کر ترک تعظیم کی دلیل بنانے کی کچھ ضرورت نہیں اس کا ترک تعظیم ہونا خود ظاہر ہے۔

(۴) ● — یہ کہ روایات موضوعہ "فضائل" میں بیان کرتے ہیں جس پر حدیث نبویؐ میں سخت وعید وارد ہے، ظاہر ہے کہ حدیث کے خلاف کرنا ترک متابعت ہے،

(۵) ● — ان قدائح و فضائل کے بیان میں بہت سے منکرات اعتقادیہ و عملیہ کو منضم کر لیا ہے۔ (۱) ایک ممنوع شرعی تو خود ان چیزوں کو ضم کر لینا اور ملا لینا ہے (۲) پھر ان ناپسند چیزوں کو مستحسن اور پسندیدہ سمجھنا اور ان پر اصرار کرنا دوسری خرابی ہے (۳) پھر جو ان منکرات کی اصلاح کرے ان سے عناد و بغض رکھنا یہ تیسری خرابی ہے۔

غرض ان کا یہ طریقہ ہمارے اس دعوے کی پوری دلیل ہے کہ ان میں متابعت نہیں ہے

ے ۱

ے ۲

یہ شرح تھی مضمون متعلق حضرات مدّعیانِ محبت کی۔

اس کے بعد اس مضمونِ سابق کے اخیر میں ان لوگوں کی کوتاہی کا بیان ہے جو متابعت ظاہری کا اوروں سے زیادہ اہتمام کرتے ہیں، مگر ان میں تعظیم وادب اور شوق و محبت کی شان کم ہے۔

اس بیان کی شرح یہ ہے کہ ان میں غلبۂ ادب اور غلبۂ محبت کی کمی تو ظاہر ہے ہی، لیکن نظرِ غائر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں متابعت ہی کامل نہیں، کیوں کہ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاداتِ قولیہ وعادات فعلیہ کو دیکھنے سے ہدایتہً بلکہ حسّاً ثابت ہوتا ہے کہ یہ طرز خاص:۔

(۱) خشونت ـــــ (۲) تقشّف ـــــ (۳) تعسیر ـــــ (۴) تنفیر[1]

کا، آپ کو سخت ناپسند ہے اور جب یہ امور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند نہیں اور برخلاف اس کے قرآن حدیث میں، خود حضور کی توقیر وادب اور محبت میں اپنی جان پر بھی آپ کی ترجیح اور امت کے ساتھ تبشیر و تیسیر کے احکام وارد ہیں۔ تو ان میں خلل اندازی کرنا متابعت کے ساتھ کیسے جمع ہو سکتا ہے؟

اور اس میں مراتب مختلف ہیں۔

بعض تو حدِ خسران تک پہونچ گئے ہیں، ادب یا محبت کے حقوقِ واجبہ، اعتقادیہ یا عملیہ کو کھو بیٹھے ہیں، معتزلہ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے جبرئیل علیہ السلام کو اور اسی طرح جمیع انبیاء علیہم السلام سے تمام ملائکہ علیہم السلام کو افضل بتلاتے ہیں، جس کا جواب کتب کلامیہ میں مفصّل و مدلل مذکور ہے، یہاں صرف جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی افضلیت، جبرئیل علیہ السلام پر مختصر طور پر سمجھ لینا چاہئے۔

---★---

---

[1] خشونت = درشتی، کھردراپن / تقشف: موٹے جھوٹے کپڑے پہننا اور تھوڑی روزی پر بسر کرنا ۔/ تعسیر= تنگی میں ڈالنا، / تنفیر۔ نفرت دلانا۔

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی افضلیت جبرئیل علیہ السلام پر

ان لوگوں کو شبہ ہو گیا ہے کہ قرآن مجید سے جبرئیل علیہ السلام کا آپ کے لئے معلم ہونا منصوص ہے اور ظاہر ہے کہ استاد بحیثیتِ استادی، شاگرد سے افضل ہوتا ہے اور اگر معلم کے افضل ہونے کو تسلیم نہ کیجئے، تو جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا امت سے باعتبار علم کے افضل ہونا ثابت نہ ہوگا، حالانکہ آپ اس حیثیت سے بھی بالاتفاق افضل ہیں۔

جواب اس شبہ کا یہ ہے کہ معلّم کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں۔

ایک محض مبلّغ وسفیر ہوتا ہے جس کے متعلق محض بات کا پہنچا دینا ہے، اس میں معلم کا افضل ہونا ضروری نہیں، اگر بادشاہ اپنے وزیر کے پاس کسی خاص قاصد کے ہاتھ کوئی پیام بھیجے تو یہ قاصد وزیر سے افضل نہ ہو جائے گا؟

دوسری حیثیت استاد و اتالیق ہونا جس کے متعلق متعلّم و شاگرد کی تربیت بھی ہے اس میں معلّم کا افضل ہونا ضروری ہے۔ سو جبرئیل علیہ السلام آپ کے معلّم بالمعنی الاوّل ہیں نہ کہ بالمعنی الثانی۔

کیونکہ مُربّی بمعنی ثانی اتالیق و تربیت دہندہ حسب تصریح حدیث۔ علّمنی ربی فاحسن تعلیمی وادّبنی ربی فاحسن تادیبی۔ میرے رب نے مجھے تعلیم دی کیا اچھی تعلیم دی۔ میرے رب نے مجھے ادب سکھایا کیا اچھا ادب سکھایا۔" خود حضرت جلّ وعلا شانہٗ بلاواسطہ ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ امت کے لئے معلّم بمعنی ثانی ہیں، بس آپ کی اور جبرئیل علیہ السلام کی معلّمیت میں بڑا فرق ہے پس معتزلہ کی یہ بہت بڑی گمراہی ہے، عقیدہ واجبہ میں۔

لہ۔ امام مالک رحمۃ اللہ سنہ ۹۳ھ ۱۲، ش سنہ ۱۷۹ھ ۹۵، ش حضرت ابو عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پوتے ہیں۔ آپ اسوقت تک منصب قضا پر نہ بیٹھے جب تک کہ ستر اہل علم شیوخ نے شہادت نہ دیدی کہ آپ اس کے اہل ہیں۔ آپ کی مجلس وقار کی مجلس تھی صاحب ہیبت، رعب داب والے تھے آپ کی مشہور حدیث کی کتاب موطا ہے جس میں تمام صحیح روایات ہیں۔ آپ بڑے محدث مفتی اور مجتہد تھے۔ امام مالکؒ تمام عمر مدینہ شریف ہی میں قیام پذیر رہے۔ مذاہب مالکیہ بلاد مغرب اندلس وغیرہ میں زیادہ پھیلا۔ امام شافعی حضرت عبداللہ بن مبارک وغیرہم نے آپ سے روایت کی ہے ۱۲ محمد علی

اور مثلاً میں نے ایک مقام پر بچشم خود دیکھا ہے کہ ایک صاحب نے ایک حدیث ڈھونڈنے کے لئے موطا امام مالک کا نسخہ الماری میں سے نکالا اور اس کو کھڑے کھڑے فرش پر زور سے پٹک کر مارا۔ اہل مجلس میں سے ایک شخص نے کہا کہ :۔

"میاں حدیث کی یہ بے ادبی"؟

تو وہ جواب میں فرماتے ہیں "میں نے بے ادبی کیا کی ہے، اس کی گرد جھاڑی ہے" جب قیامت میں ان کی گرد جھڑیگی تب حقیقت معلوم ہوگی، سو یہ اس خشک دماغی کا اضلال ہے عمل واجب ہیں، اللّٰھمّ احفظنا ولنعم ما قیل ؎

از خدا جوئیم توفیق ادب — بے ادب محروم ماند از فضل رب

(ہم اللہ تعالیٰ سے ادب کی توفیق طلب کرتے ہیں اس لئے کہ بے ادب اللہ تعالیٰ کے فضل سے محروم ہوتا ہے)

بے ادب تنہا نہ خود را داشت بد — بلکہ آتش در ہمہ آفاق زد

(بے ادب نے تنہا اپنے آپ کو ذلیل نہیں کیا ہے ؛ بلکہ ساری دنیا میں آگ لگادی)

از ادب پر نور گشت ست ایں فلک — از ادب معصوم پاک آمد ملک

(ادب کی وجہ سے آسمان پر نور ہو گیا ہے اور فرشتے ادب کی وجہ معصوم اور پاک ہوگئے ھیں)

بد ز گستاخی کسوف آفتاب — خوشہ عزازیلے ز جرأت رد باب

(آفتاب کا کسوف گستاخی کی وجہ سے ہوگیا۔ عزازیل (شیطان) بے ادبی کی وجہ سے راندہ درگاہ ہو گیا)

حدیث میں ایک گستاخ کا قصہ آیا ہے کہ وہ بائیں ہاتھ سے کھاتا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دائیں ہاتھ سے کھانے کو فرمایا۔ اسے براہِ بے ادبی کہا کہ "میں دائیں ہاتھ سے کھا نہیں سکتا"؛ آپ نے فرمایا کہ (خدا کرے) تو اس سے کھا ہی نہ سکے بس وہ فوراً شل گیا۔

○

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا ادب

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا آپ کی طرف بیدھڑک نہ دیکھنا اور ایک بزرگ کا اس سوال کے جواب میں کہ تم بڑے ہو ؟ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ؟ یہ کہنا کہ بڑے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں، مگر عمر میری زیادہ ہے۔ کیا قولی ادب کا کافی نمونہ نہیں ؟ ایک بزرگ کا اس سننے کے بعد کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کمان ہاتھ میں لی تھی، تمام عمر بلا وضو کمان کو مس نہ کرنا، کیا قابلِ التفات وتقلید نہیں ہے ؟

اسی طرح حضرات صحابہؓ کی عادت تھی کہ جب بیٹھتے ایک دوسرے سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ مبارک وشمائل وطرزِ عمل پوچھتے۔ چنانچہ شمائل ترمذی کی روائتیں اس میں صریح ہیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ خاص آستانۂ مبارکہ پر سلام پہنچانے کے لیئے قاصدوں کی ڈاک کا انتظام کرتے تھے، جمہورِ امت مدینہ طیبہ کی حاضری کا اہتمام کرتے رہے۔ اکثر سلف درود شریف کی کثرت رکھا کرتے تھے، خود حدیث میں ہے کہ جس مجلس میں اللہ تعالیٰ کا ذکر اور درود شریف نہ ہو وہ مجلس اہل مجلس کے حق میں موجب حسرت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ گویا امور موکدہ نہ ہوں مگر ان کی کمی موجب حسرت حرمان ہے اور جیسے کمی سے حرمان ہوتا ہے اسی طرح ان کے اہتمام والتزام سے گوناگوں برکت وفیضان ہوتا ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں پھر دنیا میں دینوی بھی اور اخروی بھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک صحابیؓ کو جب کہ انہوں نے کئی بار سوال وجواب کے بعد یہ عرض کیا کہ بس اب میں تمام وظائف کی جگہ درود ہی ٹھہرالونگا یہ ارشاد فرمانا کہ " تو پھر تمہارے سب گناہ معاف ہوتے رہیں گے۔ اور سب فکروں کی کفایت

---

[1] ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورہ ترمذی ۲۰۹ھ ۸۲۴ش ۲۷۹ھ ۸۹۲ش آخر عمر میں کثرت بکا کی وجہ سے نابینا ہوگئے تھے۔ بہت بڑے محدث تھے۔ آپ کی جلالت قدر، فراست، ذکاوت، قوت استدلال، حفظ اور شان اجتہاد کا اعتراف آپ کے اساتذہ نے بھی کیا ہے۔ ترمذی حدیث کی ایک مشہور کتاب اور ترمذ ایران میں ایک جگہ کا نام ہے ۱۲ محمد علی

ہوتی رہے گی" اس کی کافی دلیل ہے۔

عجیب و غریب واقعہ

اس وقت ایک عجیب الشان عظیم المکان فیضان حکایت یاد آتی ہے اسی پر اپنے اس مضمون کو ختم کرنا چاہتا ہوں، جس سے ثابت ہو گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تعلق بڑھانے سے خود آپ کی "عنائتیں" کیسی مبذول ہوتی ہیں، اس حکایت کو امام جلال الدین سیوطی[1] رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ "شرفِ محتم" میں سلسلہ وار سند سے لکھا ہے کہ وہ روایت کرتے ہیں شیخ کمال الدین رح سے اور وہ شیخ شمس الدین جزیری رح سے اور وہ شیخ زین الدین رح سے اور وہ شیخ عزالدین احمد فاروقی رح کے واسطے اور وہ اپنے والد شیخ ابو اسحٰق ابراہیم رح سے اور وہ اپنے باپ شیخ عزالدین عمر سے رحہم اللہ تعالیٰ کہ میں ۵۵۵ھ ۱۱۶۰ء ہجری میں حضرت سید احمد رفاعی رحمۃ اللہ علیہ[2] کے ساتھ سفر حج میں تھا، جب وہ مدینہ طیبہ پہنچے اور روضۂ شریف پر حاضر ہوئے تو انہوں نے ان الفاظ سے سلام عرض کیا۔ السلام علیکم یا جدّی! وہاں سے جواب عطا ہوا وعلیکم السلام یا ولدی! کہ اس کو تمام اہلِ مسجد نے سنا، حضرت سیّد احمد رفاعی رحمۃ اللہ پر وجدِ شدید نے غلبہ کیا اور بڑی دیر تک رویا کئے اور شدّتِ شوق میں عرض کیا یا جدّاہ!

---

[1] حضرت علامہ جلال الدین سیوطی بن عبدالرحمٰن مصری رحمۃ اللہ علیہ چار سو کتابوں کے مصنّف ہیں۔ تمام علوم میں ماہر اور طاق تھے۔ آپ نے ۹۱۱ھ / ۱۵۰۵ء ش میں وفات پائی ۱۲ عبدالرؤف

[2] حضرت سیّد احمد کبیر رفاعی رحمۃ اللہ علیہ ۱۵ رجب ۵۱۲ھ / اکتوبر ۱۱۱۸ء ش کو مقام حسن (عراق) میں پیدا ہوئے اولیاء کرام کے سردار ہیں۔ بہت بڑے عالم باعمل متورع بزرگ تھے۔ حالت شیر خوارگی میں رمضان میں صرف بعد مغرب دودھ پیتے تھے، ۲۰ سال کی عمر میں تمام فنون مروجہ کی تکمیل کرلی ان کی خانقاہ میں بسا اوقات ایک لاکھ آدمیوں کا مجمع ہوتا تھا۔ ان ایک لاکھ کے طعام قیام کا انتظام حضرت سیّد احمد کبیر صاحب رح کی جانب سے تھا آپ کے خلفاء کی تعداد اسی ہزار ایک سو تھی آپ کی نماز جنازہ کے وقت نو لاکھ مرد و عورت کا مجمع تھا ایک شعر میں آپ کی ولادت، وفات کی تاریخ اور عمر کی مقدار کہی گئی ہے۔ ——— (شعر ص۸۸ پر ملاحظہ فرمائیں حاشیہ میں)

؎ فی حَالۃِ البعدِ روحی کنت اُرسِلُھا
تقبل الارضَ عنی وھِیَ نائبتی

وھٰذِہٖ دولۃ الاشباحِ قد حضرت
فامدد یمینک کی تحظیٰ بھا شفتی

(یعنی اے نانا جان! حالتِ بعد میں، اپنی روح کو حضور میں بھیجا کرتا تھا، وہ نائب بن کر زمین بوس ہوجاتی تھی، اب جسم کی حاضری کی نوبت آئی ہے، سو ذرا اپنا دایاں دستِ مبارک بڑھا دیجئے؛ تاکہ میرے لب اس کے بوسے سے مشرف ہوجائیں) پس فوراً آپ کا ــــ دستِ مبارک چمک اور دمک کے ساتھ قبر شریف سے ظاہر ہوا، اور ہزاروں آدمیوں نے زیارت کی اور سیّد رفاعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا بوسہ لیا۔

اس کے بعد بلا سند دوسرا قصہ ان ہی کا لکھا ہے کہ جب سالِ آئندہ پھر حاضر ہوئے تو نہایت انکسار و مسکنت کے ساتھ عرض کیا ؎

اِنْ قِیل زرتم بِمَا رجعتم ﴿﴾ یَا اکرَمَ الرسْلِ مَا نقُولُ

(یعنی اگر لوگ ہم سے پوچھیں کہ تم زیارت کرکے آئے تو کیا لے کر آئے؟ تو ہم جواب میں کیا کہیں؟) قبر شریف سے آواز آئی جس کو تمام حاضرینِ مسجد نے سُنا" ؎

اِرْجِعنا بِکُلِّ خَیرٍ ﴿﴾ وَاجْتَمَعَ الفروعُ وَالاصُولُ

(یعنی تم یوں کہنا کہ ہم ہر طرح کی خیر لے کر آئے اور فروع و اصول جمع ہوگئے)۔

کیا یہ فضائل قابلِ رشک نہیں؟ سو یہ بھی تو سوچنا چاہیئے کہ بجز کمالِ اتباع و کمالِ محبت و کمالِ اعظام و اجلال کے اس دولت کا سبب اور بھی کوئی امر ہے؟ وفی ذالک فلیتنافس المتنافسون (المطففین، [۲۵] اور اس پر چاہیئے کہ ڈھکیں ڈھکنے والے) والمثل ھٰذا فلیعمل العاملون (والصّٰفّٰت [۶۰] (ایسی چیزوں کے واسطے چاہیئے محنت کریں محنت کرنے والے)

یہ معاملات تو براہِ راست آپ کے ساتھ عمل میں لانے کے ہیں، باقی آپ کے اہلِ تعلق، اہل

صحبت، اہل قرابت، اہل ملت (یعنی خواص وعوامِ امت) کے ساتھ ادب ومحبت شفقت و رحمت وخدمت کرنا علیٰ حسبِ تفاوتِ مراتبہم، یہ سب بھی متمّم ہیں، آپ کے ساتھ معاملہ رکھنے کے جن میں سے بعض واجب ہیں کہ ان میں خلل اندازی سے خسران ومعصیت ہوتی ہے اور بعض مستحب ہیں جن سے اعراض کرنا مفلسی اور محرومی کا باعث ہے۔

یہ بیان تھا ان لوگوں کا جو شوق میں کمی اور ادب میں خلل کرنے والے ہیں، پس محقق وہ ہے کہ ـــــ سب مراتب حسّیہ ومعنویہ واجبہ ومستحبہ کا جامع ہو کما قیل ؎

برکفے جام شریعت برکفے سندان عشق ۔۔۔ ہر ہوسناکے نہ داند جام وسندان باختن
گاہ درد دل سازگہ دردیدہ جا ۔۔۔ ہر دو جائے تست یا بدر الدجیٰ

مگر بمقتضائے آیت لاتغلوا فی دینکم (النساء) [۱۷۰] مت مبالغہ کرو اپنے دین کی بات میں) وآیت تلک حدود اللہ فلا تعتدوھا (س۔ البقرۃ) [۲۲۸] یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں سو ان سے آگے مت بڑھو)

مندوبات میں کمی کرنے والے مستحق ملامت نہیں

یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ ان میں جو لوگ مندوبات (مستحبات) میں کمی کرنے والے ہیں ان پر ملامت یا ان کی تحقیر یا ان پر تشدد یا ان سے نفرت رکھنا یہ خود بوجہ تجاوز عن الشرع النبوی کے احداث فی الدین اور موجب ناخوشیٔ سرکار ہوئی و علامت ترکِ اتباع وخلافِ ادب ومنافیٔ تعظیم دربارِ مصطفویؐ ہے۔

مسند احمد میں ایک حدیث اس باب میں صریح ہے کہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ نوافل کو چھوڑے ہوئے تھے، نماز میں بھی، روزے میں بھی، صدقے خیرات میں بھی، دوسرے صحابی ان سے نفرت رکھتے تھے، حضور پرنور کے دربار میں یہ مقدمہ پیش ہوا آپ نے ان نفرت کرنے والے صحابیؓ کے انکار کو ناپسند فرمایا۔ احقر نے اپنے رسالہ حقیقۃ الطریقۃ میں یہ حدیث پوری نقل کی ہے ونعم ما قیل ؎

بزھد وورع کوش وصدق وصفا

ولیکن میفزائے بر مصطفیٰ

زہد و تقویٰ اور صدق وصفا میں کوشش کرو مگر مصطفےٰؐ سے آگے مت بڑھو۔

البتہ ایسے لوگوں کو اگر نرمی و ترغیب سے تکمیلِ مراتب مستحبہ کی طرف متوجہ کیا جاوے، عینِ خیرخواہی و مطلوب فی الدین ہے۔

ضروری تنبیہہ

اور ایک ضروری امر قابل تنبیہہ یہ ہے کہ بعض اوقات شوق و محبتِ نبویہ کی کمی کا غلط شبہ ہو جاتا ہے اور یہ شبہ توقیر و توجہ الی الذات کے غلبہ کے محل میں غیر عارف کو ہو جاتا ہے۔ لیکن فی الواقع وہ بھی محبت نبویہ ہی کا ایک لون ہے۔ شرح اس کی رسالہ نشر الطیب[1] میں بضمن حکمتِ درود شریف کی ہے۔

بس شرح ضروری سب جماعات کی حالت کی ختم ہوئی اور طریق اصلاح سب کا بقدر کافی اصل مضمون میں مذکور ہو چکا ہے، اس میں شرح کی حاجت نہ سمجھی، اصل مضمون کو دیکھ کر سب اپنی اصلاح کر سکتے ہیں۔

ان ارید الا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب وان ربی قریب مجیب۔

---

[1] ۔ نشر الطیب ہمارے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رح کا ایک رسالہ ہے جو سیرت نبویہ پر ہے ۔ محمد علی

نماز کے متعلق کوتاہیاں

(اصلاح معاملہ بہ نماز)

بعد ایمان اعمال میں نماز کا جو درجہ ہے وہ کسی عمل کو حاصل نہیں اور اس کا مقتضیٰ یہ تھا کہ مسلمانوں کو اس کا ایسا خاص اہتمام ہوتا کہ اس میں کوئی نقص نہ رہتا مگر ہماری کم توجہی و غفلت نے اس کو بھی کوتاہیوں سے خالی نہ چھوڑا جن میں سے بعض کا بیان اس موقع پر کیا جاتا ہے اور اس کے قبل یہ امر بھی قابل عرض کر دینے کے ہے کہ نماز میں اختلال کا جو وبال ہے وہ اس خاص حیثیت کے اعتبار سے بہ نسبت دوسرے اعمال کے اختلال کے زیادہ ہے کہ نماز فرض ہے اور ہر دن رات میں پانچ بار فرض ہے اس میں کوتاہی کرنا حق تعالیٰ کو دن بھر پانچ بار ناخوش کرنا ہے۔

بخلاف دوسرے اعمال کے کہ بعض فرض نہیں اور یا فرض ہیں تو روزانہ فرض نہیں ، جیسے روزہ " کہ سال بھر میں فرض ہوتا ہے اور زکوٰۃ کہ وہ بھی سال بھر میں فرض ہوتی ہے اور " حج " کہ عمر بھر میں ایک بار فرض ہوتا ہے اور زکوٰۃ اور حج تو سب پر فرض بھی نہیں ہوتا، یہ تفاوت تو نماز کو اور اعمال سے ہے۔

ترک غیبت، ہروقت فرض

اب رہ گئے تروک جو فرض ہیں یعنی معاصی کا ترک کرنا کہ وہ بھی روزانہ بلکہ ہروقت فرض ہیں مثلاً غیبت کا ترک کرنا، ہروقت فرض ہے اور اس امر میں یہ تروک بھی مثل نماز کے فرض دائمی ہیں، مگر اس پر بھی ان کا اختلال نماز کے اختلال سے دو وجہ سے کم ہے۔

ایک یہ کہ یہ تروک ارکان اسلام سے نہیں، کیونکہ فرائض سب ارکان نہیں، تو اس اختلال سے ارکان کی تفویت لازم نہیں آئی گو معصیت اس سے بھی ہوئی اور نماز رکن اسلام سے ہے تو اس کے اختلال سے ایک رکن کی تفویت لازم آئی اور رکن کو نظرِ شارع علیہ السلام میں ایک خاص مقصودیت واہمیت ہے، اس لئے رکن کا فوت ہونا شارع علیہ الصلوۃ والسلام کو زیادہ ناگوار ہوگا۔

دوسری وجہ یہ بشہادتِ حس، ترک سہل ہوتا ہے فعل سے، کیونکہ ترک میں اکثر احتیاج اہتمام نہیں اور فعل میں اہتمام کی حاجت ہے اور جو چیز سہل ہوتی ہے اس کا وقوع اکثری ہوتا ہے، اس لئے جو تروک فرض ہیں ان کا وقوع اکثر ہوگا اور اختلال کم اور جو افعال فرض ہیں اگر پورا اہتمام نہ کیا جاوے تو ان کا اختلال اکثر ہوگا اور وقوع کم، پس نماز میں اختلال کا احتمال زیادہ ہوا اور ان تروکِ مفروضہ میں کم اور یہی مدعا تھا، پس ثابت ہوگیا کہ تمام اعمال میں خواہ وہ وجودی ہوں یا عدمی، ہوں نماز میں کوتاہی کرنے کا ضرر اکثر اور اشد ہوگا، اس لئے اس کی اصلاح نہایت "مہتم بالشان" ہوئی۔

اس کے بعد بطور نمونہ کے بعض ان کوتاہیوں کا ذکر ہوتا ہے جو کثیر الوقوع ہیں، تاکہ ان پر متنبہ اور ان کی اصلاح کی طرف توجہ ہو۔

نماز نہ پڑھنے والوں کی کوتاہیاں

سو ایک کوتاہی جس کے کوتاہی ہونے میں کوئی خفاء ہی نہیں یہ ہے کہ بہت لوگ خود نماز ہی کے مطلقاً پابند نہیں ہیں، اس کے معصیت ہونے میں تو کلام کرنے کی اس لئے ضرورت

نہیں کہ متفق علیہ ہے، البتہ یہ حضرات جو اس میں عذر پیش کیا کرتے ہیں ان کی نسبت مختصراً کچھ لکھا جاتا ہے۔

بعضے یہ عذر کرتے ہیں کہ ہم کو دنیا کی ضرورت سے اتنی فرصت ہی نہیں ہوتی، مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض بہانہ بازی و سخن سازی ہے، سببِ اصل بے پرواہی ولاابالی پن ہے، کم فرصتی مانع نہیں، کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس روز یا جس وقت ان کو فرصت ہوتی ہے تب بھی ان کو نماز کی طرف توجہ نہیں ہوتی، اگر یہ امر مانع تھا تو اس حالت میں تو یہ مانع مرتفع تھا، پھر ترک کی کیا وجہ؟ اس سے معلوم ہوا کہ اصلی مانع بے پروائی ہے، جو اس حالت میں بھی مشترک ہے۔

دوسرے اگر یہ مانع ہوتا تو اگر وقت پر فرصت نہ تھی اور اس لئے ادا نہ پڑھ سکے تھے، تو قضا کے لئے تو کوئی وقتِ خاص نہیں اور کسی نہ کسی وقت تو فرصت ہوتی ہے، اس وقت میں قضا پڑھ لیتے، جیسے نماز کی پابندی والوں کی عادت ہے کہ اگر کسی روز وقت نکل جاتا ہے، تو اہتمام کرکے قضا پڑھتے ہیں۔

تیسرے اگر بے پرواہی سبب نہ ہوتا تو اس کوتاہی پر قلق ہوتا، جیسا مطالب دنیویہ کے فوت ہونے پر مدتوں حسرت ہوتی ہے، اس کی فکر لگ جاتی ہے، اس کی تلافی کی کوشش کرتے ہیں، تدبیریں پوچھتے پھرتے ہیں، کیا ان بے نمازوں کو اس فکر کوشش اور قلق و سوزش میں دیکھا جاتا ہے؟ ان قرائن سے سبب اصلی کی اچھی طرح تشخیص ہوگئی، اس کے علاج کے لئے دو امر کی ضرورت ہے۔

نمازوں میں بے پرواہی سے بچنے کا طریقہ

ایک یہ کہ تارک نماز کے وعیدوں میں غور کیا کریں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کو کافر فرمایا ہے، خواہ تاویل ہی سے فرمایا ہو اور ایسے شخص کا دوزخ میں جانا، پھر فرعون، ہامان، قارون کے ساتھ جانا ارشاد فرمایا ہے، اور قیامت میں سب سے اوّل پرسش نماز ہی کی ہوگی اور ان وعیدوں کی تقویت کے لئے دوزخ کے حالات پڑھا اور سنا کریں

انشاء اللہ تعالیٰ بے پرواہی جاتی رہے گی۔

دوسرا امر یہ کہ اپنے نفس پر جبکہ کرے کہ بدون ہمت کے کیسا ہی آسان کام ہو دشوار ہو جاتا ہے اور جبر کی دو صورتیں ہیں۔

ایک یہ کہ کسی کو اپنے اوپر مسلّط کر دے کہ وہ زبردستی اس کو وقت پر اٹھا کر کھینچ کر نماز پڑھوا دیا کرے۔

دوسری صورت یہ کہ نماز کے ترک ہونے پر کچھ ہی جرمانہ اپنے نفس پر مقرر کرے جس کی مقدار اتنی ہو کہ نہ بہت قلیل ہو کہ نفس کو کچھ ناگواری ہی نہ ہو نہ بہت کثیر ہو کہ اس کا ادا کرنا مشکل ہو جائے، جب نماز ترک ہو وہ جرمانہ مساکین کو دیدیا کریں اور یہ صورت جرمانے کی سنت کے موافق ہے کہ نسائی[1] کی روایات میں ترکِ جمعہ وجماع فی الحیض پر تصدق کا امر آیا ہے، دوسروں سے جرمانہ لینا بوجہ حدیث اَلَا لَا یَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ اِلَّا بِطِیْبِ نَفْسٍ مِنْہُ۔ خبردار! کسی کا بھی مال حلال نہیں ہے مگر اس کی خوش دلی سے۔ علماء کے نزدیک منسوخ ہے اور جائز نہیں، یا کوئی بدنی جرمانہ مقرر کرے اس کے بھی دو طریقے ہیں۔

ایک طریقہ یہ کہ اس پر عبادت کی مشقت ڈالے، یعنی مثلاً ایک نماز فوت ہو تو اس کو قضاء کرے اور بیس رکعت نفل مثلاً پڑھے، نفس دو تین چار مرتبہ میں ٹھیک ہو جاوے گا۔

وہ قضاء تہجد پر اپنے بدن پر قمچیاں توڑ ڈالتے تھے

دوسرا طریقہ یہ کہ اس پر عادت کی مشقت ڈالے یعنی مثلاً ایک نماز قضاء ہو تو ایک وقت کا کھانا نہ کھاوے اگر دو نمازیں قضاء ہوں تو دو وقت کا کھانا نہ کھاوے، چونکہ نفس پر یہ بہت شاق ہوگا۔ بہت جلدی اس سے صلح کرے گا۔

بعضے بزرگوں نے یہ معمول کر رکھا تھا کہ جس روز "تہجد" قضاء ہوتی تھی اپنے بدن پر کئی کئی قمچیاں توڑ ڈالتے تھے اور فرماتے تھے کہ اگر تو پھر ایسا کرے گا میں پھر ایسا ہی کروں گا ـــــ بعض

---

[1] حافظ ابو عبدالرحمٰن احمد بن شعیب بن علی النسائی ۲۱۴/۳۰۳ھ بہت بڑے محدث اور اپنے زمانے کے بہت بڑے امام تھے نِساء (ایران) میں ایک جگہ کا نام ہے ۱۲ فیض محمد

معاصی پر شریعت میں روزے کے ساتھ کفارہ مشروع ہونا اور خود ترکِ صلوۃ پر فقہاء کا تعذیر کو جائز رکھنا اس مشقت عادیہ کا ماخذ ہو سکتا ہے۔

بعض لوگ حالتِ صحت وحضر وفراغ میں تو پابند ہوتے ہیں، مگر مرض وسفر وشغل میں پابند نہیں رہتے، اس کا سبب بھی بجز ضعفِ ہمت وبیفکری کے کچھ نہیں، اگر آدمی کسی کام کا ارادہ وفکر کرتا ہے، کچھ نہ کچھ صورت اس کی بن ہی جاتی ہے، ادنیٰ بات ہے کہ اگر ان حالات میں پیشاب پاخانہ کا دباؤ ہو تو کیا اس کی ضرورت ہے تھوڑی دیر کے لئے سفر یا شغل کو منقطع کرنا نہیں پڑتا ؟ یا مرض کی حالت میں اٹھنا نہیں؟ اور کیا اٹھتا نہیں ؟ پھر فرق بجز اس کے کیا ہے ؟ کہ اس کو ضروری سمجھکر اس کا ارادہ کرتا ہے۔ اور یہ احوال مانع نہیں ہوتے اور نماز کو غیر ضروری سمجھکر اس کا ارادہ نہیں کرتا اور وہ مانع ہو جاتا ہے اور اس سے زیادہ کونسی حالت افسوسناک ہوگی !! کہ پیشاب پاخانہ کی ضرورت سے تو عین موانع میں وقت نکل آتا ہے اور نماز کی ضرورت سے وقت نہیں نکلتا ! پھر خاص کر سفر و مرض میں تو رعائتیں و تخفیفیں بھی بہت سی دی گئی ہیں مثلاً

(۱) پانی پر قدرت نہ ہو تو تیمم جائز ہے (۲) قیام پر قدرت نہ ہو تو قعود جائز ہے۔

(۳) ارکان پر قدرت نہ ہو اشارہ جائز ہے (۴) قبلہ معلوم نہ ہو تحریؔ ہی جائز ہے۔

جن کے احکام کی تفصیل کتب فقہ میں مذکور ہے، یہاں سے ریل میں سوار ہو کر نمازیں چھوڑنے والوں کے عذر کا اور گھر کے کاروبار میں مشغول ہونے والوں کے عذر کا بارد ولچر ہونا معلوم ہو گیا ہو گا بالخصوص بیماری میں نماز چھوڑنا اور بھی محل افسوس ہے !

کیونکہ ہر بیماری پیغام موت ہے گو اس سے صحت ہی ہو جاوے، مگر وہ حالت تو اس کی متحمل ہے کہ شاید موت کا سبب ہو جاوے، سو اس حالت میں تو نماز وانابت الی اللہ (رجوع الی اللہ) کا اور زیادہ اہتمام چاہیئے، تاکہ اگر مرے تو خاتمہ بالخیر ہو، اس میں غفلت سخت تعجب انگیز ہے . . . . !

بعضے بیمار اس لئے نماز چھوڑ دیتے ہیں کہ ان کا کپڑا اور بدن پاک نہیں ہوتا، خواہ بیماری

سے ۱؎ خوب غور وفکر کر کے قبلہ کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا ۱۲ فیض محمد سراوانی

چند روز ہو یا ممتد مثل سلسل بولؔ وغیرہ کے ہو مگر یہ عجیب ہے! اس لیئے کہ دو حال سے خالی نہیں۔
یا تو وہ ان کے پاک کرنے پر بلا ضرر قادر ہیں یا نہیں، اگر یہ قادر ہیں تو عذر کیسا؟
اور اگر قادر نہیں؟ تو وہ معذور ہیں، ان کو اسی حالت میں نماز کا حکم ہے اور وہ نماز ان کی صحیح اور کامل ہے اور پھر ان کو اپنی رائے اور طبیعت سے اس کو نا جائز یا بیکار اور ناقص سمجھنے کا کیا منصب ہے؟

عورتوں کی بے پرواہی

ایک حالتِ خاص عورتوں کو علی الدوام پیش آتی ہے، جس کے احکام نہ جاننے سے یا جان کر بے پرواہی کرنے سے، بڑی بڑی پابند اور دین دار عورتوں کی نمازیں کھنڈت پڑ جاتی ہے۔
اور وہ حالت انقطاعِ حیض کی ہے، حکم تو یہ ہے کہ اگر انقطاعِ حیض کے وقت نماز کا آخر وقت ہو اور اتنا ہی باقی ہو کہ جلدی جلدی بدون سر میں سرسوں یا کھلی ڈال کر دھوئے یا بدن کا میل اتارے تمام بدن پر پانی بہا کر کپڑے پہن کر ایک بار "اللہ اکبر" کہہ سکے تو اس وقت کی نماز اس کے ذمے فرض ہو جاتی ہے اور گو اس وقت تکمیل کی گنجائش نہیں مگر ثمرہ اس فرض ہونے کا تضاء میں ظاہر ہوگا، یعنی اس نماز کو دوسرے وقت قضاء کرنا پڑے گا اور جن نمازوں کا پورا وقت انقطاع کے بعد ملا ہے، ان نمازوں کا تو ادا پڑھنا فرض ہوگا۔
اب عموماً عورتوں میں بے پرواہی دیکھی جاتی ہے کہ اول تو اس کا خیال نہیں رکھتیں کہ حیض کس وقت منقطع ہوا ہے، ممکن ہے کہ وہ کسی نماز کے اتنے اخیر وقت میں منقطع ہوا ہو، جس میں غسل ضروری ہے و تکبیر تحریمہ کی گنجائش ہو اور اس لیئے وہ نماز ان پر فرض ہوگئی ہو، لہٰذا ان کے ذمہ یہ ضرور ہے کہ ہر نماز کے اخیر وقت میں ضرور پاکی و ناپاکی کو دیکھ لیا کریں، تاکہ ان کو معلوم ہو سکے کہ فلاں وقت کی نماز بھی ہمارے ذمہ فرض ہوگئی۔
دوسرے بعد علمِ انقطاع کے بھی پورے پورے کئی کئی وقت غسل میں دیر کر کے ٹال دیتی ہیں اور پھر ــــ غضب یہ ہے ادا نہ کرنے کا گناہ تو اپنے سر لیا ہی تھا، ان اوقات

سلہ ایک بیماری ہے جس میں پیشاب قطرے قطرے ہو کر آتا ہے۔ ۱۲ فیض محمد سراوانی

کی نمازوں کو قضا بھی نہیں پڑھتیں ! اور اس طرح سے ہر مہینہ ان کے ذمہ کئی کئی نمازیں چڑھتی چلی جاتی ہیں جن کا مجموعہ عمر بھر میں ایک بڑی مقدار کو پہنچتا ہے، اگر ہر مہینہ تین ہی تین نمازیں جمع ہوتی رہیں تو سال بھر میں چھتیس اور تیس برس میں ایک ہزار سے زیادہ ہوتی ہیں، پھر ان کی نہ حیات میں قضا ہے، نہ مرتے وقت ان کے فدیہ کی وصیت ہے، آخر انہوں نے قیامت کے لیے کیا جواب تیار کر رکھا ہے ؟ اور پھر اس پر یہ گمان کہ ہم نماز کے پابند ہیں جب قیامت میں یہ غلطی خلاف توقع ظاہر ہوگی، اس وقت کیا حال ہوگا ؟

بے پرواہی کا علاج

ان سب کا علاج بھی وہی دو امر ہیں جو اوپر مذکور ہوئے یعنی
(۱) وعیدوں میں غور کرنا، نفس پر جبر کرنا ، اور جو غلطی، احکام نہ جاننے سے ہے اس کے لیے احکام کا سیکھنا پوچھنا۔

چونکہ عورتوں کو غالب احوال میں پوچھنے کا سامان کم میسّر ہوتا ہے، اس لئے مردوں پر واجب ہے کہ اپنے متعلقین کو احکام شرعیہ بتلاتے رہیں جو نہ معلوم ہوں علماء سے تحقیق کر کے بتلاویں اور عورتوں پر واجب ہے کہ جو صورت پیش آوے گھر کے مردوں کو فرمائش کریں کہ وہ علماء سے پوچھکر ان کو بتلاویں، اور اگر گھر کے مرد غفلت کریں، دوسرے شخص کے واسطے سے تحقیق کریں، اگر کوئی توجہ نہ کرے تو خود علماء کے گھر جا کر ان کے محارم یا بیبیوں کے ذریعہ سے دریافت کریں، ورنہ گناہ گار ہوں گی۔

اور ضروری احکام پوچھنے کے لئے جب جانے کی ضرورت ہو اگر شوہر جانے سے منع کرے تو اس کی اطاعت واجب، بلکہ جائز بھی نہیں، اور اگر لکھنا آتا ہو تو جانے کی ضرورت نہیں بذریعہ خط کے دریافت کرتی رہیں، اور یہ سب، جب ہے جب کہ کوئی مرد خاندان کا ان کے کہنے سے علماء سے مسئلہ پوچھ کر ان کو نہ بتلاوے، ورنہ کسی کو خط لکھنا یا کہیں جانا اپنے شوہر کے خلاف مرضی جائز نہیں۔

بعضی عورتوں کے پابند نہ ہونے کا ایک سبب اور ہے، وہ یہ کہ ایسی طبائع کم ہیں جو

محض خدا کے خوف سے بجا آوری احکام کا اہتمام کرتی ہوں، زیادہ سبب مدامت کا عادت ہے سو چونکہ عورتوں کو ہر ماہ میں بوجہ ایامِ معمولی کے کئی کئی روز تک نماز پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوتا، اس کا اثر بعد پاک ہونے کے بھی یہ رہتا ہے، کہ بعض اوقات نماز میں سستی ہو جاتی ہے، گو اس کا اصلی علاج تو یہی ہے کہ خدائے تعالیٰ کا خوف دل میں پیدا کیا جاوے، مگر سبب ظاہری کا علاج کہ وہ بھی ایک درجہ میں کافی ہے، وہ ہے جس کو فقہاء نے ذکر فرمایا ہے۔

کہ عورت کو حالتِ حیض میں بھی مستحسن ہے کہ نمازوں کے اوقات میں وضو کر کے مصلے پر جا بیٹھے اور تھوڑی دیر تسبیح و تہلیل میں مشغول رہے، اس سے وہ عادت محفوظ رہتی ہے اور جو سستی ترکِ عادت کے سبب ہو سکتی ہے وہ نہیں ہوتی۔

بے نمازیوں کا بہانہ

بعضے بے نمازوں کا عذر، شرعی پیرایہ لئے ہوئے ہے، کہتے ہیں کہ نماز بدون حضورِ قلب کے ہوتی ہی نہیں اور حضورِ قلب ہم سے ہو نہیں سکتا، اس لئے نماز ہی چھوڑ دی، درحقیقت اس استدلال میں انہوں نے غلط و تلبیس سے کام لیا ہے، کیونکہ جس حضورِ قلب پر نماز کی صحت یا کمال موقوف ہے وہ اور ہے اور جو ہمارے امکان سے خارج ہے وہ اور ہے، تو دونوں مقدموں میں حدِ اوسط (علمِ منطق کی ایک اصطلاح) مکرر نہیں لہٰذا یہ استدلال غلط ہے، تفصیل اس کی یہ ہے کہ حضورِ قلب کے مراتب مختلف ہیں۔

ایک مرتبہ وہ ہے جس کو فقہاء نیت[1] کہتے ہیں اور وہ موقوف علیہ ہے صحتِ صلوٰۃ کا، یعنی بدون اس کے نماز ادا ہی نہیں ہوتی۔

اور دوسرا مرتبہ وہ ہے جس کو خشوع کہتے ہیں جس کی حقیقت انشاء اللہ تعالیٰ عنقریب مذکور ہوگی اور وہ موقوف علیہ ہے کمالِ صلوٰۃ کا یعنی اس کے نہ ہونے سے نماز تو صحیح ہو جاتی ہے مگر کامل نہیں ہوتی۔

---

[1] نیت دل سے ارادہ کرنے کو کہتے ہیں زبان سے کہنا ضروری نہیں ۱۲ محمد علی

ایک معقولی استدلال

تیسرا مرتبہ وہ ہے جس کو قطع وساوس سے تعبیر کرنا مناسب ہے، یعنی اصلاً کسی قسم کا خطرہ نہ آوے اور یہ ایک قسم کا استغراق اور حال ہے اس پر نہ صحت، صلوٰۃ کی موقوف ہے۔ اور نہ کمال صلوٰۃ کا، البتہ فی نفسہٖ ایک محمود حالت ہے، گو مقصود نہیں،

اوّل اور دوسرا مرتبہ اختیاری اور مقدور اور شرعاً مامور بہ بھی ہے اور اول مقدمہ میں یہی مراد ہے اور تیسرا مرتبہ غیر اختیاری اور غیر مقدور اور شرعاً غیر مامور بہ ہے اور دوسرے مقدمہ میں یہی مراد ہے،

جب حدِّ اوسط مشترک نہیں تو نتیجہ کیسے نکلے گا؟ اور اگر دونوں مقدموں میں ایک ہی مراد ہو تو پھر ایک مقدمہ باعتبار مادہ کے غلط ہوگا، مثلاً دونوں جگہ مرتبۂ اوّل وثانیہ مقدور ہے، جیسا ابھی بیان ہوا اور مقدور کو غیر مقدور کہنا غلط ہوگا، اور اگر دونوں جگہ مرتبہ ثالثہ مراد لیا جاوے تو دوسرا مقدمہ صحیح ہوگا مگر پہلا مقدمہ غلط ہوگا، کیونکہ مرتبۂ ثالثہ شرعاً غیر مامور بہ ہے، جیسا ابھی بیان ہوا اور غیر مامور بہ کو مامور بہ کہنا غلط ہوگا، جیسا مقدمہ اول میں لازم آتا ہے۔

کیونکہ کسی امر کا صلوٰۃ کے لئے صحۃً یا کمالاً موقوف علیہ ہونا، مستلزم ہے اس امر کے مامور بہ ہونے کو، جیسا کہ ظاہر ہے، جب ایک مقدمہ غلط ہوا تب بھی انتاج صحیح نہ ہوا۔

غرض خواہ ہیئت قیاس کی غلط ہو یا مادہ، نتیجہ دونوں حال میں غلط ہوگا، پھر علاوہ فی نفسہٖ غلط ہونے کے ان لوگوں کو یہ خبر نہیں کہ ان کے اس استدلال سے نصِ قطعی لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا۔ البقرہ[۲۸۵-۲۸۶] ترجمہ: (اللہ تکلیف نہیں دیتا کسی کو مگر جس قدر اس کی گنجائش ہے) کی تکذیب لازم آتی ہے۔ کیونکہ جو مرتبہ حضور کا ایسا ہے کہ بدون اس کے نماز نہیں ہوتی، خواہ مرتبہ صحت میں یا مرتبۂ کمال میں، لامحالہ شریعت میں اس کے حاصل کرنے کا حکم ہوگا۔ اور جس امر کا حکم ہوتا ہے اس کا داخل وسعت ہونا بنص بالا لازم ہے پھر اس کو وسعت سے خارج کہنا نص کی تکذیب ہے یا نہیں۔۔۔؟

عقل کے پتلوں سے سوال اور جہل کا علاج

پھر ان عقل کے پتلوں سے کوئی پوچھے کہ نماز میں جتنے فرائض موقوف علیہ صلوٰۃ کے ہیں اگر وہ کبھی وسعت سے خارج ہو جاتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ شریعت سے اس کا کوئی بدل اس کے قائم مقام کر کے اس کی اجازت دیتی ہے مثلاً قیام فرض ہے اگر قدرت نہ رہے، قعود اس کے قائم مقام ہوتا ہے، علیٰ ھذا پس اگر اس کو تسلیم بھی کر لیا جاوے کہ حضورِ قلب کا مرتبہ ضروریہ وسعت سے خارج ہے، تو ضرور ہے کہ شریعت میں کوئی اس کا بدل ہو گا؟ سو اس بدل کے ساتھ نماز پڑھنا ضروری ہوا پھر ترک کی کیسے گنجائش نکلی ......؟

یہ اس وقت ہے جبکہ حضورِ قلب اس کا رکن ہو اور اگر رکن نہ ہو، تو اس صورت میں سوچنا چاہئے کہ نماز بلا حضور پڑھنے میں تو نماز کے ایک تابع متعلق کا فوت ہے اور نماز نہ پڑھنے میں خود اصل متبوع ہی کا فوت ہے۔ تو متبوع کا فوت کر دینا اشد ہے یا تابع کا؟ پھر چونکہ تابع کا وجود بدون متبوع کے نہیں پایا جاتا اور متبوع کو فوت کر دیا ہے، تو لامحالہ تابع بھی فوت ہو گا، تو نماز پڑھنے میں تو صرف حضورِ قلب ہی فوت ہوتا اور نہ پڑھنے میں وہ حضور بھی گیا، اور نماز بھی گئی، تو صرف تابع کا فوت ہونا اہون ہے یا متبوع و تابع ہر دو کا؟

خوب سمجھ لو! چونکہ سبب ان کی غلطی کا جہل ہے، ہماری اس تقریر میں غور کرنا اس جہل کا علاج ہے۔

بعضے لوگوں کے نماز نہ پڑھنے کا یہ مبنی ہے کہ وہ باوجود دعویٔ اسلام کے نماز کو فرض نہیں سمجھتے پھر ان میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ (۱) بعض فلسفیت کے رنگ میں ہیں (۲) بعض تصوّف کے رنگ میں،

اہلِ فلسفہ کا دعویٰ اور اس کا ردّ

قسم اوّل کی تقریر یہ ہے کہ اصل مقصود شارع کو تہذیبِ اخلاق ہے زمانۂ نزول حکم صلوٰۃ میں لوگوں میں صفات ذمیمہ کبر و ظلم وغیرہ کا غلبہ تھا، نماز کی ہیأت و اوضاع و اذکار تواضع و لین

کی تعلیم دیتے ہیں، اس لئے ان کو نماز کا حکم کیا گیا، ہم چونکہ مہذب ہو چکے ہیں لہٰذا ہم کو نماز کی ضرورت نہیں ..... !!

جواب اس کا یہ ہے کہ یہ سب اس پر مبنی ہے کہ احکام شرعیہ کو مقصود بالذات نہ کہا جاوے مقصود بالغیر کہا جاوے اور پھر وہ غیر بھی وہ ہی امور ہوں، جو تم دعویٰ کرتے ہو، سو اس میں دو دعوے تمہاری طرف سے ہوئے ہیں جن کا ثابت کرنا تمہارے ذمہ ہے، "جس پر تم قیامت تک بھی قادر نہ ہو گے" بلکہ یہ احکام خود بھی مقصود بالذات معلوم ہوتے ہیں، بس ایسے بے سر و بن شبہات سے یہ قطع و یقین زائل نہیں ہو سکتا۔

غرض عقلاً و سمعاً ایسا اعتقاد یقیناً الحاد و زندقہ ہے اور ایسا شخص ہرگز مسلمان نہیں اس کو نماز کے ساتھ تجدید ایمان کا خطاب کرنا ضروری ہے، یہ جواب جب ہے کہ ہم اس کو مان لیں کہ واقعی یہ لوگ اپنی تہذیب نفس سے فارغ ہو چکے ہیں، حالانکہ ہنوز اس میں کلام ہے ترفع و تجبر و تعلّی و تکبر و ظلم و نخوت و قساوت و غفلت جس درجہ ان مدعیوں میں بڑھی ہوئی ہے، اس زمانہ میں اس کا عشر عشیر بھی نہ تھا۔ اگر مشروعیت صلوٰۃ کی ان ہی مصالح کے لئے ہوتی تب بھی یہ لوگ بہ نسبت اس زمانے والوں کے نماز کے زیادہ محتاج ہوتے۔

اس مرض کا کہ جہل ہے ... نیز علاج ہماری اس تقریر میں غور کرنا۔ اور یہ کافی نہ ہو، تو محققین سے اپنے شبہات کو دفع کر لینا ہے۔

اہل تصوف کی تقریر اور اس کا جواب

قسم ثانی کی یعنی جو تصوف کے رنگ میں ہیں ان کی تقریر یہ ہے کہ اصل مقصود قرب الٰہی ہے اور نماز دیگر طاعات بھی اس کا واسطہ ہے اور واسطہ بھی بالصورت نہیں بلکہ بالحقیقت اور وہ حقیقت ذکر ہے، پس اگر کسی کو ذکر دائم میسر ہو جائے، اس کو نماز کی حاجت نہیں، یا نماز ہی پڑھ پڑھ کر مقام قرب میسر ہو جاوے، پھر بھی نماز کی حاجت نہیں اگر پڑھتا بھی رہے تو اس پر فرض نہیں رہی، فرائض اس کے حق میں نوافل ہو گئے۔

اس کے جواب میں بھی وہی تقریر بالا جو نفس کے مقابلہ میں لکھی گئی کافی ہے۔ اور اس پر بھی وہی فتوی اور وہی علاج عرض کیا جائے گا۔

اور دونوں کے خطاب میں اس مثال کا پیش کرنا مفید اور معین رفع شبہ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح بعض ادویہ طبیہ میں باوجود بعض فاعل بالا کیفیت ہونے کے بعض فاعل بالخاصیت ہوتے ہیں، اور اس کی تعیین اطبا ماہرین کے حکم سے ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر ان سب عبادات شرعیہ کو محض اپنی صورت نوعیہ وخاصہ کے اعتبار سے خاص ثمرات، مثل اخلاق مرضیہ حق ونجات وقرب ورضا میں فاعل اور موثر کہا جائے اس کی نفی کی کیا دلیل ہے....؟

اور اس بات کی دلیل نصوص کا سیاق واطلاق ہے کہ کہیں ان کا فاعل بواسطہ ہونا نہیں بتلایا گیا اور جو کہیں بعض طاعات کی حکمت بتلائی گئی ہے تو غایت مافی الباب اس حکمت کا مرتب علی الاحکام ہونا ثابت ہوتا ہے، نہ کہ مرتب علیہ الاحکام ہونا اور دعویٰ کا موقوف ہے ثبوت امر ثانی پر، یہ سب صورتیں تھیں ایک کوتاہی کی یعنی نماز نہ پڑھنے کی ؛

بعض مشائخ میں تاخیر صلوٰۃ کی عادت اور اس کا علاج

ایک کوتاہی نماز کے متعلق یہ ہے کہ بعضے آدمی حتی الامکان تو نماز فوت نہیں ہونے دیتے مگر وقت کا اہتمام نہیں کرتے اکثر تنگ وقت میں نماز پڑھتے ہیں بعض دفعہ قضا بھی ہو جاتی ہے گو کم سہی اور گو پھر فوراً قضا پڑھ بھی لیتے ہیں۔ پھر بعض کو تو کوئی مجبوری ظاہری ہوئی ہے گو وہ مجبوری اس لئے معتبر نہیں کہ اگر اس میں سعی وتوجہ کرتے تو ضرور کوئی صورت انتظام کی نکل آتی مگر بعض تو محض بیکار گپوں میں مشغول رہ کر وقت کو اخیر کر دیتے ہیں اور نہایت افسوس کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ بعض ان میں مشائخ ہیں اور محض تذلیل شیطانی یا تسویل نفسانی سے تاخیر صلوۃ کے خوگر ہو گئے ہیں، چنانچہ ہر ایک کے متعلق مختصر کلام کیا جاتا ہے۔

جو لوگ ظاہراً کوئی مجبوری بتلاتے ہیں ان میں بعض کو تو کسی درجہ میں بھی مجبوری نہیں جیسے تاجر و مزدور و حاکم اجلاس واہل حرفہ وامثالہم کہ یہ لوگ بالکل آزاد ہیں، تھوڑی دیر کے کام چھوڑ سکتے ہیں، سو ان کے عذر کے متعلق تو کسی جواب کی ضرورت نہیں۔

بعض کو البتہ کسی درجہ میں مجبوری ہے، جیسے نوکر ایسے افسر کا جس کے سامنے اپنی

رلائے سے کچھ نہیں کر سکتا، سو اس کے متعلق یہ ہے کہ اول تو اوقاتِ نماز میں اجازت حاصل کرنے کی کوشش کرے اور دیکھا سُنا اکثر یہی ہے کہ باستثنار شاذ و نادر کوئی افسر نماز سے منع نہیں کرتا اور اگر کسی طرح اجازت حاصل نہ ہو، نہ خود اس سے، نہ اس کے بالا افسر سے تو اس صورت میں ایسی نوکری ہی جائز نہیں، خدا تعالیٰ دوسرا سامان رزق کا کر دے گا، ایسی نوکری چھوڑ دینی چاہیئے؟

البتہ جس شخص کے پاس بظاہر سرِ دست کوئی سبیل ضروری معاش کی بھی نہ ہو، نہ نوکری میں نہ سرمایہ ہو کہ تجارت کرے، نہ مزدوری کی عادت ہو اور بدون عادت چلنا دشوار ہوتا ہے تو ایسی حالت میں نوکری چھوڑنے میں تعجیل نہ کرے اس فکر میں لگا رہے، دوسرے خیر خواہوں سے بھی سعی کراوے اور تا حصول کسی سبیل کے ہمیشہ اس بلائے اختلالِ وقتِ صلوٰۃ سے استغفار اور دعائے استخلاص اور دوسری سبیل کے استحصال کی کرتا رہے۔

اور جن کو برائے نام بھی مجبوری نہیں محض بیکار وقت ضائع کرتے ہیں، ان کو اپنی حالت پر خاص طور پر نظر کرنا چاہیئے اور نفس سے محاسبہ کرنا چاہیئے کہ جب پانچوں وقت نماز پڑھنا پڑے، تو تاخیرِ اوقات سے کون سی آسان و تخفیف نکلی اور مجبوری کچھ نہیں ہے تو نہ کوئی مصلحت تھی کہ تاخیر کے اختیار کرنے کا مرجح ہو، نہ کوئی مجبوری تھی کہ تاخیر بالاضطرار کا سبب ہو، پھر وبال لینے سے کیا حاصل ہوا؟

اگر نفس یہ کہے کہ تاخیر کرنے سے مشغلۂ تفریح کا وقت زیادہ مل سکتا ہے، تو اس کو جواب دینا کہ اگر دو نمازیں اول وقت میں پڑھی جاویں تب بھی ان کے مابین اتنی ہی گنجائش ہوگی جتنی ان دونوں نمازوں کو اخیر وقت پر پڑھنے سے ملتی ہے۔

مثلاً اگر کسی نے ظہر چار بجے پڑھی اور عصر سات بجے تو درمیان میں تین گھنٹے ملے، سو اگر ظہر دو بجے پڑھتا اور عصر پانچ بجے تب بھی درمیان میں تین گھنٹے ملتے، تو جتنا کام درمیان میں تاخیر کی صورت میں کر سکتا ہے اتنا ہی تعجیل کی صورت میں کر سکتا ہے پھر تاخیر میں بجز مضرت کے کون سی مصلحت ہوئی ...؟

تفضیلِ شیطانی

اور ایسے مشائخ کو اوّلاً تو تفضیلِ شیطانی اور کبھی تسویلِ نفسانی اس تاخیر کا سبب ہوتی ہے۔
تذلیلِ شیطانی اس طرح کہ انہوں نے اپنی تجویز سے یا اپنے شیخ کی تعلیم سے کوئی معمول یا ورد ایک خاص مقدار سے مقرر و ملتزم کر لیا اور اس میں وقت کی تعین محض کسی مصلحتِ زائدہ غیر ضروریہ کے سبب سے تھی، مگر بروئے غلو اس عالم ملتزم نے اس کو ایسا فروری سمجھا کہ اس کی حفاظت کے لئے مہمات دینیہ کی بھی پروا نہ رہی! مثلاً بعض اوراد مابین سنّت و فرض فجر کے پڑھے جاتے ہیں۔

میں نے بعض متشددین و مصرین کو دیکھا ہے، جماعت کھڑی ہو گئی، مگر وہ اپنے ورد میں مشغول ہیں حتیٰ کہ جماعت فوت کر دی! اور بعض اوقات خود وقت بھی تنگ ہو گیا، مگر اس ورد کی ترتیب میں تغیر و تبدیل کو ہرگز جائز نہ رکھیں گے، حالانکہ یہ تغیّر فی نفسہٖ جائز تھا۔ اور جب عدم تغیر سے جماعت فوت ہو کُلاً یا بعضاً یا وقت تنگ ہو جاوے، اس وقت تغیر واجب تھا، مگر ان کو ترکِ واجب کی ذرا پروا نہیں! پھر اپنے اس التزام پر اس قدر شاداں و نازاں ہیں کہ اپنے کو صاحبِ استقامت سمجھتے ہیں کہ کبھی کوئی معمول میں تغیر نہیں ہوتا...!

میں نے ایک شخص کو یہ فخر کرتے سُنا ہے کہ صاحب میری فرض نماز کو ناغہ ہو جاتی ہے، مگر پیر صاحب نے جو کچھ بتلا دیا ہے وہ کبھی قضا نہیں ہوتا۔ غلو فی الدین اور اتخاذ احبار و رہبان کی یہ افسح افراد میں سے ہے، سبب اس کا جہل ہے علوم شرعیہ سے کہ حدود اعمال کی معلوم نہیں خواہ یہ بے علمی بسیط ہو یا مرکب ہو علی اختلاف الاقوال
یہ تو تفضیلِ شیطانی تھی۔

تسویلِ نفسانی

اور تسویلِ نفسانی اس طرح سے ہے کہ افراط فی الشفقۃ علی الخلق کے سبب یہ خیال ہوتا ہے کہ جلدی پڑھ لینے سے بہت لوگ جماعت سے رہ جائیں گے، خوب انتظار کرنا چاہیے، تاکہ

سب جماعت میں مل جاویں، اور کوئی محروم نہ رہے، اس کا نام "تسویل" اس لئے رکھا گیا کہ صورۃً یہ خیال نہایت محمود ہے اور نفسانی اس لئے کہا گیا کہ منشاء اس کا ایک صفت ہے صفاتِ نفسانیہ سے کہ وہ شفقت ہے اور گو وہ فی نفسہٖ صفتِ محمودہ ہے اور اس لئے جو خیال اس سے ناشی ہے کہ وہ خیر خواہی ہے آنے والے نمازیوں کی کہ کوئی محروم نہ رہ جاوے وہ بھی نیک ہے، مگر ہر محمود اسی وقت تک محمود ہے جب تک وہ کسی امر مذموم کو متضمن نہ ہو اور یہاں یہ شفقت اور یہ خیر خواہی سبب ہو گئی تضییقِ وقت کی حدِ غیر مشروع تک اور یہ مذموم ہے اس لئے وہ منشاء اور ناشی سب مذموم ہو گیا۔

اور ان سب نمازوں میں سب سے زیادہ قابلِ نظر ایسے حضرات کے لئے جمعہ کی نماز ہے، کیونکہ اور نمازوں کا اگر وقت نکل گیا اور علم نہ ہوا تو وہ فردِ قضاء کی تو بن سکتی ہیں گو بعض فقہاء کے نزدیک سہی اور جمعہ کا وقت اگر نکل گیا تو اس کی قضاء ظہر سے ہو سکتی تھی نہ کہ جمعہ سے، پس جب جمعہ پڑھا تو وہ نہ ادا ہوا کیونکہ وقت نہ تھا اور نہ قضاء کیونکہ قضاء میں جمعہ نہیں پڑھا جاتا، تو بس یہ نماز ان سب کے ذمہ پر واجب رہی اور رہی وہ مصلحت کہ کوئی رہ نہ جاوے اوّل تو جب اس میں اتنا بڑا مفسدہ لازم ہے تو اس مصلحت کا کیا اعتبار؟

پھر وہ مصلحت بھی کچھ تاخیر کے ساتھ خاص نہیں، تجربہ سے یہ امر یقینی ہے کہ اس باب میں جس جگہ جیسی عادت کا التزام کر لیا جاتا ہے تمام لوگ اسی کے تابع ہو جاتے ہیں جہاں سویرے نمازیں ہوتی ہیں سب کو تقاضا رہتا ہے کہ جلدی چلو چنانچہ سب فوراً جمع ہو جاتے ہیں۔ اور کوئی بھی متخلّف نہیں رہتا اور جو رہنے والے ہیں وہ مشاہدہ سے دیکھا جاتا ہے کہ اس تاخیر میں بھی رہ جاتے ہیں، بلکہ اکثر رہتے ہیں، ان کو بے فکری رہتی ہے کہ میاں ابھی کیا جلدی ہے وہاں تو بہت دیر میں جماعت ہوا کرتی ہے، بس اسی میں رہ جاتے ہیں، تو تاخیر کی وہ بھی غرض حاصل نہ ہوئی اور اگر حاصل بھی ہوتی تب بھی وہ لاحاصل ہے جیسا اوپر مذکور ہوا۔

علماء میں بھی تاخیرِ صلوٰۃ!

بہرحال وقت کا اس قدر مؤخر کرنا نماز کا بالکل تباہ کرنا ہے، چنانچہ احادیث میں اس پر سخت زجر آیا ہے اور ایسی نماز کو منافقوں کی نماز فرمایا ہے اور گاہ گاہ اہل علم میں سے بھی

بعض کو اس میں ابتلا ہوتا ہے جس کا اکثر موقع یہ ہوتا ہے کہ مدرّس کو کوئی کتاب ختم کرانا ہے ۔
یا سبق کسی خاص مقام تک پہنچانا ہے یا ممتحن کو کسی جماعت کو امتحان سے فارغ کرنا ہے ۔
یا مصنف کو کسی مضمون کا پورا کرنا ہے۔

تو ان مقاصد کو رعایتِ وقت پر بسا اوقات ترجیح دی جاتی ہے اس کا وقوع علماء سے بہ نسبت مشائخ کے اور بھی زیادہ عجیب ہے، کیونکہ یہ اصلِ وضع میں مقتدائے دین ہیں، جب مقتدا ایسا کرے گا پھر مقتدی کا کیا پوچھنا ہے ؟

(۳) ایک کوتاہی (گو ایسا شاذ ہوتا ہے مگر ہوتا ہے) اس کوتاہی مذکور کے مقابل کوتاہی ہے یعنی نماز میں اس قدر تعجیل کرنا کہ وقت بھی آنا یقینی نہ ہو۔

بعض لوگ فجر کی نماز صبح صادق سے پہلے شروع کرتے ہوئے دیکھے سنے گئے۔ بعض اہلِ افراط جمعہ کے روز دن بھی نہیں ڈھلنے دیتے اور کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بعضے مریضوں کو دیکھا گیا کہ مغرب کی تھوڑی ہی دیر بعد آسانی کے لئے عشاء پڑھ لیتے ہیں وقت بھی نہیں آتا اور جس کے مسلک پر مثلین کا قول بھی قوت رکھتا ہو اس کے لئے عصر کی نماز مثلین کے قبل پڑھ لینا احتیاط کے خلاف ضرور ہے۔

بہر حال وقت میں افراط و تفریط کرنا دونوں واجب التحرز ہیں، اگر اجلاس پر حاضری کا معین وقت پر حکم ہو تو قبل از وقت آکر اظہار و بنا یا وقت ختم کر کے آنا دونوں بیکار ہیں۔ تو شریعت کی تعیین کی وقعت و عظمت کیوں نہ کی جائے ؟

عورتوں میں نماز کا اہتمام نہ ہونا

(۴) ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض لوگ شرائط و ارکان میں ذرا سے عذرِ موہوم سے اسی رخصت پر عمل کرنے لگتے ہیں جو کہ عذرِ قوی کے متعلق ہے، مثلاً ذرا حرارت کا شبہ ہوا یا ذرا ہوا میں خنکی ہوئی بجائے وضو و غسل کے تیمم کر لیا، ذرا طبیعت میں کسل ہوا بیٹھ کر نماز پڑھنے لگے، ریل میں ذرا جگہ کی تنگی ہوئی جس کا آسانی سے انتظام ہو سکتا تھا، بیٹھ کر اور بعض دفعہ بے رخ، بعض دفعہ اشارہ سے نماز پڑھنا شروع کر دی، بلکہ ریل میں تو بالکل نماز ہی

اڑادی جاتی ہے، بالخصوص عورتیں توریل میں شاذونادر ہی نماز پڑھتی ہوں گی، اپنے دل کو سمجھا لیتی ہیں کہ یہاں نہ تو پانی کا انتظام ہے نہ جگہ گنجائش کی رہی۔ نہ تختہ پاک ہے، نہ رُخ معلوم ہے، یا رخ کی طرف پڑھنا دشوار ہے نہ پردہ کا پورا انتظام ہے اور ان عذروں سے مستورات کی نماز بیل گاڑی کے سفر میں بھی اکثر برباد ہوتی ہے۔

حُجاج کی نمازوں میں کاہلی و سستی

اور ان سے زیادہ ان لوگوں کی حالت قابلِ حسرت ہے جو حج کو جاتے ہیں اور ریل یا جہاز میں بیہودہ وساوس سے یا کاہلی سے نماز نہیں پڑھتے، ایک عبادت ادا کرنے چلے اور پانچ فرض روزانہ برباد کیے، اگر جہاز ہی کی ضائع شدہ نمازیں شمار کی جاویں اور ایک پھیرے میں پندرہ دن کی رفتار فرض کی جاوے تو پانچ نماز روز کے حساب سے پچھتر نمازیں ہوتی ہیں، اسی طرح اگر واپسی کا پھیرا لیا جاوے تو اتنی ہی اس میں ہو کر ڈیڑھ سو ہوئیں، کتنے افسوس کی بات ہے! کہ ایک فرض ادا کیا اور ڈیڑھ سو فرض برباد کیے!!! کیا ایسے شخص کے حج کو کہا جا سکتا ہے کہ خدا کا فرض سمجھکر کیا گیا ہے؟ اگر یہ تھا تو ڈیڑھ سو فرض بھی تو خدا ہی کے تھے ان کو کس دل سے ضائع کرنا گوارا کیا؟ سچ ہے کہ......... ہم لوگوں کو باعث عبادت کا بھی اکثر امورِ نفسانیہ امتیاز یا دفعِ ملامت وغیرہ ہوتا ہے یا اگر مجرد نہیں ہوتا تو امیزش زیادہ ضرور ہوتی ہے۔

بہرحال اگر ان لچر بناؤں پر نماز ترک کر دی تب بھی اور اگر اس میں بلا فتویٰ شرعی رخصت پر عمل کر لیا کہ وہ بھی ترک ہی کے حکم میں ہے تب بھی نہایت بددلی کی دلیل ہے، ایسی نماز پر تو خاصہ شبہ ہوتا ہے کہ محض دکھلاوے کے لیے نام کرنے کو پڑھتے ہیں، ایسے نمازیوں کی شان میں فرمایا گیا ہے واذا قاموا الی الصلوۃ قاموا کسالی یراؤن الناس ولا یذکرون اللہ الا قلیلا ہ النساء [۱۴۱ - ۱۴۲] اور جب کھڑے ہوں نماز کو تو کھڑے ہوں ہارے جی سے لوگوں کو دکھانے اور یاد نہ کریں اللہ کو مگر تھوڑا سا۔

بڑی وجہ اس کی دو امر ہیں:-

(۱) مسائل کی ناواقفی

(۲) نماز کی عظمت دل میں نہ ہونا۔

اول کا علاج "علم وواقفیت ہے" جس کا طریق سہل یہ ہے کہ نماز کے متعلق جو صورتیں پیش آجاویں یا جو جو احتمال ذہن میں آتے ہیں ان سب کو حافظہ میں یا کتابت میں مقید و محفوظ کر کے زبانی یا بذریعہ خط علماء ماہرین سے پوچھتے رہیں۔

دوسرے کا علاج یہ ہے کہ دل میں وعیدیں مخالفت احکام کی سوچیں تاکہ ان احکام کی عظمت پیدا ہو، جب عظمت پیدا ہوگی تو ضرور اس کی کوشش وارادہ کرے گا، جب کوشش وارادہ کرے گا خود ان عذروں کا لغو ہونا سمجھ میں آجاوے گا، کیا کسی تقریب میں جانے کے وقت یا کسی معزز مہمان کے آنے کے وقت جبکہ بدن اور کپڑے میلے ہوں یہی شخص جو ادنیٰ بہانہ سے تیمم کرتا ہے، غسل کر کے کپڑے بدلتا ہوا نہیں دیکھا جاتا... ؟ کیا ایسے ہی موقع پر اگر دیر تک کھڑا ہونا پڑے، بلکہ چلنے کی ضرورت ہو تو کیا اس کو آسان نہیں ہو جاتا ؟ مگر نماز میں کھڑا نہیں ہوا جاتا! کیا ریل میں اپنی آسائش کی ضرورت سے یا اپنے کسی مریض رشتہ دار کے آرام دینے کے لئے مسافروں سے جگہ دینے کی اس نے کبھی درخواست نہیں کی ؟ تو نماز کے لئے مہر سکوت منہ پر کیوں لگائی جاتی ہے۔

نماز کا اثر اور برکت

بلکہ ہمارا تجربہ یہ ہے کہ نماز میں وہ اثر اور برکت ہے کہ جب نماز کے لئے جگہ دینے کی درخواست کی جاتی ہے، تو شواذ تو ہر جگہ مستثنیٰ ہوتے ہیں اور شمار میں نہیں آیا کرتے، باقی کہیں نہیں دیکھا کہ کسی نے ذرا بھی عذر کیا ہو، مخالف مذہب والے تک رعایت کرتے ہیں، مگر خود ہی کوئی کچا اور کم ہمت ہو تو کیا علاج ؟ ورنہ ریل میں اچھے خاصے کھڑے ہو کر رکوع وسجدہ کے ساتھ اور رخ کی طرف نماز ہوتی ہے اور اگر کبھی موقع پر واقعی عذر ہو تو وہاں شریعت نے تنگ نہیں کیا۔ رخص پر عمل جائز ہے۔

اور بعضے عذر بالخصوص مستورات کے جو عذر مذکور ہوئے مسائل جاننے سے رفع ہو جائینگے

ان ہی میں سے ایک عذر پردہ کا ہے کہ ہلی سے اتر کر نماز پڑھنے میں بے پردگی ہے تو اس کے متعلق حکم شرعی سمجھ لینا چاہئے کہ ایسے وقت میں صرف برقعہ کا پردہ کافی ہے ہلی کے احاطہ میں رہنا ضروری نہیں اور حجاج کا نماز ترک کرنا اگر احکام کی عظمت نہ ہونے سے ہے تو اس کا علاج ابھی مذکور ہوا کہ وعیدیں مخالفت احکام کی سوچے اور اگر جہاز میں پاکی کا اہتمام نہ ہونا اس کا سبب ہے تو اس کے متعلق اول کی کوتاہی کے ضمن میں جہاں بیماروں کا نماز چھوڑ دینا بخیال نجاست بدون پارچہ کے مذکور ہے بیان کیا گیا ہے۔

اور اگر یہ حج نفل ہے اور کسی سبب سے اہتمام نماز کا نہ ہو سکے تو اس شخص کو اس حج کے لئے سفر کرنا ہی جائز نہیں وہ اپنے گھر رہ کر کام میں لگے وعلیٰ مثلہ نحمل ما قال العارف مسعود بک رحمۃ اللہ علیہ ؎

اے قوم بحج رفتہ کجائید کجائید — معشوق در ینجاست بیائید بیائید

تعدیل ارکان نہ کرنا

(۵) ایک کوتاہی یہ کہ بعض لوگ تعدیل ارکان وایتان سنن کا اہتمام نہیں کرتے نہ قومہ ہے نہ جلسہ ہے رکوع بھی ہیئت مسنونہ پر نہیں قیام کبھی قدر قراءۃ مسنونہ سے کم ہے قراءت میں بھی غلط صحیح کی خبر نہیں، نماز کیا پڑھتے ہیں بیگار ٹالتے ہیں، ایک حدیث میں ایسے شخص کو نماز کی چوری کرنے والا فرمایا ہے اور ایک حدیث میں ایک ایسے شخص کو نماز کے اعادہ کا حکم اس ارشاد کے بعد دیا کہ جا پھر نماز پڑھ تو نے نماز نہیں پڑھی یعنی یہ نماز تیری نہیں ہوئی۔

یہ مسئلہ فقہیہ تو الگ رہا کہ اس کی نماز ہوئی یا نہیں؟ لیکن اگر ہوئی بھی تو وہ بھی ایسی ہی ہوئی جیسے ایک کنیزک لنگڑی، لنجھی، اندھی، بہری، گونگی، اپاہج، بیمار ہوا اور وہ ایک درجہ میں آدمی تو ہے مگر قابل اس کے نہیں کہ کسی صاحب کمال، صاحب جلال بادشاہ کی نظر میں پیش کی جا سکے اور وہ اس کو قبول کرے، اسی طرح یہ نماز ایک درجہ میں نماز کہلائی جاوے گی مگر جب اس کے ارکان جو بمنزلہ اعضاء کے ہیں ناقص ہیں تو وہ قابل اس کے نہیں کہ حق تعالیٰ کے حضور میں قبول ہو سکے، یا اعضاء درست ہوں مگر ہیئت مسنونہ پر نہ

ہونے سے ایسی ہوگی جیسے تندرست کنیزک خال وخط، ناز وادا سے خالی ہو، جو بادشاہ کو مطبوعِ خاطر ہے پس درجۂ کمال میں مقبول نہ ہوگی یعنی محبوب نہ ہوگی گو لے لی جاوے اس لئے اس کی تعدیل اور تکمیل ضروری ہے۔

رکوع وسجود وغیرہ کی درستی کے لئے تو خالی ارادہ کافی ہے، کسی خاص اہتمام کی ضرورت نہیں، البتہ قیام بقدرِ مسنون کے لئے کچھ سورتیں خاص سیکھنا ضروری ہوں گی جس کے لئے عمّ کا سیپارہ حفظ ہونا کافی ہے کہ اس میں سورۂ بروج تک طِوالِ مفصّل ہے اور لم یکن تک اوساط اور اس سے سورۂ ناس تک قصار کہ ان کے یاد کرنے سے مختلف نمازوں میں سنت ادا ہوسکتی ہے اور تصحیح قرآن کے لئے کچھ توجہ کرنا پڑے گی، جس کے متعلق اس سے قبل عنوان "اصلاح معاملہ بہ قرآن مجید" کے ذیل میں عرض کرچکا ہوں اس کا ملاحظہ فرمانا اس باب میں کافی ہوگا۔

اور جس طرح اپنا قرآن صحیح کرنا ضروری ہے، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ اپنے گھر والوں کی نماز اور قرآن جس قدر نماز میں پڑھا جاتا ہے اہتمام کرکے درست کراویں، اگر دس منٹ روزانہ بھی اس کام میں چند روز صرف کریں تو بہت آسانی سے اس میں کامیابی ہوسکتی ہے غرض اس طرح سے نماز کی تکمیل و تعدیل میسر ہوجاوے گی۔

بعض بارہ مہینے اچھی خاصی نماز پڑھتے تراویح میں تعجیل کی مشق کرنے لگتے ہیں انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ اس کے متعلق خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا جائے گا۔

نمازی امراء کی کوتاہیاں

(۶) ایک کوتاہی کہ وہ نمازی امراء میں بالخصوص کثرت سے ہے، جماعت کا ترک کرنا ہے، نصوص سے اس کا حد درجہ اہتمام ثابت ہوتا ہے حتیٰ کہ اس کے ترک پر جو وعیدیں آئی ہیں ان پر نظر کرکے بہت علماء نے اس کو واجب کہا ہے اور بعض محققین فقہاء حنفیہ نے بھی اس کو اختیار کیا ہے اور واجب عمل میں اور ترک کے گناہ اور سزا میں برابر فرض کے ہے، پس ایک فرض کو ادا کرنا اور اس کے مساوی کو ادا نہ کرنا یہ کس درجہ کی غلطی ہے؟ اور تتبع سے

جہاں تک دیکھا گیا سبب ترکِ جماعت کا اکثر دو امر ہیں۔

(۱) سستی کہ اتنی دور کون جاوے دھوپ میں کون جائے؟

(۲) تکبر کہ ذلیل لوگوں کے ساتھ کھڑا ہونا پڑے گا یا ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھنا پڑے گی۔

اور کبھی اس کا سبب مسجد میں ان لوگوں کی شان و عادت کے موافق سامانِ آسائش کا مفقود ہونا ہوتا ہے، چنانچہ میں نے ایک صاحب کو یہ عذر کرتے ہوئے دیکھا کہ وہاں وضو کا موقع ایسا ہے کہ وہاں بیٹھیں تو کپڑوں کو کائی لگ جاتی ہے، چٹائیاں سڑی ہوئی جن میں گرد و غبار بھرا ہوا بچھی ہیں، جن سے کپڑے میلے ہو جاتے ہیں، ہوا کا گذر نہیں دل پریشان ہوتا ہے۔

سستی کے متعلق تو اتنا عرض کرنا کافی ہے کہ اگر اسی وقت میں کوئی دنیا کا کام جس میں مال و جاہ کا نفع ہو نکل آوے یہی حضرات اس کی طرف اس طرح دوڑیں کہ ذرا بھی کسل نہ ہو نہ گرانی ہو، افسوس! کیا آخرت کی ضرورت اس درجہ پر بھی نہ رہی!

میں نے ایک صاحب کو دیکھا ہے کہ ان کے دروازہ پر مسجد تھی مگر وہاں کبھی تشریف نہ لاتے تھے، ایک بار ان کے یہاں لڑکے کی تقریب بسم اللہ کی تھی اور ان کے ایک غریب بھائی کسی بات پر اینٹھ گئے تھے، عین جیٹھ بیساکھ کی دوپہر میں ایک بچہ کی چھتری کو وہ پورا سایہ بھی نہ کر سکتی تھی لگا کر ان کے پاس ایک دور محلہ میں گئے اور ان کو منا کر لائے۔ یاد نہ دنیا کی مصلحت کے وقت وہ سستی کہاں چلی جاتی ہے؟؟ علاج اس کا وہی وعیدوں کا یاد کرنا ہے۔

اور تکبر کے باب میں یہ معروض ہے کہ اول تو آپ کی شان ہی کیا ہے؟ شاید وہ مساکین خدا تعالیٰ کے نزدیک تم سے زائد محبوب و مقبول و ذی جاہ ہوں، اس کے سامنے دنیوی عزت گرد ہے، بلکہ عجب نہیں کہ قیامت میں تم کو ان ہی مساکین کی التجا کرنی پڑی اور ان کی استدعا سے تمہاری رہائی ہو تو باوجود قیامِ احتمال کے تم کو ان کے حقیر سمجھنے کا کیا حق حاصل ہے....؟

دوسرے اگر تمہاری شان ان مساکین سے زیادہ بھی مان لی جاوے تو تم مساجد میں ان مساکین کی تعظیم کے لئے تو نہیں بھیجے جاتے کہ خلافِ شان ہو بلکہ تم اور وہ سب ایک ایسے عظیم الشان کی تعظیم

کے لئے جمع ہوئے ہو جس کی تعظیم سے تمہاری شان بڑھتی ہے، کیا کسی بادشاہ کے دربار عام کے موقع پر کوئی شخص محض اس بنا پر حاضر ہو کر سلام کرنے سے اعراض یا اغماض کرنے کی ہمت کر سکتا ہے کہ وہاں تو غربا بھی جا کر سلام کرتے ہیں؟ اور اس سلام کے لئے جانا اہانت ہے، کیا سچ مچ ایسے دربار کے موقع پر سلام کرنا اہانت ہے؟ ہرگز نہیں، ——— ہرگز نہیں، کیا کوئی ایسا سمجھ کر نہ جاوے تو وہ سرکش اور گستاخ نہ سمجھا جاوے گا؟ ضرور، ضرور، تو تعجب ہے کہ دربار شاہی کے ساتھ تو یہ برتاؤ اور دربار الٰہی کے ساتھ یہ برتاؤ .... !! صَدَقَ اللّٰهُ تَعَالیٰ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ الحج [۲۲-۷۴] (اللہ کی قدر نہیں سمجھے جیسی اس کی قدر ہے بیشک اللہ زور آور زبردست ہے)

اور اگر کسی مسکین کے امام ہونے سے عار آتی ہے تو اول تو وہ عار کی بات نہیں، کیا حکام کے درباروں میں حاضر ہونے کے وقت اردلی خاص کہ رتبہ اور ریاست میں تمہاری برابر نہیں، پیشی کرنے کے وقت تمہارا پیش رو نہیں ہوتا؟ پھر اس وقت عار کیوں نہیں آتی؟ یہ ساری عار خدا ہی کے معاملہ میں کیوں ہے؟ اصل یہ ہے کہ وہاں تو خوشنودی مقصود ہے وہ جس طریق سے بھی حاصل ہو اور یہاں یہی مقصود نہیں ورنہ کسی طریق سے بھی عار نہیں آتی، وللّٰہِ درّ العارف الرومی[1] رحمۃ اللہ علیہ حیث یقول ؎

شاد باد اے عشق خوش سودائے ما   اے طبیبِ جملہ علت ہائے ما

اے دوائے نخوت و ناموس ما   اے تو افلاطون و جالینوس ما

دوسرے اگر پھر بھی عار ہے تو آپ لیاقت علمی و عملی ان مساکین سے زیادہ حاصل کیجئے پھر آپ کے ہوتے ہوئے وہ غریب خود ہی امام نہ بنے گا، آپ امام بنئے! اس مسکین کو عار نہ آوے گی، وہ اقتدار کرے گا اور جماعت ہو جاوے گی، افسوس خود تو الحمد اور قل ھو اللہ بھی صحیح

---

[1] حضرت مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ بلخ میں ۶ ربیع الاول ۶۰۴ھ ۳۰ ستمبر ۱۲۰۷ء میں پیدا ہوئے مولانا روم رحمۃ اللہ نے مثنوی شریف کی تصنیف ۶۲۲ھ / ۱۲۲۵ء میں شروع کی اس کے سات دفتر ہیں جس میں ۲۵ ہزار سے زائد اشعار ہیں۔ سب سے زیادہ مثنوی شریف کی شروحات لکھی گئی ہیں۔ آپ نے ۵ جمادی الثانی ۶۷۲ھ / ۱۲ ستمبر ۱۲۷۳ء کو وفات پائی ۱۲ فیض محمد سراوانی

نہ جانتے ہوں! اس تک کی خبر نہ ہو کہ سجدہ سہو کن صورتوں میں واجب ہو جاتا ہے اس لئے
تو خود امامت کے قابل نہ ہوں اور جو دوسرا اس قابل ہو اس سے عار کریں یہ عار نہیں —
نار ہے ؎

زینہار از چنیں تکبر و عار وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّار

رہ گیا عذر مسجد میں سامانِ آسائش نہ ہوگا، تو اس عذر کو تو زبان پر لاتے ہوئے بھی ان
حضرات کو شرمانا چاہیئے، کیونکہ اس عذر کے معنی تو غور کرنے سے یہ نکلتے ہیں کہ مسجد غربا کا گھر
ہے، وہ اگر ہم کو بلاتے ہیں تو ہماری شان کے لائق اس کو سامان سے درست کرنا چاہیئے ورنہ ہم
نہیں جاتے۔

کیوں صاحب؟ کیا وہ سچ مچ غربا کا گھر ہے، اگر ان کا گھر نہیں تو پھر اس عذر کے کیا معنی؟
اگر یہ معنی ہیں کہ خدا کا گھر ہے، خدا کو ایسا کرنا چاہیئے، تو کیا اس کہنے کی جرأت کر سکتے ہو؟ اگر نہیں
کر سکتے تو اس کے جواب کی کیا ضرورت ہے؟ اور اگر کر سکتے ہو تو جواب سنو! خدا تعالیٰ نے آپ
کو اور غربا کو سب کو غلام بنایا ہے، اور منجملہ دوسری خدمتوں کے یہ خدمت بھی سپرد کی ہے کہ اس
دربار میں آسائش و ضروریات کا سامان جمع کرو اور اس کے انتظام کے لئے سب کو رقم بھی دی ہے
کیونکہ سب اموال مملوک خدائے تعالیٰ کی ہیں پس غربا سے زیادہ تمہارے ذمہ واجب ہے کہ اس
دربار یعنی مسجد کا انتظام کرو اور جس سامان نہ ہونے سے آپ وہاں نہیں جاتے اس کو خود
درست کرو اور وہاں جاؤ تو یہ عذر کرنا حقیقت میں اپنی کوتاہی کا اظہار و اقرار ہے کہ ہم نے
خدمتِ دربار کے متعلق جو احکام تھے ان کی بجا آوری نہیں کی تو یہ غربا کے الزام کی بات ہوئی
یا تمہاری شرم کی بات ہوئی؟ یہ تو دنیا دار امرا کے متعلق مضمون تھا،

بعض لوگ دیندار وں میں شمار ہوتے ہیں اور امام میں شرعی عیب نکال کر جماعت ترک
کرتے ہیں، کبھی تو اصلی سبب اس کا کوئی دنیوی رنج ہوتا ہے بہانہ کے لئے کوئی عیب ڈھونڈ
کر اس کی آڑ لیتے ہیں کہ وہ تو فلاں معصیت میں مبتلا ہے، فلاں بدعت میں مبتلا ہے بعض
متکبروں کو اصل مانع تکبر و غربا کی تحقیر ہوتی ہے، مگر چونکہ دیندار کہلاتے ہیں اس لئے شرعی
عنوان نکال کر اپنی غرض حاصل کرتے ہیں۔ مثلاً مفتی سے پوچھتے ہیں کہ جناب جس کی بیوی بے

پردہ پھرتی ہو وہ دیوث ہے یا نہیں؟ اور اس کی امامت جائز ہے یا نہیں؟ وعلیٰ ھذا۔

اور کبھی اصلی سبب تدین بھی ہوتا ہے، مگر احکام کے نہ جاننے سے یا اہتمام نہ کرنے سے غلطی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً دل سے بدعت سے نفور ہیں اس لئے امام سے بغض للدین ہے اور کوئی رنج دینوی نہیں ہے، مگر اس مسئلہ کی ان کو خبر نہیں کہ انفراد سے ہر حالت میں جماعت کی نماز افضل ہے، اگرچہ امام مبتدع ہو بشرطیکہ بدعت اس کی حد کفر تک نہ پہنچ گئی ہو، اگر اصلی سبب دنیوی رنج ہو تو سمجھنا چاہیئے کہ دین کو اپنی اغراض دینویہ کا ذریعہ بنانا سخت نازیبا وناپسندیدہ اور بے ادبی وگستاخی ہے جس کا قبیح ہونا محتاج بیان نہیں۔ اگر خلق سے اپنا عیب چھپالیا تو حق تعالیٰ پر تو ظاہر ہے اس کو کیا جواب دو گے؟

اگر اصلی سبب تکبّر ہے تب بھی یہی جواب ہے اور اس سے کچھ اوپر بھی مفصّل بیان تکبّر کا ہو چکا ہے اور یہ بے پردگی کا بہانہ جو تراشا گیا ہے، سو اس کا کلی جواب تو یہی ہے نفسانی غرض کو دین کی آڑ کیوں بناتے ہو اور جزئی جواب یہ ہے کہ خود معترض بھی اس اعتراض سے کم محفوظ ہوں گے، کیونکہ پورا پردہ شریعت کے موافق بڑے لوگوں میں بہت کم ہوتا ہے۔ اکثر ان کے متعلقات دور ونزدیک کے اعزہ کے روبرو بے حجاب آتے ہیں، اتنا فرق ہے کہ بعض غریبوں کی عورتیں خود گھر سے نکل کر نامحرموں کا سامنا کرتی ہیں اور امیروں کی عورتیں گھروں کے اندر بیٹھکر نامحرموں کا سامنا کرتی ہیں، تو دونوں برابر ہوئیں، بلکہ غریبوں کی بیویوں میں اتنی ترجیح ہے کہ وہ میلی کچیلی ہو کر نامحرموں کے سامنے آتی ہیں اور امراء کی عورتیں زیب وزینت کے ساتھ آتی ہیں، تو اب خود دیکھ لیجئے کہ یہ اقبح ہے یا وہ اقبح ہے، تو اس حیثیت سے بھی اکثر غرباء اولیٰ بالامامت ہوئے اکثر امراء سے۔

اور اگر تدین ہی سبب ہے تو اس میں جو غلطی ہے وہ مسئلہ کے جاننے سے جاتی رہیگی، جیسا اوپر بیان کیا گیا کہ انفراد سے جماعت افضل ہے، رہی کراہت تو اوّل تو کراہت اقتداء اس کیلئے ہے جو اس امام کے معزول کرنے پر قادر ہو، پھر یہ کہ کراہت اخف ہے ترک جماعت کی کراہت یا حرمت سے، البتہ اگر ایسے مقام پر شریک جماعت ہونے سے احتمال فتنہ کا ہو تو یکسوئی بہتر ہے۔

ان تارکانِ جماعت میں بعض مشائخ دیکھے جاتے ہیں، ان کو یہ دھوکہ ہوا ہے کہ جماعت میں اختلاطِ خلق ہوتا ہے اور اختلاط خلق ذاکر و سالک کو مضر ہے،

اور بعض نے تنہا بیان کیا کہ یہ پڑھنے میں وساوس وخطرات کم آتے ہیں، اور جو نماز حضور قلب کے ساتھ ہو وہ افضل ہوتی ہے عدم حضور والی نماز سے اور جماعت میں یہ حضور میسر نہیں ہوتا، اس دھوکہ کا منشاء یہ ہے کہ یہ حضرات مواجید وکیفیاتِ ذوقیہ کو مقصود بالذات سمجھ بیٹھے اور وہ بعض اوقات خلوت میں زیادہ ہوتے ہیں بہ نسبت جلوت کے، لیکن واقع میں مقصود بالذات رضائے حق ہے جس کا ذریعہ بجا آوریٔ احکام ہے کہ منجملہ ان کے جماعت کی نماز ہے۔ اگرچہ اس میں ذوقیات ووجدانیات کی قلت ہو، پھر تجربہ ہوا ہے کہ بعض افعال شرعیہ گو سردست کسی کیفیتِ خاص کی قلت کا سبب معلوم ہوتے ہیں مگر ان کی مداومت سے دوسری کوئی کیفیت بتدریج ایسی حاصل ہوتی ہے کہ اس کیفیت فائتہ سے اعلیٰ واقویٰ وابقیٰ ہو اس وقت اس کی قدر معلوم ہوتی ہے۔

خشوع کا فقدان

(۷) ایک کوتاہی جس کو عوام تو عوام بعضے خواص بھی کوتاہی شمار نہیں کرتے اور اس حیثیت سے وہ خاص طور پر اہتمام کے قابل ہے نماز میں خشوع وحضور قلب کا نہ ہونا ہے، جس کے مطلوب ہونے کے لئے آیۃ قد افلح المؤمنون الذین ھم فی صلوٰتھم خاشعون ۵ المؤمنون [۱-۲] یعنی کام نکال لے گئے ایمان والے، جو اپنی نماز میں جھکنے والے ہیں۔
اور اس میں تقصیر کرنے کی مذمت کے لئے آیت الم یان للذین آمنوا ان تخشع قلوبھم الخ الحدید [۱۵-۱۶] (کیا وقت نہیں آیا ایمان والوں کو کہ گڑگڑائیں ان کے دل)
کافی ہے اور سبب اس کا بالاستقراء دو امر ہیں:
(۱) بعض کو تو اہتمام ہی نہیں ان کے لئے تو یہ بے اعتنائی،
(۲) بعض کو اہتمام ہے مگر اس کی حقیقت نہ جاننے سے اس کو اختیار اور قدرت سے باہر سمجھتے ہیں اس لئے اس کی تحصیل کا ارادہ ہی نہیں کرتے۔

پہلے سبب کا علاج تو آیاتِ بالا کے مضمون میں غور کرنا ہے،
اور دوسرے سبب کا علاج اس کی حقیقت سمجھنا ہے جس کو مختصراً بیان کرتا ہوں جس کا وعدہ اس کوتاہی کے ضمن میں کیا گیا ہے کہ بعضے ترکِ نماز کا یہ عذر کرتے ہیں کہ ہم سے حضور قلب نہیں ہو سکتا اور نماز بدون اس کے ہوتی نہیں۔

خشوع کی حقیقت

سو حقیقت لغویہ خشوع کی، سکون ہے اور حقیقتِ شرعیہ اس کی، سکونِ ارادی ہے قلب اور جوارح کا۔ اور سکون مقابل ہوتا ہے حرکت کے، سو جیسی حرکت ویسا سکون تو جوارح کی حرکت اینیہ یعنی مکانیہ ہوتی ہے ان کا سکون یہی ہے کہ جس حرکت کا شرعاً امر نہیں وہ حرکت نہ کرے یعنی ارادہ سے ہاتھ پاؤں عبث نہ ہلاوے ادھر ادھر گردن یا نظر سے التفات نہ کرے، سر اوپر کو نہ اٹھاوے، بالوں کو، کپڑوں کو بار بار نہ سنوارے، بدون ضرورت نہ کھجلاوے، نہ کھنکارے ونحو ذالک

اور قلب کی حرکتِ فکریہ ہے اس کا سکون عدم الفکر ہے یعنی اپنے ارادہ سے کسی بات کو نہ سوچے، سو جیسی حرکت جوارح کی اگر بلا قصد ہو مثلاً رعشہ سے کسی کی گردن ہلتی ہو تو وہ منافی خشوع کے نہیں کیونکہ اختیار سے خارج ہے اور اضطراریات امر ونہی کے تحت میں نہیں ہیں، اسی طرح اگر حرکت قلب کی بلا مقصد ہو یعنی کوئی خیال خود بخود آجاوے تو وہ بھی اسی دلیل سے منافی خشوع کے نہیں پس غلطی لوگوں کی یہ ہے کہ خشوع کے معنی یہ ہیں کہ بالکل خیال نہ آوے اور اسی بنا پر اس کو محالِ عادی سمجھتے ہیں مگر اس بنا کا فاسد ہونا ہماری تقریر سے معلوم ہو چکا ہے، جس سے محرر ہو گیا کہ خشوع اختیاری فعل ہے اور ہر شخص اس پر قادر ہے اور بہت آسان ہے البتہ ارادہ وتوجہ کی ضرورت ہے۔

حصول خشوع کا طریقہ

پس جیسے سب افعالِ ارادیہ کی شان ہے کہ ارادہ کرو تو آسان ارادہ نہ کرو تو دشوار، حتیٰ کہ اگر منہ میں لقمہ لے کر بیٹھ جاوے اور نگلنے کا ارادہ نہ کرے تو وہ بھی آسان

نہیں پس اگر لقمہ نگلنا آسان ہے تو خشوع بھی اتنا ہی آسان ہے اور اگر خشوع محال ہے تو لقمہ نگلنا بھی اتنا ہی محال ہے، دونوں کے یُسر اور عُسر میں کچھ فرق نہیں اور سہل طریقہ اس کا یہ ہے۔

کہ نماز میں جو کچھ بھی منہ سے نکلے محض یاد سے نہ پڑھے بلکہ ہر ہر لفظ پر مستقل ارادہ کرکے اس کو منہ سے نکالے کہ اب سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ کہوں گا اب وَبِحَمْدِكَ کہہ رہا ہوں اب وَتَبَارَكَ اسْمُكَ منہ سے نکل رہا ہے وعلیٰ ھذا،

پس جب ہر لفظ پر خاص توجہ رہے گی لامحالہ حسبِ قاعدہ عقلیہ کہ النفس لاتتوجہ الیٰ شیئین فی آنٍ واحدٍ دوسرے خیالات بند ہو جاویں گے۔ ترجمہ: نفس ایک وقت میں دو چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔

اس مراقبہ کو اوّل سے آخر تک بالالتزام کرے انشاء اللہ تعالیٰ اول تو بلاقصد بھی کوئی خیال نہ آوے گا اور اگر فرضاً آجاوے تو پھر اس سوچ میں نہ پڑے کہ ارے یہ تو پھر خطرات آنے لگے، یہ سوچ بھی خیال غیر ہے، بلکہ اسی عملِ تجدید تعلقِ ارادہ وتوجہ کو بطریقِ مذکور آئندہ کے لئے پھر تازہ کردے پھر وہ خطرات دفع ہو جاویں گے۔ وھذا من افادات استاذی استاذ الکل حضرت مولانا محمد یعقوب علیہ رحمۃ اللہ علام الغیوب [۱]

اور اس احقر کا ایک وعظ خشوع کے ہر پہلو پر مفصّل بحث میں شائع ہو چکا ہے جس کا نام "مواعظ اشرفیہ" ہے اس کے ملاحظہ سے انشاء اللہ تعالیٰ اس باب میں کسی قسم کا خفاء باقی نہ رہے گا۔

متفرق کوتاہیاں

ایک کوتاہی کہ ذی شعب مختلف ہے اور اسی پر اپنی تحریر کو ختم کرنا چاہتا ہوں یہ ہے

---

[۱] حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی ولد مولانا مملوک علی صاحب ۱۳ صفر ۱۲۴۹ھ رجون ۱۸۳۳ء میں پیدا ہوئے۔ تاریخی نام منظور احمد ہے۔ حدیث شریف آپ شاہ عبدالغنی رح سے پڑھی (حاشیہ دیکھیں صفحہ ۱۱۶)

کہ نماز اتنی بڑی ضروری چیز اور پھر روزانہ پانچ بار ــــ واقع ہونے والی اور اس کے شرائط وارکان کے ہر جزو اور ہر موقع پر بے شمار صورتیں پیش آتی ہیں، جن کے احکام بہت لوگوں کو معلوم نہیں، مگر باوجود اس کے بہت کم دیکھا جاتا ہے کہ ان احکام و مسائل کو لوگ دریافت کرتے ہوں!

(۱) بہت لوگ ناواقفی سے بلا اضطرار اس طرح جمائی لیتے ہیں یا بلا عذر کھنکارتے ہیں کہ حروف ظاہر ہو کر نماز جاتی رہتی ہے،

(۲) بہت لوگ ایسے لباس غیر مشروع سے نماز پڑھتے ہیں کہ نماز ان کی قبول نہیں ہوتی بالخصوص بعض اقسام ریشم و رمخمل کے استعمال میں تو خواص تک بے احتیاطی کرتے ہیں۔

(۳) بعض لوگ ہجوم میں امام سے پہلے نیت باندھ لیتے ہیں کہ وہ نماز ہی نہیں ہوتی۔

(۴) بعض لوگ امام کے ساتھ رکوع میں اس طرح شامل ہوتے ہیں کہ اللّٰہ اکبر کہتے ہی رکوع میں پہنچ جاتے ہیں اور اول قیام نہیں کرتے ان کی نماز بھی نہیں ہوتی۔

(۵) بعضے لوگ قعدۂ اخیرہ میں امام کے ساتھ شریک ہونا چاہتے ہیں مگر ان کی تکبیرِ تحریمہ ختم کرنے سے پہلے امام سلام پھیر دیتا ہے تو وہ اقتدا صحیح نہیں ہوتی اور نیت اقتدا موضع انفراد میں مفسدۂ صلوٰۃ ہے ان کی نماز بھی نہیں ہوتی از سر نو نماز شروع کرنا چاہیے۔

(۶) اسی طرح بعض اوقات امام سہواً بعد قعدۂ اخیرہ کے کھڑا ہو جاتا ہے تو مسبوق بھی اقتدا کی حیثیت سے ساتھ اٹھ کھڑا ہوتا ہے حالانکہ اس وقت مسبوق کو اقتدا جائز نہیں تو اس کی نماز بھی فاسد ہو جاتی ہے

(۷) علیٰ ھذا اگر امام مسافر بعد دو رکعت کے سہواً کھڑا ہو جاوے مقتدی مقیم کو اس کے ساتھ مقتدی رہنا بھی مفسد صلوٰۃ فرض ہے۔

(باقی حاشیہ صفحہ ۱۰۱) معقولات، منقولات غرض کہ تمام فنون میں کامل تھے شاعری میں کسی کی شاگردی نہ کی۔ مگر کبھی جب طبیعت حاضر ہوتی تو اردو فارسی عربی میں بہترین شعر کہتے تھے شاعری میں غلو نہ تھا۔ بلا تکلف اگر کہہ لیا کہہ لیا ورنہ نہیں۔ گمنام تخلص فرماتے تھے۔ یکم ربیع الاول ۱۳۰۳ھ مطابق دسمبر ۱۸۸۴ء میں ہیضہ کی وبا میں وفات پائی! ۲ محمد مکی،

اس مقام پر مسائل کا استیعاب منظور نہیں اور نہ ممکن ہے، محض بعض مثالیں پیش کرنا ہے کہ ایسی صورتیں کس کثرت سے واقع ہوتی ہیں جنھیں نماز نہیں ہوتی اور لوگ اس سے بے خبر ہیں!

اسی طرح شرائط میں بھی بے پروائیاں کیجاتی ہیں:۔

(۸) بعضے آدمیوں کو دیکھا گیا ہے کہ کپڑے پر تکیہ پر اگرچہ غبار نہ ہو تیمّم کر لیتے ہیں۔

(۹) بعض کو دیکھا ہے کہ اگر وضوء و غسل میں کہیں پاؤں وغیرہ خشک رہ جاتا ہے ویسے ہی تر ہاتھ پھیر لیتے ہیں جو کہ مسح ہے، پانی ڈال کر نہیں دھوتے۔

(۱۰) بعض آدمی باوجود اندیشۂ قطرہ کے فوراً صرف پانی سے استنجا کر لیتے ہیں اور پھر قطرہ آجاتا ہے، اگر خبر بھی ہوگئی اور وضوء بھی دہرا لیا مگر پائجامہ پاک نہیں کرتے اور اس طرح کئی بار میں مقدار عفو سے بڑھ جاتا ہے اور اسی کپڑے سے نماز پڑھتے رہتے ہیں اور اگر علم نہ ہوا تو بے وضو ہی نماز پڑھی جاوے گی اور اگر شبہ ہو کہ بے خبری میں معذور ہے؟ جواب یہ ہے کہ معذور اس وقت ہے کہ جب نقضِ وضو کا احتمال غالب نہ ہو ورنہ اس احتمال کا انسداد واجب ہوگا اور جب قوی کا ضعف مشاہدہ ہو تو قطرہ کا قطع کرنا ضروری ہوگا اور تجربہ سے اس باب میں کلوخ سے بہتر کوئی چیز ثابت نہیں ہوئی۔

نااہل کو امام بنالینا

اسی طرح بہت جگہ امام ایسے ہیں کہ نماز لوگوں کی فاسد یا مکروہ ہوتی ہے، پھر بعض جگہ تو مقتدی ہی اس خرابی کا سبب ہوتے ہیں، یعنی امام تقرر کرنے کے وقت اس کی صلاحیت واہلیت کو نہیں دیکھتے بلکہ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ محلہ بھر میں جو شخص سب سے نکمّا ہوتا ہے اس کو ارزاں سمجھ کر امامت کے لئے تجویز کیا جاتا ہے، چاہے اس کو قرآن پڑھنا بھی نہ آتا ہو، خواہ اس کو مسائل بھی یاد نہ ہوں اور بعض جگہ مقتدیوں کا کچھ دخل ہی نہیں ہوتا خود ہی براہ تکبّر بعضے اہلِ وجاہت امام بن بیٹھتے ہیں اور قصبات میں جمعہ و عیدین کے اکثر ائمہ اسی شان کے ہیں اور اس خرابی کی ابتداء امامت کا موروث ہونا ہے جس کی بناء

بعض سلاطین کے وقت سے پڑی ہے اس وقت گو اس میں کوئی مصلحت ہو، مگر اب تو اس میں اس قدر مفاسد ہو گئے ہیں کہ اس کا توڑنا اور ایسے امام کو چھوڑنا واجب ہے، اگر اس کے معزول کرنے پر قدرت نہ ہو تو خود تو عزلت کرنا ممکن ہے۔
یعنی سب مل کر کسی دوسری جگہ جماعت کا انتظام کر لیں، اور کسی اہل کو امام تجویز کر لیں۔ البتہ جہاں امام سے ضرر رسانی کا اندیشہ ہو تو یہ بے چارے معذور ہوں گے، صبر کرنا چاہیئے، یہ تھے شعبے اس لاحق الذکر کوتاہی کے۔

علم دین، سب کا علاج

ان سب کا علاج ——— علم دین ہے، جو پڑھنے سے یا علماء کے پاس آنے جانے سے اور پوچھتے رہنے سے نہایت سہولت سے ممکن الحصول ہے۔
یہ تھا مختصر ضروری بیان ان کوتاہیوں کا جو کثیر الوقوع ہیں اور جن کا وقوع قلیل ہے ان کا ذکر مطوی (ختم) کیا گیا، اول بوجہ قلتِ وقوع کے دوسرے اس لئے کہ ان کا مذموم ہونا کسی پر مخفی نہیں، سو تنبیہہ کے لئے یہ علم ہی کافی ہے۔
(۱) جیسے شرم سے بے وضو نماز پڑھ لینا یا پڑھا دینا
(۲) وضو کر کے سو رہنا اور کسی کے جگانے کے بعد سب کو جھٹلا لینا کہ میں تو نہیں سویا تھا اور اسی طرح نماز پڑھ لینا۔
(۳) نماز میں اخلاص نہ ہونا، یعنی صرف اسی لئے نماز پڑھنا کہ لوگ مجھکو نمازی سمجھیں جس کو ریاء کہتے ہیں ونحو ذالک

وسوسہ، کفر نہیں!

گو یہ امور واقع ہوتے ہیں مگر کثرت نہیں ہے اور گو ریاء کثیر الوقوع ہے مگر استقراء سے معلوم ہوا کہ صرف نفل عبادات میں کثیر الوقوع ہے اور یہاں زیادہ بیان کرنا غیر نفل کا مقصود ہے اور نفل عبادات و ذکر وغیرہ میں بھی ریاء وہیں ہے جس جگہ

س کا قصد ہوا ور جو شخص اس کو برا سمجھے، دفع کرے، وہاں اس کا شبہ کرنا اور اس
نم میں مبتلا ہو جانا جیسے بعض سالکین کو پیش آتا ہے مضر ہے، جس خطرہ پر ان کو یہ گمان
ہو جاتا ہے، وہ وسوسہ ہے، ریاء نہیں ہے، سو وسوسہ پر مؤاخذہ نہیں، اس کی موٹی
ور تسلی بخش مثال یہ ہے کہ :-

بالاجماع وسوسہ کفر نہیں اور اس پر مؤاخذہ نہیں اسی طرح اس کو سمجھئے یہ نکتہ —
رچہ بہت چھوٹا ہے مگر نفع میں اگر اس کو علم عظیم کہا جاوے تو بجا ہے، والحمد للہ علی
اعلمنیہ وفہمنیہ اور کبھی بعض کوتاہیاں ہوتی ہیں جس کی عدم ذکر کی وجہ ذکر
کی گئی۔

روزے کے متعلق کوتاہیاں

(اصلاح معاملہ بہ صیام)

ارکانِ اسلام میں سے ایک "روزہ" رمضان شریف کا ہے جو مثل نماز کے عبادت بدنیہ ہے اس میں جو انقلاب ہوا ہے نماز کے بعد اس کا بیان بقدرِ ضرورت مع اصلاح ضروری معلوم ہوتا ہے اور بعض اعمال رمضان المبارک کے متعلق اور بھی ہیں روزے کے ساتھ ان کا بیان بھی مناسب ہے مجموعہ ان اعمال کا یہ ہے :

(۱) رویتِ ہلال (۲) صوم (۳) سحر (۴) افطار (۵) قیامِ رمضان یعنی تراویح اور دو عمل جو عید کے متعلق ہیں ان کو بھی اس کے ملحقات سے کہہ سکتے ہیں یعنی

(۱) صدقۂ فطر، (۲) نمازِ عید)

یہ کل سات ہوئے ان سب کے متعلق مختصر مختصر مضامین مذکور ہوتے ہیں

رویتِ ہلال

اس میں (جہاں اسلامی ریاست نہیں ہے) ایک بے احتیاطی عظیم ہوگئی ہے وہ یہ کہ قریب قریب ہر شخص گو وہ علمِ دین بھی نہ رکھتا ہو اس میں بلا مراجعت علماء کے اپنی تحقیق پر گو کہ

وہ کسی اصل شرعی پر مبنی نہ ہو اعتماد کرتا ہے، جس روایت کو چاہا قبول کر لیا، اگرچہ وہ قابل قبول نہ ہو اور جس کو چاہا رد کر دیا اگرچہ وہ قابل رد نہ ہو،

اور ظاہراً رمضان کے چاند کی نسبت قبول کرنے میں زیادہ احتیاط معلوم ہوتی ہے اور لوگوں کو اکثر یہی دھوکہ ہو جاتا ہے کہ روزہ ہی تو رکھواتے ہیں اس میں کیا برائی ہے، لیکن ایک بے احتیاطی تو فی الحال ہو جاتی ہے کہ بدون ثبوت رمضان نیت با اعتقاد رمضان یعنی بہ نیتِ فرض روزہ رکھا جاتا ہے اور غیر رمضان روزہ رکھنا ممنوع آیا ہے چنانچہ حدیث نہی عن صوم یوم الشک کا یہی حاصل ہے جس کی لم اور راز —— یہ ہے کہ حدود شرعیہ کی اس میں توہین اور ہتک لازم آتی ہے گویا شارع علیہ السلام کے نزدیک تو رمضان مثلاً ہفتہ کے دن سے شروع ہوگا، مگر اس شخص کے نزدیک جمعہ ہی سے شروع ہو گیا، حدود کی مزاحمت کے جرم ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟

ایک اور بے احتیاطی جو اس سے اشد ہے بعض اوقات فی المآل ہو جاتی ہے وہ یہ کہ مثلاً اسی بناء غیر صحیح پر روزہ شروع کیا اور ختم رمضان پر آفاق سے ابر وغیرہ ہوا تو یہ شخص اکمالِ ثلثین کے قاعدہ پر (یعنی تیس پورے کر کے) عید کرے گا اور ممکن ہے کہ وہ عین تیس تاریخ رمضان کی ہو تو کس قدر سخت بات ہے اور اس شخص کے اثر سے جتنوں نے عید کی اور ایک ایک فرض ان کا برباد ہوا سب کا وبال اس کی گردن پر رہا اور چونکہ اپنے نزدیک رمضان پورا کر چکے ہیں، اس لئے اس روز کی قضا بھی کوئی نہ کریگا تو سب کے ذمہ ایک ایک فرض چڑھا رہا اور اسی پر موت آگئی . . . !

پس جب ایسی بے احتیاطیاں اس قبول کرنے میں ہوئیں تو اس قبول کرنے کو احتیاط نہیں کہا جا سکتا اور بلا وجہ شرعی رد کرنے میں تو بے احتیاطی کا لزوم ظاہر ہے، فرض روزہ کا ضائع کرنا لازم آتا ہے اور یہی خود رائی بعض اوقات ہلال عیدین میں ہوتی ہے تو وہاں دونوں شقوں میں صریح خرابی ہے یعنی اگر قابل قبول کو رد کر دیا تو عید کا روزہ رکھوایا جو حرام ہے اور قابل رد کو قبول کر لیا تو رمضان کا روزہ تڑوایا جو اس سے بڑھ کر حرام ہے۔

تار برائے شہادت کیوں معتبر نہیں ؟

میں نے بے علموں کو دیکھا ہے کہ محض افواہی خبر سن کر قبول کر لیتے ہیں، ان کو یہ خبر نہیں کہ خبر کی حجت ہونے کی کیا شرائط ہیں ؟ کبھی کہیں سے تار آجانے پر اعتبار کر لیتے ہیں اور ان کو اس کے احکام فقیہہ کی اطلاع نہیں جو کہ مخصوص ہے علماء محققین و متقین کے ساتھ، بس بڑا مدار استدلال اس کے قبول پر ان کے نزدیک یہ ہے کہ صاحب لاکھوں روپے کی تجارت تار پر چلتی ہے پھر اس کے اعتبار نہ کرنے کا کیا سبب ... ؟

لیکن اگر ان سے کوئی پوچھے کہ گواہ کے پاس سمن آنے کے بعد اگر تار پر شہادت ادا کر دے تو قانوناً کیوں معتبر نہیں ؟ اور معاملات تجارت اور اس شہادت میں کیوں فرق ہے ؟ اور اس شہادت میں اور رویت ہلال کی شہادت میں کیا فرق ہے ؟ تو اس کا معقول جواب نہیں دے سکتے، اسی طرح میں نے بعض بے علموں کو محض اس بنار پر شہادت کو رد کرتے ہوئے دیکھا ہے کہ شہادت ادا کرنے والا گنوار ہے کوئی معزز آدمی نہیں، اگرچہ وہ گنوار دین میں ان معززین سے ہزار درجہ افضل ہو مگر ان کے نزدیک وہ آدمی بھی نہیں ! پھر اسی قسم کے لوگوں کو یہاں تک تنزل کرتے ہوئے دیکھا ہے کہ کہتے ہیں میرے چماروں نے دیکھا ہے، ہمارے محلے کے فلاں فلاں (نابالغ) بچے نے دیکھا ہے، پس یا تو آن شور اشوری یا باتیں بے تمیزی اور اس تمام تر خرابی کا منشار صرف یہی ایک امر ہے کہ علمار سے اپنے کو مستغنی سمجھتے ہیں بلکہ افسوس ہے کہ بعض اوقات ان کا فتویٰ سُن کر ان سے مزاحمت کرتے ہیں اور اس میں جرح نکالتے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون .... !!

طریق علاج

سو اس کی اصلاح یہ ہے کہ ہر شخص اس میں دخل نہ دیا کرے، دوسرے کی رویت پر حکم لگانا تو بڑی بات ہے مصلحت یہ ہے کہ خود اپنی رویت یعنی دیکھنے کو بھی ہر ایک کے روبرو

رویت ہلال کے موضوع پر دیکھئے حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کا رسالہ "رویت ہلال" ۱۲

بیان کرتا نہ پھرے کہ اور لوگ حکم لگاویں گے، البتہ حاضرین مجلس رویت یا عقلاء کے روبرو ظاہر کرنا مضائقہ نہیں، بلکہ سب خبروں اور مشاہدات کو جمع کر کے کوئی عالم معتبر متدین قریب ہوں تو ان کے پاس جا کر اور اگر فاصلہ سے ہوں اور خود نہ جا سکے تو دو تین عاقل دین دار آدمیوں کو ان کی خدمت میں حاضر کر اکے پوری صورت حال واقعہ کی عرض کر کے وہ جو فتویٰ دیں اس پر عمل کریں اور اگر اس فتوے میں کوئی شبہ خیال میں آوے تو عوام کے روبرو اس کو ظاہر نہ کریں کہ انتظام دین میں خلل پڑے گا بلکہ بواسطہ یا بلاواسطہ اس کو بھی ان ہی عالم سے یا اور کوئی صحبت یافتہ علماء کا قریب ہو اس سے پیش کر کے حل کرے۔

علماء کو مشورہ

بلکہ میں تو بروئے تجربۂ واقعات یہاں تک ضروری سمجھتا ہوں کہ جس جگہ متعدد علماء ہوں وہاں ایک عالم بھی بدون مشورہ دوسرے علماء کے اس باب میں اپنی تحقیق و رائے عوام کے روبرو ظاہر نہ کرے، کیونکہ ممکن ہے کہ دوسرے عالم کی رائے میں کچھ اختلاف ہو اور اقوالِ مختلفہ کے شیوع سے عوام میں تشویش پھیل جائے بلکہ سب مشورہ کر کے اور اگر اختلاف ہو تو باہم طے کر کے ایک قول منقح کر کے وہی قول منقح عوام تک پہنچے اور جس عالم سے استفسار کیا جائے ایک ہی جواب سب جگہ سے ملے اور اگر رائے میں اتفاق نہ ہو تو جو شخص زیادہ مرجع خلائق و کبیر ہو فتویٰ اس کے سپرد کر دیں، باقی سکوت کریں، اگر ان سے کوئی پوچھے تو اسی مرجع موصوف کی طرف حوالہ کریں، خود خاموش رہیں اس میں انشاء اللہ کبھی بدنظمی نہیں ہو سکتی،

میں نے تو ایسی تشویشات کو دیکھ کر ایک مقام پر یہ انتظام کیا تھا کہ سب علماء کو متفق کر کے خاص ایک عالم کو اس باب خاص میں محط خبر و مدار حکم ٹھہرا لیا کہ جو خبر ہلال سے متعلق جس عالم کے پاس آوے، وہ ان کی خدمت میں پہنچائی جاوے اور جو شخص جس سے فتویٰ پوچھنے آوے وہ سائل کو ان ہی کے پاس بھیج دے اور جس کو کوئی اختلاف کرنا ہو انہیں سے ظاہر کرے، غرض عوام کو اختلاف کی اطلاع نہ ہو اور حکم حاصل کرنے میں ان کو تشویش نہ ہو اور اس قرار داد کے بعد عام لوگوں میں اس کا اشتہار دے دیا گیا

پس سب خلجانوں سے نجات ہو گئی تھی اگر سب جگہ ایسا انتظام کر لیا جاوے تو اقرب الی الاتفاق وابعد من الافتراق ہے۔

ضروری احتیاط

اور ایک انتظام یہ ضروری ہے کہ چاند دیکھنے پر یا اس کی خبر سننے پر بلا ضرورت دوسرے مقامات پر تار نہ دوڑایا کریں، بلکہ کسی عامی کے پوچھنے پر بھی جواب نہ دیا کریں کہ دوسری جگہ عوام کی ہاتھ میں ایسی خبریں پہنچ جانے کے بعد چونکہ اس وقت خود رائی کا غلبہ ہے ضرور مفاسد پیش آتے ہیں کہ ان کا انسداد تدابیر سے باہر ہے، اور شرعاً کوئی ضروری امر ہے نہیں کہ از خود دوسری جگہ خبر بھیجا کرو،

البتہ کوئی عالم دریافت کرے تو جواب دے دو، پھر وہ خود ہی حکم شرعی کے موافق عمل کریں گے اور کسی مفسدہ کا احتمال نہ ہوگا اور جب ایسے استدلالات کہ کسی درجہ میں صلاحیت استدلال ہونے کی رکھتے ہیں، بدون حکم علماء کے قابلِ اطمینان نہیں، تو جو استدلال اپنی ذات میں بھی صلاحیت استدلال ہونے کی نہیں رکھتے ان سے دلیل پکڑنا تو کس قدر مذموم اور اختراع فی الدین ہوگا۔

مثلاً رجب کی چوتھی کا لامحالہ غرہ رمضان کے موافق ہونا چاند کا بڑا ہونا یا دیر تک ٹھہرنا اونچا ہونا یا بدر کامل ہونا بیٹھ کر اٹھنا دو شب تک غائب رہنا، فلاں جنتری میں ۲۹ یا ۳۰ کا لکھا رہنا ومثل ذالک یہ سب شرع میں غیر معتبر ہیں۔

اور یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ اکثر ایسے امور حسابی اور مطابق واقع کے ہیں تو شرع نے امور واقعیہ کی نفی کیسے کی اس میں تو اس کی طرف نسبت کذب کی لازم آتی ہے؟ وجہ اس شبہ کے وارد نہ ہونے کی یہ ہے کہ شرع نے ان امور کے وقوع کی نفی نہیں کی کہ یہ محذور لازم آئے بلکہ ان امور کے اعتبار کی نفی کی ہے یعنی ہم ان امور کے وقوع پر اپنے احکام کا مدار نہیں رکھتے تو یہ حق ہر صاحب قانون کو حاصل ہے۔

مثلاً کوئی نوکری مشروط ہو بی اے کے ساتھ تو وہ انٹرینس والے کو نہ ملے گی تو اس کے یہ

معنی نہیں کہ اس شخص کے انٹرینس ہونے کی نفی کی گئی ہے بلکہ معنی یہ ہیں کہ انٹرینس ہونا معتبر اور مدار استحقاق نوکری کا اس موقع پر نہیں ہے تو اگر غرۂ شرعی غرۂ حسابی نہ ہو تو اس کو یکم کہنے کے یہ معنی نہیں کہ وہ واقع میں یکم ہے بلکہ معنیٰ یہ ہیں کہ خواہ وہ واقع میں کسی دوسرے حساب سے دوم ہو مگر بروئے قواعد فلاں فلاں روزہ اسی سے شروع کرنے کا حکم دیا جاتا ہے اور روزہ شروع کرنے کی تاریخ کو ہماری اصطلاح میں یکم کہا جاوے گا اور لغت و اصطلاح کا تطابق ضروری نہیں۔

جیسا اہل حساب تاریخ کو طلوع سے شروع کرتے ہیں اور اس کو کوئی محل اعتراض نہیں سمجھتا۔ یہاں تک رویت ہلال کے متعلق کلام ہو چکا۔

صوم

روزہ میں تفریط کرنے والوں کا ذکر

اس میں چند کوتاہیاں کی جاتی ہیں:

(۱) ایک یہ کہ بعض تو بلا کسی وجہ قوی یا ضعیف کے روزہ نہیں رکھتے، میں نے ایک شخص کو دیکھا تھا جس نے عمر بھر کبھی روزہ نہیں رکھا تھا، پھر ان میں بعض تو کم ہمت ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ہم سے روزہ پورا نہ ہو سکے گا، چنانچہ وہ شخص اسی بلا میں مبتلا تھا۔ میں نے کہا کہ تم بطور امتحان ہی رکھ کر دیکھو، چنانچہ رکھا اور پورا ہو گیا اور پھر اس کی ہمت بندھ گئی اور رکھنے لگا۔

کیسے افسوس کی بات ہے؟ کہ رکھکر بھی نہ دیکھا تھا اور پختہ یقین کر بیٹھا تھا کہ کبھی رکھا ہی نہ جاوے گا ..... !!

یہ لوگ سوچ کر دیکھیں کہ اگر طبیب کہہ دے کہ آج دن بھر نہ کچھ کھاؤ نہ کچھ پیو، ورنہ فلاں مرض مہلک پڑ جاوے گا، تو اس نے تو ایک ہی دن کے لئے کہا ہے یہ شخص دو دن نہ کھاوے گا کہ احتیاط اسی میں ہے، افسوس ہے کہ خدا تعالیٰ دن، دن کا کھانا، پینا چھڑا دیں

اور کھانے پینے سے عذابِ مہلک کے وعید فرماویں اور قولِ طبیب کے برابر بھی اس کی وقعت نہ ہوا ناللہ وانا الیہ راجعون ..... !!

(۲) اور بعض ان سے بھی بدتر بدعقیدت ہیں کہ روزہ کی ضرورت ہی میں ان کو کلام ہے، پھر بعضے تو ان میں مہذب ہیں، کہتے ہیں کہ روزہ جس غرض سے مشروع ہوا تھا کہ قوتِ بہیمیہ منکسر ہو جاوے، وہ غرض ہم کو بدولت علم و تہذیب کے حاصل ہے، اس لئے اب روزہ کی ضرورت نہیں،

ان کا جواب یہ ہے کہ اول تو تم کو اس غرض کا حاصل ہونا مشاہدہ کے خلاف ہے، قوتِ بہیمیہ کے آثار فخر و تعلی و ظلم و قساوت جس قدر تم میں ہیں دوسروں میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں، دوسرے اگر غرض حاصل بھی ہو جاوے تب بھی یہ مسلّم نہیں کہ روزہ بس اسی غرض کے لئے مشروع ہے، بلکہ خود اس کی صورتِ نوعیہ بھی مطلوب ہے، تفصیل اس جواب کی نماز کے مضمون میں بیان ہو چکی وہاں ملاحظہ فرمائیے۔

روزہ وہ رکھے جس کے گھر میں اناج نہ ہو!

(۳) اور بعضے تہذیب سے بھی گذر کر گستاخی اور تمسخر کے کلمات کہتے ہیں۔ مثلاً روزہ وہ رکھے جس کے گھر میں اناج نہ ہو، یا یہ کہ بھائی ہم سے بھوکا نہیں مرا جاتا، یا ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ صاحب کو علانیہ رمضان میں کھاتے ہوئے جو ایک دیندار نے ٹوکا کہ رمضان میں دن کو کھاتے ہو؟ تو وہ فرماتے ہیں کہ "رمضان" کیا چیز؟ اس دیندار نے کہا کہ صاحب رمضان مہینہ ہوتا ہے تو کہتے ہیں کہ جنوری، فروری، الخ اس میں رمضان تو کہیں نہیں آیا۔ اور امثال ان اقوال کے !!

سو یہ دونوں فریق بوجہ انکارِ فرضیتِ روزہ کے زمرۂ کفار میں داخل ہیں اور پہلے فریق کا قول محض ایمان شکن ہے اور دوسرے کا ایمان شکن بھی اور دل شکن بھی۔ اور فریقِ اول اس تاویل سے کفر سے نہیں بچ سکتا، کیونکہ یہ تاویل ہے ضروریاتِ دین میں اور ایسی تاویل دافعِ کفر نہیں ہوتی کما تقرر فی محلہٖ اور یہ مہذب فریق ظاہراً اس غیر مہذب سے

اہون ہے مگر عند التامل ضرر میں اس سے اشد ہے، کیونکہ غیر مہذب عنوان خود اپنے بطلان پر دلیل ہے اور مہذب عنوان میں تلبیس زیادہ محتمل ہے اور جس طرح بد عقیدت لوگوں میں دو فریق ہیں مہذب اور غیر مہذب جیسا ابھی بیان ہوا، اسی طرح کم ہمت لوگوں میں بھی دو فریق ہیں۔ ایک مہذب جو باوجود روزہ نہ رکھنے کے علانیہ نہیں کھاتے پیتے، بلکہ اپنے اس عیب کا اخفاء کرتے ہیں اور ظاہر ہونے پر شرماتے ہیں۔

دوسرے غیر مہذب جو ذرا شرم نہیں کرتے علانیہ کھاتے پیتے ہیں اور روکنے پر کہتے ہیں کہ جب خدا کی چوری نہیں تو بندہ کی کیا چوری؟ حالانکہ یہ مضمون محض تلبیس ہے کیونکہ خدا تعالیٰ سے تو کسی معصیت کا اخفاء ہو ہی نہیں سکتا، اور خلق سے اخفاء ہو سکتا ہے، تو ممکن کا قیاس محال پر یہ خود سفسطہ[1] ہے دوسرے مخلوق سے معصیت کے اخفاء کا خود خدا تعالیٰ نے حکم دیا ہے تو اس کے ترک سے اور بھی معصیت اشد ہو جاتی ہے تو بلا وجہ اشد میں کیوں مبتلا ہو۔

روزہ افطار کرنے کے لئے ادنیٰ بہانہ!

(۲) بعض بلا عذر تو روزہ ترک نہیں کرتے مگر اس کی تمیز نہیں کرتے کہ یہ عذر قوی اور شرعاً معتبر ہے یا نہیں ادنیٰ بہانہ سے روزہ افطار کر دیتے ہیں خواہ ابتداء ہی سے نہیں رکھتے، یا رکھکر توڑ ڈالتے ہیں، ذرا پیاس لگی روزہ افطار کر دیا خواہ ایک ہی منزل کا سفر ہوا روزہ افطار کر دیا۔ کچھ محنت مزدوری کا کام ہوا اور روزہ افطار کر دیا اور ایک طرح سے تو یہ لوگ بلا عذر روزہ توڑنے والوں سے بھی زیادہ قابل مذمت ہیں وہ یہ کہ بلا عذر نہ رکھنے والے خود بھی اپنے کو صاحب عذر نہیں سمجھتے، اپنے کو فعل قبیح کا مرتکب سمجھتے ہیں اور یہ لوگ اپنے کو معذور جان کر بےگناہ سمجھتے ہیں، حالانکہ شرعاً وہ معذور نہیں، اس لئے گناہ گار ہوں گے، ان لوگوں کو چاہیئے کہ ایسے لوگوں پر نظر کریں جو سخت سے سخت حالت میں بھی روزہ نہیں چھوڑتے۔

---

[1] قیاس سفسطی:۔ وہ قیاس ہے جو ایسے مقدمات سے مرکب ہو جو محض وہمی اور جھوٹے ہوں جیسے ہر موجود شئے اشارہ کے قابل ہے اور جو اشارہ کے قابل ہے جسم والا ہے پس ہر موجود جسم والا ہے یا جیسے گھوڑے کی تصویر کی نسبت کہیں یہ گھوڑا ہے۔ اور ہر گھوڑا ہنہنانے والا ہے پس یہ ہنہنانے والا ہے ۱۲ عبدالرؤف

عادت وعزم سے مشکل سے مشکل کام بھی آسان ہو جاتا ہے

میں نے ریلوے کے ایک ڈرائیور کو دیکھا ہے کہ ہر وقت انجن میں رہتا تھا اور سخت گرمی کی فصل تھی اور روزے رکھتا تھا، بہت سے کھیتی کاٹنے والے دیکھے گئے ہیں کہ جیٹھ بیساکھ کے دنوں میں دھوپ میں بیٹھکر کھیتی کاٹتے ہیں اور روزے رکھتے ہیں، تجربے سے معلوم ہوا ہے کہ قدرے عادت اور زیادہ ہمت یعنی پختہ ارادہ ان دونوں کے جمع ہونے سے مشکل سے مشکل کام بھی سہل ہو جاتا ہے۔ اور ذوق وجدان سے کام لیا جاوے تو روزہ میں تسہیل وتائید خداوندی کا کھلی آنکھوں مشاہدہ ہوتا ہے، پھر اس پر بھی ہمت توڑ دینا اور بہانہ ڈھونڈنا سخت محرومی ہے!

عذرِ اختیاری کا حکم

(۵) بعضے لوگ عذر کی حد کو تو سمجھتے ہیں لیکن عذر اپنے اختیار سے قصداً پیدا کر لیتے ہیں مثلاً شرعی سفر واقع میں عذر ہے مگر اس شخص کو درحقیقت سفر کی ضرورت نہیں تھی، صرف اس نیت سے بلا ضرورت سفر کیا ہے کہ روزہ نہ رکھنا پڑے، رہا قضاء تو وہ چونکہ شرعاً موسع ہے اس لئے اس کے واسطے خاص فروری کو انتخاب کر لیا جاتا ہے،

نہایت افسوس کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ تھوڑے دنوں سے ایک نئے اجتہاد کی بدولت قضاء کے عوض فدیہ کے کافی ہونے کے اعتقاد سے نفع اٹھایا جا رہا ہے، جس پر میں نے مجمل کلام اپنے بعض[1] رسائل میں بزبان اردو اور اسی رسالہ کے حاشیۂ ملحقہ بالاخیر میں بعبارت عربیہ کیا ہے۔

خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ اس باب میں نہ رائے محض معتبر ہے، اور نہ کسی آیت یا حدیث کے ظاہری مفہوم پر غیر مجتہد کو عمل درست ہے اور نہ عامی کو محض مطالعہ فقہ کا کافی ہے، بعد انقراض زمانہ اجتہاد کے عالم کو کتب فقہیہ کا اتباع، اور عامی کو علماء سے استفسار

[1] اصلاح ترجمہ دہلویہ پوری تفصیل

کر کے عمل کرنا واجب ہے، اور یہی معیار ہے عذر کے معتبر ہونے یا نہ ہونے کا، بے علمی میں بعض اوقات قصد ہوتا ہے قرآن وحدیث وفقہ کے اتباع کا اور لازم آجاتا ہے اتباع اپنی رائے اور ہویٰ کا، کیا یہ بات ظاہر نہیں ہے؟ کہ جو شخص طبیب نہ ہو وہ اگر کتاب دیکھ کر کسی مریض کے لئے نسخہ لکھدے تو کچھ تعجب نہیں کہ وہ نسخہ قواعدِ طب کے بھی خلاف ہو، اور جس جگہ اتباع کتاب وسنت وفقہ کا قصد بھی نہ ہو اس کا ذکر ہی کیا۔

ایک اور کوتاہی

(۶) بعضے لوگوں کا افطار تو عذرِ شرعی سے ہوتا ہے مگران سے یہ کوتاہی ہوتی ہے کہ بعض اوقات اس عذر کے دفع ہونے کے وقت کسی قدر دن باقی ہوتا ہے اور شرعاً بقیہ دن میں امساک یعنی کھانے پینے سے بند رہنا واجب ہوتا ہے، مگر وہ اس کی پرواہ نہیں کرتے مثلاً سفر شرعی سے ظہر کے وقت واپس آگیا، یا عورت حیض سے ظہر کے وقت پاک ہوگئی تو ان کو شام تک کھانا پینا نہ چاہیئے علاج اس کوتاہی کا ــــ مسائل و احکام کی تعلیم و تعلّم ہے۔

بچوں کو روزہ نہ رکھوانے میں غفلت

(۷) بعض لوگ خود تو روزہ رکھتے ہیں لیکن بچوں سے (باوجود ان کے روزہ رکھنے کے قابل ہونے کے) روزہ رکھوانے کی پرواہ نہیں کرتے بلکہ بعض ان کے نابالغ ہونے کو دلیل بنا کر اپنی رائے و عمل کو صواب سمجھتے ہیں اور روزہ رکھوانے کو سختی سمجھتے ہیں، خوب سمجھ لیا جاوے کہ عدمِ بلوغ سے ان بچوں پر واجب نہ ہونا تو لازم آتا ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کے اولیاء پر بھی ان سے روزہ رکھوانا واجب نہ ہو، جس طرح نماز کے لئے باوجود عدمِ بلوغ کے ان کو تاکید کرنا، بلکہ مارنا ضروری ہے، اسی طرح روزہ کے لئے بھی اتنا فرق ہے کہ نماز میں عمر کی قید ہے اور روزہ میں تحمل پر مدار ہے۔ (یعنی جب روزہ کی تکلیف کو برداشت کرنے کی قابلیت و طاقت آجائے رکھوانا واجب ہے) اور اس میں راز یہ ہے کہ کسی کام کا دفعتہً پابند ہونا دشوار ہوتا ہے، تو اگر بالغ ہونے

کے بعد ہی تمام احکام شروع ہوں تو اس پر ایک بار گراں پڑ جاوے گا، اس لئے شریعت کی رحمت ہے کہ پہلے ہی سے شدہ شدہ سب اعمال کا خوگر بنانے کا قانون مقرر کیا، تاکہ مکلف ہونے کے وقت دشواری نہ ہو، پس اس قانون کی تنفیذ سرپرستوں کے ذمہ مقرر کی گئی، سو اگر سرپرستوں پر یہ واجب نہ ہو تو اس قانون کا کوئی فائدہ ہی نہ ہوگا، کیونکہ واجب نہ ہونے کی صورت میں ان کو ترک بھی جائز ہوگا، تو اگر اس جائز سے یہ منتفع ہوئے تو بلوغ کے بعد اس نئے نئے مکلف کو اسی مصیبت کا سامنا ہوگا، تو قانون کا عدم وجود برابر ہوا تو لامحالہ اولیاء پر اس کا وجوب ہوگا، تو ان لوگوں کی دو غلطیاں ہیں، ایک اس کو ضروری نہ سمجھنا،

دوسرے اس ضروری کو سختی سمجھنا جس میں شرع پر دھبہ لگتا ہے، کیونکہ نصوص میں بتلایا گیا ہے کہ شرع میں سختی نہیں ہے، قال اللہ تعالیٰ یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر ہ (اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی کرنا چاہتا ہے، مشکل پیدا کرنا نہیں چاہتا) اور وما جعل علیکم فی الدین من حرج (تمہارے لئے اللہ نے دین میں تنگی نہیں کی)، وفی الحدیث الدین یسر (دین آسان ہے)

اور اس سے یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ نومسلم بالغ تو دفعۃً جمیع احکام کا مکلف ہو جاتا ہے، کیونکہ شرع نے تو اس کے لئے بھی وہی قانونِ تسہیل مقرر کیا تھا، مگر یہ خود اس کی اور اس کے خاندان والوں کی غلطی ہے کہ اسلام میں دیر لگانے سے وہ سہولت ضائع کر دی، اسی لئے مراہق قبل بلوغ جبکہ وہ عاقل ہو ایک درجہ میں مخاطب بالایمان ہے جیسا اصولیون نے تصریح کی ہے۔

پس مخاطب ہونے کے بعد توقف کرنا اپنے ہاتھوں سے اس سہولت میں کمی کرنا ہے اور کمی اس لئے کہا کہ دفعۃً واحدۃً بھی جمیع احکام کا بجا لانا بوجہ اس کے کہ وہ احکام قلیل اور فی نفسہٖ سہل ہیں چنداں دشوار نہیں، لیکن شرع نے اور زیادہ سہولت کر دی تھی اور جس طرح یہاں تک روزہ میں تفریط کرنے والوں کا ذکر تھا۔

روزہ میں افراط کرنے والوں کا بیان

اسی طرح بعض لوگ اس میں افراط کرنے والے بھی پائے جاتے ہیں۔ اور ظاہر میں تو یہ لوگ اقرب الی الدین ہیں، لیکن چونکہ شریعت میں افراط بھی پسند نہیں اس لئے ان کی حالت کو بھی دین کے موافق نہ کہا جاوے گا مثلاً

بعضے لوگ سفر یا مرض میں جان کو آجاتے ہیں مگر دینداری جتلانے کو یا افطار پر صوم کی ترجیح دینے کو افطار نہیں کرتے اور یہ...... سخت غلطی ہے اگر اول نیت ہے تو بہت ہی برا ہے اور اگر ثانی ہے تو اس لئے جہل ہے کہ صوم کو مطلقاً افطار پر ترجیح نہیں ہے بلکہ ایسی شدت کی حالت میں امر بالعکس ہے۔ ورنہ حدیث لیس من البر الصیام فی السفر (سفر میں روزہ رکھنا، نیکی نہیں ہے) کے کوئی معنی نہ ہوں گے بلکہ یہ جہل بوجہ اس کے کہ اس کا اثر عقیدہ تک پہونچتا ہے اول سے بھی اشد ہے کیونکہ علمی غلطی عملی غلطی سے اقبح و اشنع ہے اور عقیدہ تک اثر اس طرح ہے کہ شرع نے جس کو راجح قرار دیا یہ شخص اس کو مرجوح سمجھتا ہے اور جس کو مرجوح قرار دیا اس کو راجح اعتقاد کر رہا ہے اور رخصت شرعیہ میں اس کا دل تنگ ہے تو گویا اس کو ناقص سمجھتا ہے اور شرع کی طرف تجویز نقص کو نسبت کرنا کتنا برا عقیدہ ہے۔ حدیث اولئک العصاۃ (یہ لوگ نافرمان ہیں) اور حدیث ما بال اقوام یتنزہون الخ ایسے ہی موقع میں ہے۔

یہ ہی حکم ہے ان عورتوں کا کہ باوجود تیقن اس امر کے کہ روزہ رکھنا دودھ پینے والے بچے کو ضرر کرے گا۔ اپنی ہٹ دھرمی اور سکڑی سے باز نہیں آتیں بلکہ ان کی حالت پہلے شخص سے بھی زیادہ منکر ہے کیونکہ اس نے تو صرف اپنا ہی نقصان کیا تھا۔ اس نے ایک بے گناہ بچہ کو بھی ضرر پہنچایا سو کسی کو ضرر پہنچانا پھر وہ بھی بچہ یہ حقوق العباد کی کس درجہ کی فرد ہے۔

اور ان سب صورتوں سے بڑھ کر افراط یہ ہے کہ بعضوں کو بہت چھوٹے کم سمجھ ناتواں بچہ کو روزہ رکھانے کا شوق ہوتا ہے کچھ تو خود اس روزہ رکھانے کا فخر ہوتا ہے اور کچھ روزہ کشائی میں حوصلہ نکالنے کا ارمان ہوتا ہے سو اول تو مبنی ہی اس کا فاسد ہے پھر

لا یکلف اللّٰہ نفساً الا وسعہا ط البقرۃ [۲۸۵-۲۸۶] واللہ تکلیف نہیں دیتا کسی کو مگر جس قدر اس کی گنجائش ہوتی ہے) کی مخالفت پھر اس پر بعض عوارض ایسے مرتب ہو جاتے ہیں کہ معصیت میں تضاعف ہو جاتا ہے۔

حسرت ناک ماجرا

مجھکو ایک جگہ کا قصہ معلوم ہے کہ اسی طرح کے ایک بچہ کو روزہ رکھوایا اور اپنی امارت اچھالنے کے لئے روزہ کشائی کا بہت زیادہ اہتمام کیا گرمی کے بڑے اور کڑے دن، عصر کے وقت تک جوں توں کر کے اس نے کھینچا آخر طاقت طاق ہو گئی اور صبر و توان نے جواب دیدیا ٹھنڈے پانی کے مٹکے بھرے رکھے تھے ان پر تر کپڑا لپٹا تھا برف گھولنے کا سامان ہو رہا تھا اس سارے سامان نے آگ بھڑکا دی ایک ایک سے خوشامد پانی کے لئے کرتا تھا، لیکن اگر پانی دیتے تھے تو روزہ کشائی کا سامان اکارت جاتا ہے اپنا سامان بچانے کے لئے پانی کو جواب دیدیا آخر سخت بیتاب ہو کر دوڑ کر ایک مٹکے کو جا لپٹا اور محبوب سے وصل ہوتے ہی روح نے قالب کو چھوڑ دیا۔ اس کی نعش زبانِ حال سے سراپاں تھی کہ:

"لو بھئی! تم کو تمہارا سامان مبارک ہے ہم اپنی جان تمہارے سامان پر فدا کرتے ہیں"

کس قدر حسرتناک ماجرا ہے، یہ نتیجہ ہے غلو اور افراط کا آخر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بے معنی تو نہیں؟ لا تغلوا فی دینکم (تم دین میں غلو نہ کرو) کیا اس ہلاک اور قتل کی نسبت کو تسببًا سہی ان ظالموں کی طرف نہ ہو گی .... ؟؟

غرض تفریط اور افراط دونوں مذموم ہیں، شرع نے دونوں سے روکا ہے اور ان حدود کا علم بدون صحبت و استفسار و صحبتِ علماء کے نہیں ہوتا، پس ان سب کا علاج یہی ہے۔

روزہ محض نام کا

(۸) بعض لوگ نفس روزہ میں تو افراط و تفریط نہیں کرتے لیکن روزہ محض صورت کا نام سمجھ کر صبح سے شام تک اجوفین یعنی فم و فرج کو بند رکھنے پر اکتفاء کرتے ہیں۔ اور اس میں علاوہ مقصود بہ صورتِ نوعیہ کے کہ وہ بھی ثابت ہے اور حکمتیں موجود ہیں جن کی طرف قرآن مجید میں اشارہ بلکہ صراحت ہے لعلکم تتقون یعنی شاید تم متقی ہو جاؤ۔ ان سب کو نظر انداز کر کے اپنے صوم کو جسدِ بلا روح بنا لیتے ہیں، خلاصہ ان حکمتوں کا معاصی و منہیات سے بچنا ہے، سو ظاہر ہے کہ اکثر لوگ روزہ میں بھی اکثر معاصی سے نہیں بچتے، جو حالت ان کی معصیت میں قبل رمضان ہوتی ہے رمضان کے آنے سے اس میں کچھ تفاوت نہیں ہوتا۔

اگر غیبت کی عادت تھی وہ بدستور رہتی ہے، اگر نگاہِ بد کے خوگر تھے، وہ نہیں چھوڑتے، اگر حقوق العباد میں مبتلا تھے ان کی صفائی نہیں کی، بلکہ بعض کے معاصی تو تو غالباً بڑھ جاتے ہیں کیونکہ پہلے تو کسی کاروبار میں لگے رہتے تھے اب روزہ میں چلنے پھرنے محنت مشقت کا کام تو ہوتا نہیں دوستوں میں جا بیٹھے کہ روزہ بہلیگا۔ پھر دوستوں میں کوئی شغل تفریح کا بھی ضروری ہے یا تو باتیں شروع کر دیں جن میں زیادہ حصہ غیبت کا ہوگا اور چوسر گنجفہ، تاش یا ہارمونیم یا باجا یا گراموفون لے بیٹھے اور دن پورا کر دیا۔ بھلا اس روزہ کا کوئی معتد بہ حاصل کیا؟ اتنی بات عقل سے سمجھ میں نہیں آتی کہ کھانا پینا جو کہ فی نفسہ مباح ہے، جب روزہ میں وہ حرام ہو گیا تو غیبت اور دوسرے معاصی فی نفسہ بھی حرام ہیں وہ روزہ میں کس قدر حرام ہوں گے!!

تو مباحِ اصلی سے بچنا اور غیر مباح میں مبتلا ہونا یہ روزہ کس قسم کا ہے؟ حدیث میں ہے کہ جو شخص بدگفتاری اور بدکرداری نہ چھوڑے خدا تعالیٰ کو اس کی کچھ پروا نہیں کہ وہ شخص اپنا کھانا پینا چھوڑ دے، اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ بالکل روزہ ہی نہ ہوگا، کبھی یہ سمجھ کر کہ جب روزہ نہ ہوگا تو پھر رکھنے سے کیا فائدہ؟ سو روزہ تو ہو جاوے گا مگر نہایت ادنیٰ درجہ کا، جیسا اندھا، لنگڑا، کانا، گنجا، اپاہج آدمی ہوتا ہے، مگر ناقص درجہ

کا اور بالکل روزہ نہ رکھنا تو اس سے بھی اشد ہے، کیوں کہ ذات کا سلب صفت کے سلب سے سخت تر ہے۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ جب غیبت چونکہ مباح فی نفسہٖ نہیں لہٰذا زیادہ شدید ہے اور اکل وشرب چونکہ فی نفسہٖ مباح ہیں وہ اس سے خفیف ہیں پس غیبت سے روزہ افطار نہ ہونا خورد ونوش سے افطار ہو جانا کیا معنی ...؟

جواب یہ ہے کہ روزہ جن خصوصیات کے لئے مشروع کیا گیا ہے، ان کے اعتبار سے اس کی ایک خاص ماہیتِ مشخصہ ہے، یعنی امساک عن المفطرات بالنیہ (نیت کر کے افطار کرنے والی چیزوں سے رکنا) سو اکل وشرب وغیرہ گو اہون ہوں مگر اس ماہیت کے منافی ہیں اور دوسری معاصی گو اغلظ ہوں مگر اس ماہیت کے منافی نہیں، گو اس ماہیت کی اغراض کے منافی ہوں، سو غایت مافی الباب ان معاصی سے وہ اغراض فوت ہو جاویں گے، سو اس کو ہم بھی مانتے ہیں، چنانچہ اوپر کہا گیا ہے کہ بھلا اس روزہ کا کوئی معتد حاصل؟ اور اصل حقیقت صوم کے متعلق ہو جانے سے یہ اثر ہو گا کہ قیامت میں بازپرس نہ ہو گی کہ روزہ کیوں نہیں رکھا؟ بلکہ پوچھا جاوے گا کہ روزہ کو خراب کیوں کیا؟ سو بڑا فرق ہے! اس میں کہ حاکم کے حکم کے بعد سالانہ کاغذ ہی نہ بنایا اور اس میں کہ بنایا مگر کہیں کہیں غلطیاں رہ گئیں، اور یہ جو کہا گیا کہ ایسے روزہ سے معتد بہ فائدہ نہیں، یہ قید اس لئے لگائی کہ بالکل بے سود بھی نہیں اور وہ فائدہ ایک تو ظاہر ہے کہ کسی قدر تو تعمیلِ ارشاد ہے اور دوسرے ہر عمل میں ایک خاص برکت ہے، جب صبح سے شام تک لذاتِ مخصوصہ سے نفس کو روکا تو اس سے نفس ضرور منفعل ومنصبغ (اثر قبول کنندہ ورنگ پذیرندہ) ہو گیا۔ جس کا اثر یا تو آئندہ ظاہر ہو کہ کسی معصیت سے رکنے کی توفیق ہو جائے یا اسی روز یہ اثر ہوا ہو کہ اگر یہ صورتِ صوم بھی نہ ہوتی تو کوئی خاص معصیت سرزد ہوتی اور روزہ کی برکت سے سرزد نہ ہوئی ہو، تو اس وجہ سے بالکل بے سود اور لاحاصل نہیں کہہ سکتے اور تدبیر

ان معاصی سے بچنے کی تین امر کا مجموعہ ہے۔

* ــــ خلق سے بلا ضرورت تنہا اور یکسو رہنا،
* ــــ کسی اچھے شغل میں لگے رہنا مثل تلاوت قرآن مجید وغیرہ،
* ــــ نفس کو سمجھانا اور وقتاً فوقتاً دھیان کرتے رہنا کہ ذرا سی لذت کے واسطے صبح و شام تک کی مشقت کو کیوں ضائع کیا؟ اور تجربہ سے معلوم ہوا کہ نفس پھسلانے سے بہت کام کرتا ہے، سو نفس کو یوں پھسلا دے کہ

ایک مہینہ کے لیئے تو اس دستور العمل کی مجموعہ تین امورِ مذکورہ کا یہ پابندی کرے پھر دیکھا جاوے گا، یہ ایک مہینہ تو وہ پھسلانے میں آکر مرضی کے موافق کرلے گا پھر یہ بھی تجربہ ہے کہ جس طرز پر آدمی ایک مدت تک رہ چکا ہو وہ آسان ہو جاتا ہے۔ بالخصوص اہل باطن کو رمضان میں یہ حالت زیادہ مدرک (معلوم) ہوتی ہے کہ اس مہینہ میں جو اعمال صالحہ کیئے ہوتے ہیں سال بھر تک ان کی توفیق رہتی ہے۔

شیاطین کے رمضان میں قید ہونے کا مطلب

پس اس طریق سے بعد رمضان بھی وہی عادت ترک معاصی کی تھوڑی توجہ سے انشاءاللہ محفوظ رہے گی۔ اور میں یہ نہیں کہتا کہ پھر معصیت کی طرف میلان ہی نہ ہوگا، بلکہ دعویٰ یہ ہے کہ اس میلان کا جس قدر پہلے تقاضا ہوتا تھا اب اس قدر تقاضا نہ ہوگا کہ بہت تھوڑی توجہ اور ضبط سے وہ میلان دفعہ یا مغلوب ہو جاوے گا اور میرے نزدیک یہی اثر ہے شیاطین کے مقید ہو جانے کا رمضان میں کہ قبل رمضان جو نفسانی خواہشیں طبعاً پیدا ہوتی تھیں۔ ان کی اعانت شیاطین بھی کرتے تھے اس لیئے تقاضا شدید ہوتا تھا کہ ضبط میں زیادہ مشقت ہوتی تھی رمضان میں گو ایسی خواہشیں پیدا تو ہوتی ہیں کیونکہ نفس اور طبیعت قید ہوتے مگر شیاطین چونکہ قید ہو گئے اس لیئے ان کی جانب سے اعانت نہیں ہوتی، تو تقاضا اس قدر نہ ہوگا اور رکنا اتنا دشوار نہ ہوگا، چنانچہ یہ امر تجربہ اور مشاہدہ سے دیکھ لیا جاوے کہ صحیح ہے اور اس تقریر سے بعض اشکالات بھی حل ہو گئے اور اسی کا ضمیمہ یہ بھی ہے کہ حتی الوسع رمضان میں غذائے حلال کا زیادہ اہتمام رکھے، شرم کی بات ہے کہ حلال سے دن بھر رکا رہے اور حرام سے افطار کرے!!

سحور یعنی سحری

اس میں غالبًا دو کوتاہیاں ہوتی ہیں، ایک تعجیل کے متعلق دوسرے تاخیر کے متعلق

(۱) اول کا بیان یہ ہے کہ اکثر لوگ آدھی رات سے سحری کھاکر بیٹھ رہتے ہیں، سو اول تو خود اس قدر تعجیل ہی امرِ شارع وغرضِ مشروعیتِ سحر کے خلاف ہے اور وہ غرض یہ ہے کہ مسلمین واھلِ کتاب میں فرق رہے اور روزہ میں قوت وطاقت رہے اور دوسرے اکثر عوام کا اس کے ساتھ یہ اعتقاد منضم ہو جاتا ہے کہ جب سحر کھاکر روزہ کی نیت کرلی یا سو گئے تو اس کے بعد گو رات باقی ہی ہو مگر اب کھانا پینا جائز نہیں، سو یہ اعتقاد ایک (اختراع فی الدین) ہے جس سے توبہ واجب ہے۔

(۲) ثانی کا بیان یہ ہے کہ بعضے لوگ خصوص جن کے پاس نقشے اور گھڑیاں بھی ہیں اس قدر تاخیر کرتے ہیں کہ بعض اوقات یہ اشتباہ قوی ہو جاتا ہے کہ کہیں صبح صادق کے بعد تو نہیں کھایا گیا، اس قدر مبالغہ ضرور بے احتیاطی ہے، حدیث متفق علیہ کالراعی یرعی حول الحمی یوشک ان یرتع فیہ) اس سے صاف روک رہی ہے، اسی طرح گھڑیوں پر اتنا اعتماد کہ اس کی بنار پر اتنے بڑے فرض الٰہی کو خطرہ میں ڈالنے پر اقدام کر بیٹھے جسارت عظیمہ ہے، اور تجربہ کے بھی خلاف، کیونکہ ہزاروں واقعات بڑی بڑی قیمتی گھڑیوں کی غلطی نکلنے پر شاہد ہیں۔

اسی طرح اس کے مقابل بعض کا تشدد کہ گھڑی ہی کو بدعت کہتے ہیں اور نماز روزہ میں اس کے حساب کو کسی درجہ میں معتبر رکھنے کو بھی حرام سمجھتے ہیں، یہ بھی تعدی حدود ہے اس میں "قولِ فیصل" یہ ہے کہ اصل مدارِ معرفت اوقات ہیں، علامات خاصہ ہیں، اور ان علامات کی تحقیق میں جیسا مشاہدہ اور حس معتبر ہے اسی طرح اس مشاہدہ وحس کی مطابقت پر کوئی اصطلاح یا آلہ جس کا کثرتِ تکرار مشاہدہ سے صحیح ومطابق ہونا معلوم ہوا ہو مقرر کرلیں یا اور کوئی قدرتی چیز مطابق معلوم ہو تو اس کا اعتبار بھی جائز ہے۔ نہ من حیث الخصوصیت بلکہ من حیث المطابقۃ لتلک العلاماتِ المعتبرۃِ شرعًا (یعنی یہ کوئی خصوصیت اس

آلہ اور اصلاح کی نہیں، بلکہ یہ آلہ چونکہ ایسی علامتوں کے مطابق ہو گیا ہے جو شرعًا معتبر ہیں اس کا بھی اعتبار ہو گیا) پس گھڑی اسی قبیل سے ہے، نظیر اس کی طبلِ سحور ہے، جس کے جواز اعتبار کو فقہاء متاخرین نے تنصیصًا فرمایا ہے، (یعنی صبح صادق کے لئے جو نقارہ بجایا جائے اس پر اعتبار کر لینے کی فقہاء نے تصریح فرمائی ہے)

لیکن بدل کسی طرح اصل کے برابر نہیں ہو سکتا، کیونکہ اصل میں تو غلطی کا احتمال ہی نہیں (مثلاً غروب کا آنکھوں سے دیکھ لینا، ہاں شاید کبھی حس میں غلطی ہو جائے) اور بدل میں احتمال ہے (جیسے گھڑی) اور یہاں سے سحر میں مرغ کی اذان کا اور انطار کے وقت شپرک کے نکلنے کا وقت بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ بدوں تجربۂ کامل کے اس پر اعتماد نہ چاہیئے۔

- بعض لوگ سحر مناسب وقت کھاتے ہیں مگر فضول حقّہ و پان میں اسقدر دیر لگا دیتے ہیں کہ روزہ خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔
- بعضے پان منہ میں دبا کر سو رہتے ہیں یہ سب بے عنوانیاں ہیں۔

سحری میں کوتاہی

- ایک بے عنوانی سحور کے متعلق بعض مقامات پر یہ دیکھی جاتی ہے کہ صبح کی اذان قبل الوقت کہتے ہیں، تاکہ سحر کھانے والے سحر چھوڑ دیں، مگر جن کے نزدیک اذانِ فجر قبل الوقت کافی نہیں (جیسے امام ابو حنیفہؒ وغیرہ) ان کے نزدیک اس اذان کا اعادہ ضروری ہے اور اعادہ نہیں کیا جاتا تو صبح کی نماز بدون اذان ہوتی ہے، دوسرے اگر لوگوں کو اس کی عادت ہو گئی اور ظاہر ہے کہ مؤذن نہ ایسے دیانتدار نہ ایسے واقف کارِ اوقات ہیں تو اگر کسی روز غلطی سے خلافِ معمول بعد صبح صادق اذان ہوئی، تو تمام لوگوں کے روزے اس اذان کے بھروسہ برباد ہوں گے، اس لئے مصلحت یہ ہے کہ اذان ایسے وقت کہی جایا کرے کہ اس اذان کے اعتماد پر کوئی شخص سحری نہ کھاوے، پھر خود ہی ہر شخص اپنے طور پر تحقیق کر کے اس پر عمل درآمد کرے گا۔

افطار

اس وقت ذہن میں اس کے متعلق بڑی کوتاہی ایک ہی آتی ہے وہ یہ کہ اکثر جگہ دیکھا جاتا ہے کہ افطار کے سامان میں جس کو عرف میں " افطاری " کہتے ہیں اس قدر اہتمام کرتے ہیں کہ اس کے کھاتے کھاتے مغرب کی جماعت بالکل یا کسی قدر فوت ہوجاتی ہے۔ اور یہ بات قصداً اور اکثر ہوتی ہے، جس میں شرعاً معذور بھی نہیں ہوسکتا، جماعت کی جو کچھ تاکید آئی ہے اس کے اعتبار سے یہ عادت نہایت منکر ہے، اول تو اس قدر اہتمام ہی کیا ضرور ہے؟ دوسرے یہ بھی تو ممکن ہے کہ نماز کے بعد یہ شغل ہوا ور افطار کسی مختصر چیز پر ہو کر نماز میں حاضر ہو جاوے،

اس کے لئے آسان طریقہ یہ ہے کہ افطار خواہ مُطوّل ہو خواہ مختصر ہو مسجد میں ہونا چاہیے، مکان پر روزہ کھولنے سے اکثر جماعت برباد ہوتی ہے، پھر جب جماعت ملنے سے مایوسی ہوجاتی ہے اکثر لوگ گھر ہی پر نماز پڑھ لیتے ہیں، تو روز روز مسجد کی برکات سے بھی محروم رہتے ہیں اگر دو چار کی دعوت ہو تو وہ سب بھی مسجد میں جا سکتے ہیں کیا بندہ کے گھر پہ جانا فخر اور خدا کے در پر حاضر ہونا عار ہے .... ؟ اگر یہی خیال ہے تو یہ تمام افطار بیکار ہی بیکار ہے۔

تراویح

اس عمل میں دو جزو ہیں قرآن پڑھنا، اور نماز، اور ایک ان دونوں کا مجموعہ ہے، اور دونوں جزو میں جو جو کوتاہیاں واقع ہوتی ہیں اس سے پہلے مفصل بیان کرچکا ہوں اس سے ایک بڑی فہرست تراویح کی کوتاہیوں کی بھی معلوم ہوسکتی ہے، اسوقت صرف ان بعض کوتاہیوں کا مختصراً ذکر کرتا ہوں جو مجموعہ میں پائی جاتی ہیں وہ یہ ہیں:۔

(۱) اکثر لوگ فارغ ہونے کی جلدی میں وقت کے آنے سے پہلے ہی کھڑے ہو جاتے ہیں۔

(۲) اگر کھڑے بھی وقت پر ہوتے ہیں تو اذان ہی وقت سے پہلے کہہ دیتے ہیں۔

(۳) قرآن مجید اس قدر تیز پڑھتے ہیں کہ تجوید کیا تصحیح حروف بھی نہیں ہوتی! بعض دفعہ سامعین کو سمجھنا کجا سنائی بھی نہیں دیتا کہ کیا پڑھا جا رہا ہے۔

(۴) اکثر ثنا و تسبیحاتِ رکوع و سجود و تشہد، مقتدی پورا نہیں پڑھنے پاتا کہ امام صاحب قرأۃ یا قومہ یا جلسہ یا قیام یا سلام کی طرف چل دیتے ہیں۔

(۵) ترویحہ میں بھی بعض جگہ نہیں ٹھہرتے۔

(۶) بعضے لوگ ایک ہی رات میں دو دو جگہ پوری تراویح پڑھا دیتے ہیں۔

(۷) بہت لوگ اجرت پر قرآن سناتے ہیں۔

(۸) بعضے حفاظ اپنا پڑھ کر یا کسی روز ناغہ کر کے دوسرے حفاظ کا اس نیت سے سننے جاتے ہیں کہ اس کی غلطیاں پکڑیں گے یا اس کو غلطی میں ڈالیں گے، خواہ غلط بتلا کر یا اس کے قلب کو مختلف نالائق حرکات سے پریشان کر کے، کہیں لاٹھی کھڑکھڑاتے ہیں کہیں پاؤں زور زور سے زمین پر مارتے ہیں، کہیں کھنکارتے ہیں، کہیں لالٹین کو الٹ پلٹ کر کے دکھاتے ہیں، کہیں کھڑے ہو کر زور سے باتیں کرتے ہیں، غلط گیری کا تجسس اور غلط اندازی شیطنت ہے یہ اسی کا خاصا ہے، عبادت میں دوسری طرف مشغول کر کے خلل ڈالنا۔

(۹) بعض ایسے بچوں کو امام بنا دینا جن کو طہارت و نماز کے مسائل ضروری بھی معلوم نہیں، بلکہ ان پر یہ بھی اطمینان نہیں کہ ان کے کپڑے بھی پاک ہوں گے یا ان کو وضو بھی ہوگا اور نابالغ کے پیچھے تراویح کے جائز ہونے میں جو اختلاف ہے وہ اس سبب سے علاوہ ہے اول تو نماز کے بارہ میں احوط پر عمل مطلوب ہے، پھر جواز کی صورت میں بھی ان عوارض بالا کا کیسے انکار ہو سکتا ہے، ایسے بچے نوافل میں پڑھ دیا کریں کافی ہے۔

(۱۰) بعض دفعہ شبینہ اس طرح پڑھنا کہ نماز اور قرآن دونوں کے احترام و تعظیم کا بالکل ضائع ہونا لازم آتا ہے، یہاں تک کہ ایک مقام پر ایک حافظ صاحب چارپائی پر لیٹے ہوئے سب حفاظ کا سنا کیے اور سہواً و متشابہ بھی بتلاتے رہے اور سب نمازیں شب بھر کی

برباد کرتے رہے اور بہت سی خرابیاں اس کے متعلق بندہ نے " اصلاح الرسوم " میں لکھ دی ہیں اس کو بھی ملاحظہ فرمالیا جائے، چونکہ ان مذکورہ دس امور کا حکم کچھ مخفی نہیں نیز مراجعتِ علماء سے بآسانی ہوسکتا ہے اس لئے بخیال تطویل مختصر کردیا۔

(۱۱) بعض امورِ متفرقہ منکرات میں سے ہیں، جیسے منجھلے روزہ کے لیے خاص طور پر اہتمام کرنا۔

(۱۲) آخری جمعہ کو خطبۃ الوداع کا التزام

(۱۳) ختم قرآن کے وقت شیرینی کو لازم وضروری کرنا۔

(۱۴) بعض جگہ انیسویں شب کو بھی ختم تراویح پر تقسیم شیرینی کا انتظام۔

(۱۵) نامحرم حافظوں کو گھر میں بلاکر عورتوں کا قرآن سننے کے لئے جمع ہونا ونحو ذالك، ان میں بعض کا حکم اصلاح الرسوم میں ہے، بعض کا اہل علم سے معلوم کرلیا جائے، یہ سب رمضان المبارک کے متعلق بیان ہوا، اب دو امراس کے متعلقات سے رہے جو عید کے متعلق ہیں، ان کے بارہ میں سنئے مگر مختصر ہی ہے۔

صدقۂ فطر

بہت لوگوں کو اس کے مامور بہ ہونے کی خبر نہیں (یعنی یہ بھی نہیں جانتے کہ خدا تعالیٰ نے اس کا حکم فرمایا اور واجب کیا ہے) بہت لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یہ ان ہی کی طرف سے دیا جاتا ہے جنھوں نے روزے رکھے ہیں، سو وہ بچوں کی طرف سے ادا نہیں کرتے بہت لوگ خاص کر دیہات والے صدقۂ فطر جمع کرکے مسجد کے مؤذن یا امام کو یا کچھ مسجد کے سقہ کو دے دیتے ہیں اور یہ نہیں کہ ان کی حق المحنت واجرت کے علاوہ مسکین سمجھ کر دیدیتے ہوں، بلکہ ان لوگوں کو ایسی ہی شرائط مقرر کرتے ہیں کہ تم یہ کام کرو تم کو یہ ملے گا، ان میں صدقۂ فطر بھی شمار کیا جاتا ہے، تو اسی طور پر وہ ان کے عمل کا عوض ہوا جو کہ اجرت ہے اور اجرت دینے سے وہ ادا نہیں ہوا اس لئے ان دینے والوں کے ذمہ مکرر ادا کرنا ضروری ہوگا۔

البتہ اگر مقرر کرتے وقت تصریح کردیں کہ صدقۂ فطر سے تمہارا کچھ واسطہ نہ ہوگا اور پھر

مسکین سمجھ کر دیدیں وہ جائز ہے، بشرطیکہ واقع میں مسکین بھی ہو، ورنہ اگر وہ غنی ہو، جیسا کہ بعض جگہ نہ معطی کو اس کی پرواہ ہے نہ آخذ کو۔ (نہ دینے والوں کو نہ لینے والوں کو) تو اس دینے سے صدقہ فطر ادا نہ ہوگا مکرر دینا پڑیگا، لیکن اس غنی سے جبراً واپس بھی نہ لے سکے گا۔ رہا یہ کہ اس غنی کے لئے بھی وہ حلال ہوگا یا نہیں، اور اگر حلال نہیں تو آیا دینے والے کو واپس کر دینا واجب ہے یا صدقہ کرنا ان مسئلوں میں کسی قدر اختلاف ہے۔ کمافی ردالمحتار باب المصرف تحت قوله ولو دفع بلا تحرٍّ (چنانچہ شامی میں مستحقینِ صدقہ وزکوٰۃ کے بیان میں لودفع بلا تحرٍّ کے ذیل میں ذکر کیا ہے)

تنبیہ: اگر ناواقفیت مسائل یا بے پروائی سے گذشتہ زمانہ میں بچوں کا صدقہ فطر نہ دیا ہو یا مؤذن وغیرہ کو اجرت میں دے دیا ہو یا غنی کو دیدیا ہو، تو یاد کر کے اور حساب لگا کر اب مساکین کو اس مقدار کے موافق دیدیں تاکہ ذمہ فارغ ہو جاوے اور صدقۃ الفطر کے مسائل علماء سے دریافت کر کے یا بہشتی زیور میں مطالعہ کر کے خود بھی عمل کرنا اور دوسروں کو آگاہ کرنا چاہیئے۔

نمازِ عید

اس میں بھی چند کوتاہیاں ہوتی ہیں۔

(۱) ــــ ایک یہ کہ بعض لوگ اس نماز کا طریقہ ہی نہیں جانتے اور غضب یہ کہ اتنی توفیق بھی نہیں ہوتی کہ آٹھ دس دن پہلے یاد ہی کر لیں اس سے زیادہ کیا بے پروائی ہوگی۔!!

(۲) ــــ ایک یہ کہ اکثر جگہ یہ نماز بہت ہی دیر میں پڑھتے ہیں، حالانکہ صریح سنت اس کے خلاف آئی ہے۔

(۳) ــــ ایک یہ بہت جگہ امام اور خطیب جاہل ہیں جو بنا بر دعویٰ استحقاق آبائی نماز پڑھاتے آئے ہیں، جن میں اکثر تو ایسے جاہل ہیں کہ خطبہ اور سورۃ تک صحیح نہیں پڑھ سکتے اور اگر نماز میں کوئی سانحہ پیش آجائے جس میں مسائل جاننے کی ضرورت ہو تو کچھ

نہیں کر سکتے، یہ تقدم انہوں نے اختیار تو کیا تھا ترفع کے لئے لیکن اس جہل کی بدولت ان کی اس قدر فضیحتی اور رسوائی ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ اور اگر اس درجہ کے جاہل نہ ہوئے تب بھی مدعی مرائی متفاخر متصنع کے پیچھے نماز پڑھنے کو فقہاء نے خود مکروہ کہا ہے۔

اس کا انسدادِ سہل بجز اس کے کچھ نہیں کہ اہلِ حل و عقد یعنی بستی کے عمائد اس امام کو معزول کر کے کسی اہل کو مقرر کریں، اور آئندہ اس رسم کو موقوف کریں کہ امام کا بیٹا ہی امام ہو، بلکہ اس کی وفات کے بعد پھر جو سب میں زیادہ اہل ہو اس کو مقرر کریں وَھَلُمَّ جَرًّا (اسی طرح آگے تک)

(۴)۔۔۔ ایک کوتاہی یہ کہ بعضے جو بزعم خود مقتدا ہیں متبوع مستقل بننے کی غرض سے عید گاہ کو چھوڑ کر اپنے محلہ کی مسجد میں عید کی نماز پڑھتے ہیں، جس مسجد کی یہ فضیلت ہو کہ وہاں ایک نماز برابر پچاس ہزار نماز کے ہو (یعنی مسجد نبوی) جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اس کو تو چھوڑ کر عمر بھر عید گاہ میں تشریف لے جاویں جس سے یہ بھی مستنبط ہو کہ وہ تضاعف مکتوبات کے ساتھ خاص ہے اور یہ مشتے چند مدعی اپنی مسجد کو عید گاہ پر ترجیح دیں۔۔۔!!

البتہ معذورین کے لئے اگر کسی شخص کو شہر میں نماز پڑھانے کے لئے چھوڑ دیں مضائقہ نہیں مگر مقتدا لوگ خود نہ رہیں اپنے کسی متعلق قابل امامت چھوڑ دیں یا یہ کہ اتفاقاً کوئی عذر خود مقتدا کو یا عام لوگوں کو پیش آجاوے تو دوسری بات ہے، چنانچہ ایک بار خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعذرِ مطر (بارش) مسجد میں نماز ادا فرمائی۔۔۔

(۵)۔۔۔ ایک کوتاہی یہ ہے کہ بہت لوگ عید میں غیر مشروع لباس پہن کر یا اپنے بچوں کو پہنا کر جاتے ہیں اور لے جاتے ہیں حالانکہ ایسے لباس سے علاوہ فی نفسہٖ حرام ہونے کے نماز کا قبول نہ ہونا بھی وارد ہے۔

(۶)۔۔۔ ایک کوتاہی یہ ہے صفیں نہایت بے ترتیب ہوتی ہیں۔ صفوف کے استوار (یعنی برابر کرنے) کی سخت تاکید آئی ہے۔

(۷)۔۔۔ ایک کوتاہی یہ ہے کہ خطبہ سننے کو بالکل امرِ فضول سمجھتے ہیں اگر سب

حاضرین ایسا ہی کریں تو خطیب خطبہ کس کے سامنے پڑھے؟
اور بعضے بیٹھے ہیں مگر باتیں کرتے رہتے ہیں یہ اور بھی گناہ ہے اور بعضے منکراتِ عید کے متعلق "اصلاح الرسوم" میں مذکور ہوئے ہیں۔ اب اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

زکوٰۃ کے بارے میں کوتاہیاں

(اصلاح معاملۂ زکوٰۃ)

جس طرح عباداتِ بدنیہ میں نماز سب سے اہم ہے اسی طرح عباداتِ مالیہ میں زکوٰۃ سب سے اہم ہے، قرآن مجید میں جگہ جگہ اَقِیمُوا الصَّلٰوۃَ کے ساتھ آتُوا الزَّکٰوۃَ آنا اس اہمیت میں شریک ہونے کی تائید کرتا ہے، اس لئے اس کے متعلق کوتاہیوں پر مطلع ہونا بھی نہایت اہم ہوگا، پس مختصراً ان کو لکھا جاتا ہے۔

(۱) ــ ایک کوتاہی تو جو سب سے بڑی ہے یہ ہے کہ بہت سے لوگ زکوٰۃ ہی نہیں دیتے، اس کی اصلاح یہ ہے کہ وہ لوگ زکوٰۃ کی تاکید و فرضیت کے نصوص اور اس کے ترک پر جو وعیدیں آئی ہیں ان کو دیکھیں سُنیں غور کریں اور اس کا جو اصلی سبب "بخل" ہے اس کا علاج کریں، اس علاج کا حاصل مال کی محبت کا گھٹانا ہے، جس کی سب سے اچھی تدبیر موت کا بکثرت یاد کرنا اور یاد رکھنا ہے۔

اور اگر اس کوتاہی کا سبب فرضیت کا اعتقاد نہ ہونا ہے گو آج کل ایسا شخص سنا نہیں گیا، لیکن اگر نادراً ایسا ہو تو اس کی اصلاح اپنے شبہات کا کسی محقق عالم سے رفع کرنا ہے اور اگر رفع نہ کیا اور منکرِ فرضیت رہا تو وہ کافر ہے۔

(۲) ــ ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے زکوٰۃ دیتے ہیں مگر حساب سے نہیں دیتے، جو کچھ جی چاہا دیدی، سو یہ بھی نہ دینے ہی میں داخل ہے کیونکہ ایک ہزار کے مال میں پچیس روپے واجب تھے اور اس نے دس روپے دیئے تو چار سو کی زکوٰۃ ادا ہوگئی اور چھ سو کی رہ گئی، تو

ایسا ہوگیا جیسے کسی کے پاس چھ ہی سو روپے ہوں اور بالکل زکوٰۃ نہ دے پس اس میں بھی وہی معروض ہے جو اوپر مذکور ہوا،

کون سے مال پر زکوٰۃ واجب ہے ؟

(۳) ــــ ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے لوگ بعض اموال کی زکوٰۃ دیتے ہیں اور بعض اموال کی نہیں دیتے ، اس کا زیادہ سبب یہ ہے کہ ان کو یہ خبر نہیں کہ کس کس مال میں زکوٰۃ ہوا کرتی ہے ، اس لئے ان اموال کو بتایا جاتا ہے۔

ایک چاندی، سونا، خواہ سکہ کی صورت میں ہو خواہ زیور کی صورت میں ہو، خواہ گوٹہ ٹھپٹہ ہو خواہ ویسے ہی ٹکڑے رکھے ہوں، اور خواہ پاس موجود ہو، اور خواہ موجود نہ ہو ، مگر اس کا وصول کرنا یا اس سے منتفع ہونا ممکن ہو، جیسے نوٹ لے لئے ہوں یا بنک میں جمع ہو یا کسی کے ذمہ قرض آتا ہو خواہ نقد دیا ہو یا کوئی چیز فروخت کی ہو اور وصول سے ناامیدی نہ ہو، لیکن قرض میں یہ اختیار ہے کہ خواہ اور اموال کے زکوٰۃ کے ساتھ دیدے ، خواہ جب وصول ہوتا رہے دیتا رہے لیکن اگر وصول کے وقت دے گا تو تمام ایام گذشتہ کی دینی پڑے گی ۔ مثلاً دو سال میں سو روپے وصول ہوئے تو ان کی زکوٰۃ اڑھائی روپے سال کے حساب سے دو سال کی پانچ روپے دینا پڑیگی

★ دوسرا مال تجارت اور مال تجارت وہی ہے جس کے خریدنے کے وقت یہ نیت ہو کہ ہم اس کو بیچیں گے ، خواہ وہ منقولات میں سے ہو خواہ غیر منقولات میں سے ہو، مثلاً ایک شخص کی یہ عادت ہے کہ مکانات و اراضی موقع کی خرید لیتا ہے اور پھر موقع پر بیچ ڈالتا ہے، یہ بھی مال تجارت ہو جاوے گا۔ اور زکوٰۃ اس میں واجب ہوگی اور جس کے خریدنے کے وقت بیچنے کی نیت نہ ہو گو بعد خرید چکنے کے نیت ہو جاوے وہ مال تجارت نہیں اس میں زکوٰۃ واجب نہیں۔ اور اسی طرح اگر خریدنے کے وقت تجارت کی نیت تھی مگر حولان حول سے پہلے (یعنی جس وقت ختم سال پر اس پر زکوٰۃ واجب ہوا کرتی ہے اس ختم سال سے پہلے) وہ نیت تجارت کی فسخ ہوگئی ہو وہ بھی مال تجارت نہیں رہا اس میں بھی زکوٰۃ واجب نہیں اسی طرح اگر وہ مال خریدا ہوا نہیں بلکہ میراث میں پہنچا ہے اور مالک ہوتے ہی تجارت کی نیت کر لی یا گھر کا غلہ پیدا ہوا ہے اور تیاری کے وقت نیت تجارت کی کر لی وہ بھی مال تجارت نہیں اور اس میں زکوٰۃ واجب نہیں

★ تیسرا مال وہ مویشی ہیں جن کو نسل بڑھانے کے لیئے پالا ہو جیسے بعضے لوگ بکریاں یا گائیں یا گھوڑیاں پالتے ہیں، ان کے احکام و شرائط میں بہت تفصیل ہے ۔ فقہ کی اردو کی کتابوں میں دیکھ لیا جاوے۔

★ چوتھا مال عشری زمین کی حقیقت کا حاصل یہ ہے کہ جو زمین اس وقت مسلمان کی ملک میں ہو اور اس کے قبل اس کا کسی کافر کی ملک میں آنا معلوم نہ ہو، خواہ واقع میں وہ جب سے اہلِ اسلام کی مفتوحات میں داخل ہوئی ہے کسی کافر کے ہاتھ میں نہ پہنچی ہو، خواہ درمیان میں کوئی کافر بھی برائے چندے اس کا مالک ہو گیا ہو، مگر کسی کو معلوم نہ ہو بس ایسی زمین عشری ہے اس میں جو کچھ پیدا ہو خواہ غلہ، خواہ نیشکر وچری وغیرہ، خواہ خشخاش یا خواہ تمباکو یا اور ادویہ یا پھول جو بغرض نفع بوئے گئے ہو، یا اس میں باغ کسی قسم کے پھل کا ہو ان سب میں بھی زکوٰۃ واجب ہے ، اس زکوٰۃ کو عشر کہتے ہیں اور ہندوستان میں اس سے بڑی غفلت ہے، ان کی دو قسموں کے مال میں چالیسواں حصہ واجب ہوتا ہے اور تیسری قسم میں بہت تفصیل ہے جو فقہ کی اردو کی کتابوں میں ملے گی اور چوتھی قسم میں بارانی زمین میں دسواں حصہ کل پیداوار کا ہے اور چاہی اور نہری میں بیسواں حصہ کل پیداوار کا ہے۔

زکوٰۃ کے حساب میں غلطیاں

(۴) ۔ ایک کوتاہی یہ ہے کہ اپنے نزدیک حساب دیتے ہیں مگر واقع میں وہ حساب غلط ہوتا ہے مثلاً مالِ تجارت میں اپنی خرید یا لاگت کا حساب لگا لیتے ہیں فرض کیجئے کہ ایک شخص نے کچھ کتابیں تاجرانہ نرخ سے خریدیں یا اپنے پریس میں چھاپیں اور ہزار روپے میں اس کو پڑ گئیں مگر بازار میں وہ دوہزار کی ہیں تو زکوٰۃ دوہزار کی دینا چاہیئے اور اگر دوہزار کی زکوٰۃ تو زکوٰۃ پچاس روپے دیتے ہوئے دل دکھے تو سہل یہ ہے کہ خود کتابوں کا چالیسواں حصہ دیدے مثلاً چالیس ہدایہ میں سے ایک ہدایہ دے دے یا ایسی کتاب دیدے جس کی ہدایہ کی برابر قیمت پر نکاسی ہوتی ہو۔

اور اس حساب غلط لگانے کی ایک اور باریک مثال ہے وہ یہ ہے کہ مثلاً ایک

شخص کے پاس سو روپے کی برابر وزن میں چاندی کا زیور ہے اور قیمت اتنی چاندی کی بوجہ ارزانی اسی روپے ہے، تو اکثر لوگ اس اسی روپیہ کا چالیسواں حصہ یعنی دو روپے دیدیتے ہیں، حالانکہ ہم جنس سے زکوٰۃ ادا کرنے میں صنعت اور سکہ کی قیمت کا اعتبار نہیں ہوتا پس اس کے ذمہ اڑھائی روپیہ بھر چاندی واجب ہے، اگر روپیہ دیا تو وہ چاندی کے حساب میں شمار ہوگا اس لئے اڑھائی روپیہ دینے میں زکوٰۃ ادا ہوگی دو روپیہ دینے سے آٹھ آنہ بھر چاندی اس کے ذمہ اور رہی اور اگر اڑھائی روپیہ دینے میں خسارہ سمجھے تو اس کی دو صورتیں اور ہیں۔ ایک یہ کہ روپیہ نہ دے خود چاندی اڑھائی روپیہ بھر دیدے اور وہ مسکین اس کو بیچ کر کارروائی کرے گا۔ دوسرا اس سے بھی سہل یہ ہے کہ دو روپے کے بالکل پیسے ہی پیسے کہ جس میں چاندی کی دونی تک نہ ہو مساکین کو دیدے کیونکہ ان پیسوں کی چاندی اڑھائی روپے بھر آسکتی ہے اور خلافِ جنس اس لئے ان پیسوں کی قیمت اڑھائی روپے بھر چاندی کی برابر سمجھی جاوے گی اور زکوٰۃ ادا ہو جاوے گی۔

ایک مثال حساب غلط ہونے کی بہت ہی باریک ہے وہ یہ کہ اکثر لوگوں کی عادت ہے کہ بوجہ اس کے کہ رمضان ہی تک میں ایک ذخیرہ ثواب برابر ستر فرض کے ہے۔ رمضان المبارک میں زکوٰۃ نکالتے ہیں۔ اور پھر رمضان ہی سے سلسلہ حساب کا رکھتے ہیں، پھر کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ نصاب کے مالک ہونے کی تاریخ سے جو سال شروع ہوا ہے وہ رمضان کے تین چار ماہ پہلے مثلاً ختم ہو گیا تھا تو اسی شخص نے رمضان شریف سے حساب رکھنے کے لئے ان تین چار ماہ کی زکوٰۃ بھی دیدی پھر آئندہ کے لئے رمضان سے رمضان تک حساب جاری رکھا۔

اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ رمضان سے تین چار ماہ بعد سال ختم ہوتا ہے، تو یہ رمضان میں زکوٰۃ ادا کر کے اپنے کو جلدی سبکدوش سمجھ لیتا ہے، مگر غلطی اس میں یہ ہوتی ہے کہ جب رمضان میں یہ شخص زکوٰۃ نکالتا ہے تو جتنا مال رمضان شریف میں اس کی ملک میں ہے یہ اسی کی زکوٰۃ نکالتا ہے، حالانکہ احتمال ہے کہ جو ختم سال

اس کا واقعی ہے اس میں نصاب اس وقت سے زیادہ ہو اور زکوٰۃ واقع میں اسی زیادہ کے حساب سے واجب ہوگی تو اس طور پر حساب سے کچھ زیادہ زکوٰۃ اس کے ذمہ رہ جائیگی،

اور اس طرح سے یہ حساب غلط ہو جاوے گا مثلاً اس کا سال رجب میں ختم ہوتا تھا اور اس وقت اس کے پاس ایک ہزار روپے تھا، جس کی زکوٰۃ پچیس روپیہ ہوتی ہے اور رمضان شریف میں اس کے پاس آٹھ سو روپے رہ گئے جس کی زکوٰۃ بیس روپیہ ہوتی ہے، تو اب اگر اس شخص نے اسی وقت کا نصاب دیکھکر بیس روپیہ ادا کیئے تو پانچ روپیہ اس کے ذمہ رہ گئے۔ اسی طرح اگر اس کا سال ذی الحجہ میں ختم ہوتا ہے اور رمضان میں اس کے پاس آٹھ سو روپے تھے مگر ذی الحجہ میں ہزار ہو گئے تب بھی بعینہ یہی غلطی ہوئی اسی طرح ہر ختم سال پر یہی احتمال ہے۔

سو فرض کیجئے اگر اتفاق سے پانچ سال تک یہی قصہ رہا کہ ختم سال پر تو ہزار روپے ہوتے ہیں اور رمضان میں آٹھ سو روپے تو پانچ روپیہ سال جمع ہو کر پانچ سال میں پچیس روپیہ اس کے ذمہ واجب الادا رہا، تو ایسا ہو گیا جیسے پانچ سال میں چار سال کی زکوٰۃ دی اور ایک سال کی نہ دی، اس لئے یہ ضرور ہے کہ ختم سال پر کے نصاب کو ضرور دیکھا جاوے اور اس کی زکوٰۃ کی مقدار کو یاد رکھے، پھر اگر سال رمضان سے پہلے ختم ہوا ہے، تو رمضان شریف میں اس مقدار کی برابر خیال کر کے زکوٰۃ دے اور اگر رمضان کے بعد سال ختم ہوتا ہے تو رمضان میں جتنا انداز سے دیا ہے اس کو یاد رکھیں، پھر ختم سال پر جتنی مقدار زکوٰۃ کی ہے اس ادا کی ہوئی کو اس سے ملا دے، اگر کچھ ادا کرنے سے رہ گیا ہو تو پورا کرے اور اگر زیادہ دے دیا ہو تو اگلے سال میں لگا لینا جائز ہے۔

زکوٰۃ کو صحیح مصرف پر نہ دینا

(۵) ــــ ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے آدمی زکوٰۃ نکال کر اس کے مصرفِ شرعی میں صرف نہیں کرتے مثلاً بعضے اپنے پیروں کو دیتے ہیں گو وہ صاحبِ نصاب ہو، بعضے مساجد کے ائمہ و مؤذنین کو ان کی تنخواہ کے حساب میں دیتے ہیں؛ بعضے چندہ مدارس میں

دیتے ہیں اور مہتمم کو اطلاع نہیں کرتے اور وہ اس کو تعمیر یا فرش یا تنخواہِ مدرسین یا خرید کتب میں صرف کر دیتا ہے۔ بعضے مردہ کے کفن میں خرچ کر دیتے ہیں اوران سب صورتوں میں زکوٰۃ سر پر رہتی ہے ادا نہیں ہوتی، اسی طرح سادات و بنی ہاشم "بقولِ اصح" اس کے مصرف نہیں ہیں اور جن کو دینے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی ان کو اگر ملنے کے وقت اطلاع ہو جاوے کہ یہ زکوٰۃ ہے تو شامی نے بعض فقہا سے نقل کیا ہے کہ ان کو لینا بھی حرام ہے اور اگر ان قرآئن سے معلوم ہو کہ دینے والے کو ہمارا غیر مصرف ہونا معلوم نہیں تو اطلاع کرنا واجب ہے، اور اخفاء یا سکوت بالاتفاق حرام ہے اور اگر لے لیا تو صاحبِ نصاب کو مکرر زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی۔

البتہ کفن میّت میں اس طرح صرف ہو سکتا ہے کہ اس میت کے کسی غریب قریب کو دے دیا جاوے پھر وہ اپنے اختیار اور رائے سے بلا اس کے کہ اس کو کوئی کسی طرح مجبور کرے اس کا کفن لاکر اپنی طرف سے ڈال دے، اسی طرح امام و مؤذن کو ان کے مقرر کئے ہوئے کے علاوہ اگر وہ مسکین ہوں تو زکوٰۃ دے سکتے ہیں،

اسی طرح مدارس میں دینے کے لئے شرطیں ہیں کہ مہتمم کو اطلاع کرے اور یہ کہ اس پر قلب مطمئن ہو کہ یہ غیر مصرف میں صرف نہ کرے گا تاکہ وہ مصرف میں صرف کر سکے اور کر دے، مثلاً مستحق طلباء کو دیدے کہ وہ اپنی خوراک پوشاک وغیرہ میں صرف کریں اور اگر اطلاع نہ ہوئی یا ہوئی مگر وہ مسائل نہیں جانتا یا جانتا ہے مگر محتاط نہیں، تو ان صورتوں میں چونکہ اطمینان نہیں کہ وہ مصرف میں صرف کرے گا، اس لئے ایسے شخص کو دینا ہی جائز نہیں۔

غرض جس جگہ صرف کرنے سے کسی خاص شخص کی ملک نہ ہو اور ملک بھی واقعی جیسے عمارت یا فرش مسجد میں صرف کرنا یا کفن لے کر مردہ پر ڈال دینا، یا ملک تو ہو جاوے مگر وہ شخص مصرف نہ ہو جیسے غنی یا بنی ہاشم یا اس کی خدمت کی اجرت میں دیا جاوے، جیسا مذکورین کی تنخواہوں میں دینا یہ سب غیر مصرف ہیں زکوٰۃ ادا نہ ہوگی اور دوبارہ دینا پڑے گی، سنا گیا ہے کہ بعض لوگوں نے چندہ حجاز ریلوے میں زکوٰۃ دے دی ہے سو

سو ان کو وہ زکوٰۃ دوبارہ دینا چاہئے۔

اور ملکِ واقعی کے چندہ لگانے سے یہ بات معلوم ہوگئی ہوگی کہ بعض لوگ جو مدارس یا مساجد کے مصارفِ عامہ میں صرف کرنے کے لئے ایک حیلہ کیا کرتے ہیں کہ اوّل کسی مسکین مصرفِ زکوٰۃ کو سمجھا دیا کہ ہم تم کو سو روپیہ دیں گے پھر تم مسجد یا مدرسہ میں دے دینا۔ اور پھر اس کو دیتے ہیں اور وہ مسجد وغیرہ میں دے دیتا ہے اور اس کو "حیلہ تملیک" کہا جاتا ہے چونکہ یقینی بات ہے اس میں دینے والا حقیقتہً اس مسکین کو مالک نہیں بناتا محض صورت تملیک کی ہے اس لئے اس طور سے زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم مشکل ہے۔

اور ایک خرابی اس میں یہ ہے کہ وہ مجبور ہو کر پھر واپس کر دیتا ہے، تو وہ دینا اس کا بہ طیبِ خاطر نہیں ہوتا جو کہ حلتِ مال کی شرط ہے، غرض لینا دینا دونوں قواعد کے خلاف ہیں، بعضوں کو شبہ ہو جاتا ہے کہ شرع تو ظاہر پر ہے تو خوب سمجھ لو! کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ باطن کی تفتیش مت کرو، لیکن اگر بلا تفتیش باطن کی اطلاع ہو کہ یہاں تملیک کی نیت نہیں اور طیب خاطر نہیں تو شرع نے یہ کب کہا ہے کہ اب بھی باطن کا اعتبار مت کرو؟ اگر یہ نہ ہوتا تو بنصِّ حدیث جو حلت مال کے لئے طیبِ نفس شرط لگایا گیا ہے جو کہ امرِ مبطن ہے یہ بے معنیٰ ہوتا ہے۔

اگر کہیں ایسے ہی موقع پر زکوٰۃ سے امداد کرنے کی ضرورت ہو اس کی ایک اور تدبیر جو کہ بالکل قواعد کے مطابق ہے یہ ہے کہ کسی مسکین کو مشورہ دیا جاوے کہ تم دس روپیہ مثلاً کسی سے قرض لے کر فلاں سیدؔ کو دے دو، یا فلاں مسجد و مدرسہ میں دے دو ہم تمہاری اعانت ادائے قرض میں کرائیں گے جب وہ مسکین وہاں دے دے تم اس مسکین کو دس روپے زکوٰۃ میں دے دو پھر اس سے اس کا قرض خواہ وصول کر لے گا، اس میں مسکین کو دینا بھی حقیقتہً ہوا۔ اور اس مسکین پر صدقہ دینے میں جبر بھی نہ ہوا۔ کیوں کہ وہ آزاد ہے خواہ قبول کرے یا نہ کرے، بخلافِ حیلۂ تملیک کے کہ اگر وہ مسکین موافق تعلیم کے نہ دے تو کدورت بلکہ نزاع واقع ہو جاوے اور ہر چند کہ بعد مل جانے اس روپیہ کے قرض خواہ اس سے جبراً لے سکتا ہے مگر قرض تو حق واجب عہد کا ہے اور

اس میں جبر جائز ہے اور چونکہ وہ روپیہ حقیقتاً اس مسکین کا ہو گیا اس لئے اس کو جبراً اپنے قرضہ میں لے لینا سہل ہے، جیسے اس مسکین کے پاس خاص اس کا مکسوبہ ہوتا اور اس کو جبراً لینا جائز تھا۔

زکوٰۃ سے دنیوی مقاصد کا حصول

(۶) ــــ ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض آدمی زکوٰۃ سے دنیوی اغراض نکالنا چاہتے ہیں جو کہ خلوص کے خلاف ہے۔ مثلاً اپنے نوکروں کو زکوٰۃ اس خیال سے دیتے ہیں کہ یہ ہم سے زیادہ دبیں گے۔ اور کام خوب کریں گے اور اس میں کمی ہونے سے ان کو شکایت ہوتی ہے کہ دیکھو یہ لوگ کیسے ہیں کہ اس کا اثر نہیں مانا۔ بلکہ بعض تو زبان سے بھی جتلانے لگتے ہیں کہ نمک حرام تجھ کو اتنی تنخواہ دیتے ہیں اور زکوٰۃ سے بھی تیرا خیال رکھتے ہیں مگر تو ایسا احسان فراموش ہے ونحو ذالک گو ضابطہ سے یہ زکوٰۃ ذمہ سے ساقط ہو جاتی ہے لیکن حدیث لا یقبل اللہ الا الطیب کی رو سے یہ زکوٰۃ مقبول نہیں ہوتی، پھر اول اور دوسری کوتاہی والے بعضے عذر بھی پیش کرتے ہیں۔

مثلاً یہ عذر کہ اگر ہر سال زکوٰۃ دیتے رہیں تو بعضے مال تو تقریباً ختم ہو جاویں۔ مثلاً جس روپیہ سے ہم تجارت نہیں کرتے ویسے ہی رکھا ہے، یا زیور کہ تجارت کے کام ہی کا نہیں تو نشو و نما تو کچھ ہوگا نہیں اور ہر سال ایک جزو زکوٰۃ کا نکلا کرے گا تو یوں ہی فنا ہو جاوے گا جواب یہ ہے کہ روپیہ سے تجارت کرنے کو کس نے منع کیا ہے اب اگر خود نہ کرو تو شریعت اس کی ذمہ دار نہیں۔

اسی طرح چاندی، سونا، زیور کے لئے اصل میں موضوع نہیں ہے بلکہ اصل خلقت میں وہ "ثمن" ہے جو تجارت کے لئے مخلوق ہوا ہے، سو زیور تم نے خود اپنی خوشی سے بنایا ہے شریعت اس کی ذمہ دار نہیں ہے، جب تم چاہو اس سے سکہ بدل کر تجارت کر سکتے ہو اور بڑھا سکتے ہو جس سے وہ اپنی زکوٰۃ کا خود کفیل و متحمل ہو سکتا ہے۔

اور مثلاً یہ عذر کہ دوکان میں جب مختلف اقسام کا مختلف قیمتوں کا مال موجود ہے

اس کا حساب کیسے ہو سکتا ہے ؟ ..... اس کا جواب یہ ہے کہ اگر تمہاری دوکان میں خرید و فروخت کا حساب لکھا جاتا ہے تو کاغذات سے حساب تیار ہو سکتا ہے، اور اگر ایسا نہیں تو نظری تخمینہ کافی ہے، جو تخمینہ قرار پاوے احتیاط کے لئے کچھ اور بڑھا لو۔ مثلاً آٹھ سو روپے کا تخمینہ ہوا تم ہزار سمجھ لو اتنے میں اتنا بڑھا لینے سے احتمال غلطی کا ہرگز نہ رہے گا اور زکوٰۃ میں کل پانچ روپیہ بڑھتے ہیں جو کچھ گراں نہیں اور اسی طرح گوٹہ ٹھپہ کا اور اسی طرح زیور کا جس میں دوسری چیز بھی مرکب ہے تخمینہ کافی ہے۔

اور مثلاً یہ عذر کہ صاحب ہمارا مال تو حلال نہیں ہے، حرام مال میں زکوٰۃ ہی نہیں سو سمجھ لیا جاوے کہ یہ مسئلہ غلط ہے حرام مال جب اپنے مال میں مل گیا وہ ملک میں داخل ہو گیا، گو ملک خبیث ہی ہو، اور وجوبِ زکوٰۃ کے لئے ملک ہونا شرط ہے طیب ہونا شرط نہیں، طیب ہونا مقبولیت کی شرط ہے سو زکوٰۃ واجب ہوگی، گو مقبول نہ ہوگی، پھر دینے سے کیا فائدہ ؟ جواب یہ ہے کہ نہ دینے سے جو عذاب ہوتا ہے اس سے محفوظ رہے اور قبول نہ ہونے سے عذاب نہیں ہوتا بلکہ ثواب سے محرومی رہتی ہے، تو کیا عذاب ہونا اور ثواب نہ ہونا دونوں ایک بات ہیں ؟؟ البتہ خود کسب حرام کا جو عذاب ہے وہ الگ ہے اس کی نفی نہیں کی جاتی، لیکن نہ دینے سے دو عذاب کا استحقاق ہوتا کسبِ حرام کا الگ اور زکوٰۃ نہ دینے کا الگ اور اب ایک ہی ہو گا۔ تو کیا یہ دونوں بھی یکساں ہیں ؟ ہرگز نہیں!

ردّی چیزیں زکوٰۃ میں دینا

(۷) — ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے لوگ زکوٰۃ میں ایسی چیز دیتے ہیں جو ردّی اور ناکارہ ہو مثلاً تاجرِ کتب ایسی کتاب دے جس کی نکاسی نہ ہوتی ہو اسی طرح تاجر پارچہ پرانے تھان نکالے اور تاجرِ غلہ کرم خوردہ غلہ نکالے وعلیٰ ھذا سو جس حساب میں اس نے یہ چیزیں لگائی ہیں اگر بازار میں اتنے کو نہ نکل سکے تب تو زکوٰۃ ہی ادا نہیں ہوئی۔ بقدر کمی قیمت اس کے ذمہ رہ گئی اور اگر اتنی قیمت کی ہے تو زکوٰۃ تو ادا ہو گئی مگر بقدر کمی خلوص کے مقبولیت میں کمی رہی۔

دعوت کے ذریعہ زکوٰۃ کا حکم

(۸) ۔ ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے لوگ زکوٰۃ کے روپیہ یا غلہ کا کھانا پکوا کر مساکین کو دعوت میں کھلادیتے ہیں سو سمجھ لینا چاہیئے کہ اگر کھانا پکا کر ان کے ہاتھ میں دے دیا جاوے کہ ان کو اختیار ہو لے جانے کا ، یا بیٹھ کر کھالینے کا اور اس کی ان کو اطلاع کر دی جائے اور وہ کھانا قیمت میں اس قدر ہو تب تو زکوٰۃ ادا ہو جاوے گی اور اگر لے جانے کا اختیار نہ ہو بلکہ بٹھلا کر کھلایا جاوے تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔

اسی طرح اگر پکا ہوا کھانا اس قیمت کا ہو جتنی زکوٰۃ اس کے ذمہ واجب تھی تب بھی پوری زکوٰۃ ادا نہ ہوگی ۔ مثلاً ایک شخص کو بیس روپے زکوٰۃ کے دینے ہیں اس نے جنس خرید کر پکوائی ، کچھ خرید میں صرف ہوا ، کچھ باورچی کو مزدوری میں دیا ، غرض بیس روپے صرف ہوگئے ۔ مگر کسی وجہ سے خواہ تو جنس خریدنے میں یہ ٹھگا گیا یا مزدوری زیادہ دیدی یا کھانا بگڑ گیا۔ غرض کسی طور پر تیار کھانا بیس روپیہ کا نہ ہوا بلکہ سترہ اٹھارہ کا ہوا تو یوں نہ کہیں گے کہ اس نے تو بیس ہی روپے خرچ کیئے ، اس لیئے زکوٰۃ ادا ہو جانا چاہیئے ، بلکہ یوں کہیں گے کہ مساکین کو سترہ ، اٹھارہ ہی روپیہ کی چیز پہنچی اس لیئے اتنی ہی زکوٰۃ ادا ہوئی ، دو یا تین روپے اور اس کے ذمے باقی رہے جس کا ادا کرنا واجب ہے ، اس طرح زکوٰۃ کی رقم کا کپڑا خریدا اور سلوایا اگر وہ بعد تیاری کے اتنی رقم کا ہے تب تو اس کے دینے سے زکوٰۃ ادا ہو گی اور اگر کسی وجہ سے قیمت اس کی گھٹ گئی مثلاً کپڑا ناواقفی سے گراں ملا یا سلوانے میں بگڑ گیا تو بقدر گھٹنے کے اور زکوٰۃ دینا پڑے گی ۔۔۔!

(۹) ۔ ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے آدمی دیکھتے ہیں کہ ہم کو پانچ روپیہ زکوٰۃ کے دینے ہیں اور فلاں غریب آدمی کے ذمہ کسی سبب سے ہمارا قرضہ بھی پانچ روپیہ ہیں لاؤ اس کو زکوٰۃ کی نیت سے معاف کر دیں ، سو یاد رکھا جاوے کہ اس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی ، کیونکہ زکوٰۃ میں تملیک کامل شرط ہے اور ابراء من وجہٍ اسقاط اور من وجہٍ تملیک ہے اس لیئے زکوٰۃ ادا نہ ہوگی ۔

البتہ ایک تدبیر اور جائز ہے وہ یہ کہ اول یہ پانچ روپیہ اس شخص کو بہ نیت زکوٰۃ دیدے جب وہ اس روپے کا مالک وقابض ہوجاوے، اس سے اپنا قرضہ مانگے اور اگر وہ نہ دے تو جبراً چھین لینا بھی جائز ہے اس میں کچھ حرج نہیں۔

الیمَاظ

(۱) — اگر کوئی پہلے زکوٰۃ دینے کا خوگر نہ ہوا اور اب توفیق ہو تو گذشتہ زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے، البتہ اگر درمیان میں بدون تلف کئے ہوئے مال خود تلف ہوکر نصاب سے کم رہ گیا ہو تو اس وقت کی زکوٰۃ ساقط ہوجائے گی۔

(۲) — اگر زکوٰۃ کی نیت سے مال نکال رکھا ہوا اور وہ ضائع ہوجاوے تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی، جداگانہ نکال کر رکھنے سے صرف اتنا فائدہ ہے کہ ہر جزو کے دینے کے وقت نیت ضروری نہیں ہوتی۔

الحَاق

صدقۂ فطر اور چرم قربانی

چونکہ صدقۂ فطر کا ادا کرنا اور قیمت چرم قربانی کا بعد فروخت کر ڈالنے چرم قربانی کے تصدق کرنا بھی واجب ہے، اس لئے وہ بھی اس حیثیت سے "ملحق بالزکوٰۃ" ہے اس لئے اس کے متعلق بھی بعض کوتاہیاں زکوٰۃ کے ساتھ بیان کرنا مناسب معلوم ہوا۔

● ایک کوتاہی صدقہ فطر کے متعلق بعض دیہات میں یہ ہے کہ اس کو جانتے ہی نہیں اس لئے ادا نہیں کرتے، اہل علم و واعظین کو چاہیئے کہ جمعہ کے خطبہ میں یا کسی موقع پر خود دیہات میں جاکر اس جگہ پر آگاہ کریں۔

● ایک کوتاہی اس کے متعلق یہ ہے کہ غیر مصرف میں صرف کرتے ہیں اس کا مصرف وہی ہے جو زکوٰۃ کا ہے جن مصارف میں صرف کرنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی۔ جن کا اوپر بیان

کیا گیا ہے ان میں صرف کرنے سے صدقہ فطر بھی ادا نہیں ہوتا۔

ایک غلطی بنار بر قواعدِ حنفیہ کے اس میں یہ ہے کہ یہ مشہور ہوگیا ہے کہ صدقہ فطر اگر بجز گیہوں کے اور کسی غلہ سے ادا کرے تو گیہوں کے مضاعف وزن میں دیدے اس میں دو غلطیاں ہیں ایک یہ کہ بہت چیزوں میں گیہوں کا مضاعف نہیں ہے بلکہ اس میں تفصیل ہے ، وہ یہ کہ جو چیزیں منصوص ہیں جیسے جو و تمر مثلاً اس میں تو گیہوں کا مضاعف ہے اور جو چیزیں منصوص نہیں جیسے چنا، چاول اس میں یہ حکم ہے کہ کسی منصوص چیز کی برابر قیمت میں ہو مثلاً گیہوں نمبری سیر سے احتیاطاً دو سیر دیئے جاتے ہیں اور تیرہ سیر کے نرخ سے اڑھائی آنہ کے ہوئے۔ تو اگر چنا دینا چاہے تو اڑھائی آنے کے جس قدر چنے آتے ہوں اتنے چنے دینے چاہئیں۔ اسی طرح چاول بھی۔ اور مطلقاً مضاعف دینے میں تو کبھی تو واجب سے زیادہ دیئے جاویں گے تو مضائقہ نہیں، لیکن اگر کبھی کم کر دیئے گئے تو واجب کا ایک جزو اس کے ذمہ رہ جاوے گا۔ مثلاً اگر کبھی گیہوں آٹھ سیر ہوئے اور چنے چوبیس سیر تو مسئلہ مذکور کی بنار پر چھ سیر چنے واجب ہوں گے اور مشہور خیال کے حساب سے یہ شخص چار سیر دے گا تو ایک ثلث واجب اس کے ذمہ رہا۔

اور قیمت چرمِ قربانی کے متعلق بھی ایک عام غلطی وہی غیر مصرف میں صرف کرنا ہے الیقاظِ سابق یہاں بھی ہے یعنی جس قدر صدقہ فطر یا قیمتِ چرم غلطی سے ادا نہیں ہوئی اس کا اعادہ ضروری ہے اور اگر نکال کر رکھنے کے بعد ضائع ہوجاوے پھر ادا کرنا ہوگا۔

حج کے بارے میں کوتاھیاں

(اصلاح معاملہ بہ حج)

منجملہ ارکانِ اسلام کے ایک فریضۂ حج ہے جو بنسبت دوسرے ارکان کے اپنی ایک خاص شان کی وجہ سے زیادہ اہتمام کے قابل ہے وہ شانِ خاص ... یہ ہے کہ اس کی تکمیل کے لئے جس قدر سامان درکار ہے اس کا ہر وقت میسّر و مجتمع ہونا، گو پورا اختیاری نہیں اور اس میں موانع کا پیش آجانا چنداں مستبعد نہیں، کیونکہ مال بھی زیادہ چاہئے اور ہمت و قوت بھی زیادہ چاہئے وقت و فراغ بھی زیادہ چاہیئے۔

اگر ایک سال تساہل کیا آئندہ سال تک امورِ مذکورہ میں کلاً یا بعضاً تغیر ہوجانا زیادہ بعید نہیں، یہ مجموعی شان دوسرے ارکان میں نہیں اسی واسطے احادیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جو کوئی حج کرنا چاہے وہ بہت جلدی کرے اور عجب نہیں کہ اسی شانِ خاص کے سبب یہ عمر بھر میں ایک ہی بار فرض کیا گیا ہے، اور گو اہل مکہ اور اس کے قرب و جوار والوں کے لئے یہ اشکال نہیں، مگر بمقابلہ آفاقیوں کے ان کی تعداد ہی کیا ہے؟ قواعدِ انتظامیہ میں اکثری حالات پر مبنی ہوا کرتے ہیں اور چونکہ اس میں افعال بھی متکثر و متعدد و مختلف ہیں اور متعلق

ہیں۔ امکنۂ خاصہ و ازمنہ خاصہ کے ساتھ اور اس اعتبار سے بھی یہ دوسرے ارکان سے ممتاز ہے اس لئے اس کے احکام و مسائل بھی لوگوں کو کم معلوم ہیں اور ان کا چرچا بھی کم ہے امرِ اوّل کے سبب اس میں عملی کوتاہی زیادہ واقع ہوتی ہے اور امرِ ثانی کے سبب علمی کوتاہی زیادہ ہوتی ہے۔

★ — عملی کوتاہی تو یہ ہے کہ اس کے ادا میں لوگ سستی بہت کرتے ہیں وہمی ضروریات و خیالی تعلقات سے فارغ ہونے کے منتظر رہتے ہیں کہ فلاں کام سے فارغ ہو کر چلیں گے، پھر اس کام کے بعد دوسرے کام کا اسی طرح انتظار رہتا ہے۔ حالانکہ یہ سلسلہ عمر بھر منقطع نہیں ہوتا۔ بقولِ شاعر ؎

لا ینقضی ارب الا الی ارب

وبقول شاعر ؎

ہر شبے گویم کہ فردا ترک ایں سودا کنم
باز چوں فردا شود امروز را فردا کنم

اس کا علاج یہی ہے کہ بیچ ہی میں سارے کام چھوڑ کر اور ظاہراً سرسری طور پر ان کا انتظام کر کے اور باطناً خدا کے حوالے کر کے چل کھڑا ہو، اور اس علاج کی ہمت باندھنے کے لئے ان وعیدوں کو یاد کرے جو باوجود فرضیت کے اس کے ترک پر آئی ہیں، قرآن مجید میں ایسے ترکِ حج کو کفر سے تعبیر فرمایا ہے، اور حدیث شریف میں یہودیت و نصرانیت کی حالت پر موت آجانے کی برابر بتلایا ہے اس سے زیادہ کیا وعید ہوگی ؟؟

اگر فکرِ تعلقات زیادہ مشوش کرے تو یوں سوچے کہ اگر میں ابھی مر جاؤں تو اس تمام کارخانہ کا کیا انتظام ہو؟ تو سفر کرنا موت سے تو بڑھ کر نہیں، اس وقت ہمیشہ کے لئے ان سب کو چھوڑ دیتا اب تھوڑے روز کے لئے چھوڑنے پر دل کو سمجھا لے اپنے دل کو سمجھا لینا ہی کیا مشکل ہے؟ اور وہ بھی مہتم بالشان ضرورت کے لئے!

اور علمی کوتاہیاں بکثرت ہیں مگر بعض تو عین موقع کے متعلق ہیں ان کا تو عام کو پہلے سے سمجھنا اور یاد رکھنا دونوں تکلف سے خالی نہیں، اس کی تدبیر بجز اس کے کچھ نہیں کہ وہاں

پہنچ کر مطوّف ایسے شخص کو مقرر کیا جاوے جو احکامِ حج سے پورا آگاہ اور اپنے تدین کی وجہ سے اپنے حجاج کے افعالِ حج کا پورا نگران اور مطلع کر دینے والا ہو اکثر لوگ مطوفین کو اپنی دنیوی آسائش کے لئے مقرر کرتے ہیں، دنیوی حوائج تو کسی نہ کسی طرح پورے ہو جاتے ہیں۔ زیادہ ضرورت تو دینی حاجت کے انتظام کی ہے، سو جب حج کو جانے لگے جو علماء حج کر آئے ہیں اول ان سے دربارۂ تعیینِ مطوّف مشورہ کرے ورنہ ناواقفی سے بعض ایسی غلطیاں ہو جاتی ہیں کہ حج ہی فاسد یا کالفاسد ہو جاتا ہے۔

اور چونکہ علماء کو بھی ہر وقت مسائل حج کے مستحضر نہیں رہتے اس لئے ان کے لئے بھی مناسب ہے کہ مناسک کے معتبر رسالہ خواہ کسی زبان میں ہوں سفر میں ہمراہ رکھے اور ان کا مطالعہ کرتے رہیں۔ اور پھر بھی جہاں اشتباہ واقع ہو وہاں کے علماء حاذقین سے پوچھ لیں کہ ان کو یہ احکام زیادہ مستحضر رہتے ہیں اور پوچھنے میں عار نہ کریں اور دوسروں کو اس وقت بتلاویں جب پورا اطمینان ہو، ورنہ وہاں کے علماء کے حوالہ کر دیں اور جو ان کی زبان نہ سمجھے وہ بذریعہ اپنے مطوّف، یا کسی اپنے ہم وطن بھائی کے جو وہاں مدت سے مقیم ہو اور ترجمہ کر سکے دریافت کر لے

یہ تو بیان تھا ان علمی کوتاہیوں کے متعلق جن کا عین موقع پر صدور ہوتا ہے، بعض علمی کوتاہیاں وہ ہیں جن کا صدور قبل سفر ہوتا ہے اور بعض ان میں باوجود امر شرع اس سفر سے مانع ہو جاتی ہیں اور بعضے باوجود نہی شرع اس سفر پر باعث ہو جاتے ہیں چنانچہ ہر ایک میں نظر کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے۔

حج کے لئے سفر مدینہ ضروری نہیں

★ — سو ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض لوگ سفر حج کو اس وقت فرض سمجھتے ہیں جب مدینہ منورہ کے سفر کے لئے بھی وسعت ہو، اور اگر اتنا خرچ ہو کہ صرف حج کر سکتا ہے مدینہ طیبہ نہیں جا سکتا، تو یہ لوگ اس حالت میں حج کو فرض نہیں سمجھتے۔

سو سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ سخت غلطی ہے، مدینہ طیبہ کا سفر ایک مستقل طاعت ہے، واجب ہو یا مستحب علی اختلاف الاقوال، خواہ روضۂ منورہ کے قصد سے جیسا کہ جمہور کا

قول منصور ہے یا صرف مسجد نبوی کے قصد سے جیساکہ بعض قائل ہوئے (اور یہ مقام اس مسئلہ کی تحقیق کا نہیں ہے، "نشر الطیب" کی ستائیسویں فصل کے آخر میں بقدرِ ضرورت اس کو لکھ دیا گیا ہے)

بہرحال سفرِ مدینہ کی استطاعت پر فرضیت حج کی موقوف نہیں ہے، اگر صرف سفرِ حج کی استطاعت رکھتا ہو اور سفرِ مدینہ کی استطاعت نہ رکھتا ہو اس کے ذمہ حج فرض ہے اگر نہ کرے گا تو تمام ان وعیدوں کا مورد ہوگا جو ترک حج پر آئی ہیں، باقی حج کے بعد اگر کچھ سامان سفرِ مدینہ کا ہو جاوے گا یا پیادہ چلنے کی ہمت ہو جاوے جیسا شوق کے غلبہ میں ایسا ہو جاتا ہے، تو اس شرف کو بھی حاصل کرے، ورنہ سرِ دست واپس آجائے اور عزم رکھے کہ خدا تعالیٰ توفیق دے گا تو مستقل سفرِ مدینہ کا کرلوں گا اور جب سامان ہوجاوے ایسا کرے بھی۔ اور اگر عمر بھر بھی سامان نہ ہوا تو ان شاء اللہ تعالیٰ اس تمنا و عزم کا اجر بھی اس سفرِ مبارک کے اجر کے قریب قریب ہی ہوگا، جیسا کہ چند حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ فعل خیر کی نیت بھی اجر میں مثل فعلِ خیر ہی کے ہے۔

★ — اور ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض اوقات اس شخص کے پاس مالِ حرام اس مقدار میں جمع ہو جاتا ہے کہ حج کو کافی ہو، مگر یہ سمجھتا ہے کہ یہ تو مالِ حرام ہے اس کا حج میں خرچ کرنا اور بھی زیادہ برا ہے اور مالِ حلال میرے پاس اس قدر ہے نہیں اس لئے میرے ذمہ حج فرض نہیں، اور یہی خیال بعض لوگوں زکوٰۃ میں بھی ہے پس یہ لوگ نہ حج کرتے ہیں نہ زکوٰۃ دیتے ہیں!!

سو خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ مدارِ فرضیت حج و زکوٰۃ کا خاص مقدارِ مال کا مالک ہونا ہے اس کے حلال ہونے کو فرضیت میں دخل نہیں، اس لئے ایسے شخص کے ذمہ حج اور زکوٰۃ دونوں فرض ہیں، البتہ حرام مال سے جو حج ہوگا وہ مقبول نہ ہوگا، لیکن فرض ادا ہوجائے گا۔ یعنی اس شخص پر مواخذہ نہ ہوگا کہ حج کیوں نہیں کیا، گو یہ مواخذہ ہو کہ مال حرام کیوں جمع کیا؟ اور اس سے کیوں منتفع ہوا؟ سو ادا ہو جانا اور چیز ہے اور قبول ہونا دوسری چیز، اگر قبول ہونا بھی چاہتا ہے اور بجز اس مال حرام کے اس کے پاس اور کچھ

نہ ہو تو ایسا کرے کہ کسی کافر سے قرض لے کر اس کو حج کے لئے الگ رکھے، پھر خواہ وہ قرضہ لگے ہی دن خواہ تھوڑی ہی دیر کے بعد اس مالِ حرام سے ادا کر دے۔ تو یہ روپیہ قرض لیا ہوا اس کی نسبت غنیمت ہوگا، اور بعضے جو کہا کرتے ہیں کہ دوسرے کے روپیہ سے بدل لے سو اگر ہاتھ در ہاتھ بدلا تو وہ بدلے کا روپیہ بھی ایسا ہی حرام ہو جاوے گا جیسا اصل کے پاس کا روپیہ تھا، دست بدست لینے کا اور حکم ہے اور قرض لے کر پھر ادا کرنے کا اور حکم ہے۔ اور اس تدبیر کا بتلانے کا یہ مطلب نہ سمجھا جائے کہ مالِ حرام جمع کرنے کی اجازت دی جاتی ہے یا ایسا کرنے کے بعد مالِ حرام جمع کرنے کا گناہ اتر گیا یا اس کے تدارک کی شرعاً ضرورت نہ رہی، حاشا و کلا ہرگز یہ مطلب نہیں حرام مال لینے کا جو گناہ ہے وہ اب بھی باقی ہے اور اس کا تدارک اب بھی واجب ہے یعنی جن لوگوں کا وہ حق ہے ان کو واپس کرنا جس کا مستحق نہ ملے اس کے ورثہ کو دینا اور جہاں معلوم نہ ہو اس قدر مال ان مستحقین کی طرف سے مساکین کو دے دینا اور اس سے سب کے ساتھ توبہ و استغفار کرنا اور اگر بالفعل تدارک پر قادر نہ ہو تو اس کی فکر میں رہنا اور جتنی جتنی گنجائش ہوتی جائے اتنا اتنا ادا کرتے رہنا یہ سب واجب ہے۔

غرض اس حیلہ سے حرام و حلال کے احکام نہیں بدل گئے یا رفع نہیں ہو گئے مقصود اس سے اس امر پر متنبہ کرنا ہے کہ یہ لوگ جو حج و زکوٰۃ اپنے ذمہ فرض نہیں سمجھتے یہ ان کی غلطی ہے۔

یہ دو علمی غلطیاں تو وہ ہیں جن میں حج کے امر شرعی کے ممانعت کی جاتی ہے۔

بھیک مانگ کر حج کرنا

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض لوگ جن کے پاس نہ تو حج کا سامان ہے اور نہ قلب میں غنا اور قوت توکل ہے مگر لوگوں سے بھیک مانگ کر ان کو پریشان کر کے حج کو جاتے ہیں سو اس طرح حج کو جانا حرام ہے۔

بغیر محرم کے حج کرنا

ایک کوتاہی بعض عورتوں کی یہ ہے کہ باوجود شوہر یا محرم کے ہمراہ نہ ہونے کے پھر حج کو جاتی ہیں اور گو بعض کو ائمہ کی قول پر بعض خاص قیود و شروط کے ساتھ اس کی گنجائش ہے لیکن اوّل تو عوام کو ایسی بے قیدی کی اجازت نہیں کہ جس وقت جس کا قول دل چاہا لے لیا دوسرے جانے والیاں ان قیود و شرائط کو نہ جانتی ہیں، نہ ان کی پرواہ کرتی ہیں. ہر حال میں چلی جاتی ہیں جو کہ ان ائمہ کے نزدیک بھی جائز نہیں۔

تیسرے اس وقت اتنا فساد نہ تھا ثقہ عورتوں کے ساتھ امن غالب تھا اور اس زمانہ میں فساد اس قدر غالب ہے کہ عورتوں کے ہوتے ہوئے بھی شریر طبیعتیں شرارت سے نہیں چوکتیں پھر تعاون و ہمدردی کم ہوتی جاتی ہے اگر بیماری وغیرہ پیش آ گئی تو کم عورتوں سے امید ہے کہ اپنا کام چھوڑ کر ان کی امداد کریں اکثر لوگوں کو خصوصًا ضعفاء و نسوان کو نفسی نفسی میں مشغول دیکھا ہے تو بوجہ مجبوری مرد ہی امداد کریں گے تو لامحالہ اتارنے میں چڑھانے میں اجنبی مرد اس کا ہاتھ بھی پکڑیں گے کمر بھی تھامیں گے تو ایسے وقت فتن سے محفوظ رہنا جانبین کا یا ایک ہی جانب کا مشکل ہے خاص کر قلب اور عین کا فتنہ سے تو ایسے حج کی ضرورت ہی کیا ہے؟ جب شریعت اس کو حاضر ہونے کا حکم نہیں کرتی بلکہ روکتی ہے تو پھر یہ کیوں مصیبت میں پڑتی ہے؟ اگر اس عورت کو مالی استطاعت ہو اور محرم و شوہر موجود نہ ہو یا جانے پر آمادہ نہ ہو کیوں کہ اس کو شرعًا اس کا اختیار حاصل ہے تو اس میں فقہاء مختلف ہیں کہ آیا استطاعت مالی سے نفس وجوب حج کا اس کے ذمہ ہو گیا ہے یا نفس وجوب بھی نہیں ہوا پہلے قول پر اس عورت کے ذمہ حج بدل کی وصیت کرنا واجب ہو گا۔ اور دوسرے قول پر نہیں لیکن احتیاط اسی میں ہے کہ وصیت کی جائے اگر یہ وسوسہ ہو کہ اگر وصیت نافذ نہ کی گئی تو حج میرے ذمہ رہے گا، اس کا جواب یہ ہے کہ لیکن گناہ گار نہ ہوگی کیونکہ اس نے اپنے ذمہ کے واجب کو یعنی وصیت کو ادا کر دیا اب نفاذ اس کا جبکہ مال چھوڑ جائے ورثہ کی ذمہ واجب ہے اگر وہ کوتاہی کریں گے اس کا مواخذہ ان سے ہو گا۔

یہ کوتاہیاں علمی وہ ہوئیں جن پر شرائط حج سے نہی شرعی کی ممانعت کی جاتی ہے۔ ان سب کے اوپر ایک عملی کوتاہی تھی یہ سب پانچ کوتاہیاں ہوئیں، جو شرائط حج کے متعلق ہیں علاوہ ان غلطیوں کے جو نفس حج میں ہوتی ہیں جن پر مطوف عالم شفیق مطلع کر دے گا یا علماء کو کتب مناسک مطلع کر دیں گی۔ دو کوتاہیاں حج سے خارج مگر اسی سفر سے متعلق یاد آگئیں پس وہ پانچ مل کر یہ سب سات ہو جاویں گی۔

ایک کوتاہی یہ کہ بعض لوگ حج کو جاتے ہیں اور ریل میں یا جہاز میں یا اونٹ پر فرض نمازیں برباد کرتے ہیں سو انہوں نے ایک فرض تو ادا کیا اور راستے کثیر فرض فوت کئے اور اگر حج فرض نہیں تھا نفل تھا تو اور بھی غضب ہوا کہ ایک نفل کے لئے اتنے فرض گئے گذرے سو ایسے شخص کو حج کرنا جائز بھی نہیں۔

ایک کوتاہی جو باعتبار تعدیہ ضرر کے سب سے اشنع و اقبح ہے یہ کہ بعض لوگ حج کر کے آتے ہیں اور وہاں کے مصاعب اور مصائب اس طرح سے بیان کرتے ہیں کہ سننے والا حج کو جانے سے ڈر جائے ایسے شخص کے یصدون عن سبیل اللہ (یہ لوگ اللہ کے راستے سے (لوگوں کو) روکتے ہیں) کے مصداق ہونے میں کیا شبہ ہے؟ اور اگر وہ شکایات غیر واقعی ہوں چنانچہ اکثر یوں ہی ہوتا ہے کہ بات بہت بڑھا کر کہا جاتا ہے اور نیز اس مصیبت کی بنیاد کو تو ضروری ہی غلط ظاہر کیا جاتا ہے جس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اکثر ایسے واقعات کا سبب اپنی حماقت ہوتی ہے تو اپنی حماقت کون بیان کرتا ہے؟ تو اس طور پر وہ شکایات یا ان کے بعض اجزاء غیر واقعی ہوتے ہیں تو اگر ایسا ہو تو یہ لوگ یصدون عن سبیل اللہ کے ساتھ ویبغونہا عوجًا کے بھی مصداق ہوں گے اور چونکہ باوجود علم واقعہ کے غصہ میں ایسا کرتے ہیں اس لئے جملہ وانتم شھداء کے بھی یہ مخاطب ہوں گے اور اس کے جواب میں ان کو بھی وہی کہا جائے گا۔ وما اللہ بغافل عما تعملون۔

اور عجیب لطیفہ یہ ہے کہ یہ آیت جس کے جملہ اس حالت آخیرہ کی تقریر میں جا بجا نقل کئے گئے ہیں قرآن مجید میں بھی بعد ذکر حج کے متصل وارد ہے اور مجھ کو بھی حج ہی کے اس خاص مضمون کے ساتھ یاد آئی تو قرآن مجید میں یہ اتصال میرے اس استدلال کا ایک خاص لطافت کے ساتھ مؤید ہو گیا اگر مصائب واقعی بھی ہوں تب بھی یہ سمجھنا چاہیئے کہ

یہ سفرِ عشق ہے محبوب کے دربار میں حاضری دینے کے لئے تو سفرِ عشق میں خار بھی گل اور زاغ وزغن بھی بلبل معلوم ہونا چاہیئے ونعم ما قیل ؎

ای دل آں بہ کہ خراب از مئے گلگون باشی
بی زر و گنج بصد حشمت قارون باشی
در رہ منزل لیلیٰ کہ خطرہاست بجان
شرط اول قدم آن است کہ مجنوں باشی

وصلی اللہ علی سید المرسلین الذی
ولد وزہ فی اذبار الامین

قربانی سے متعلق کوتاہیاں

(اصلاح معاملہ بہ قربانی)

جس طرح ملحقات زکوٰۃ میں سے صدقۂ فطر ہے جس کے متعلق پہلے بقدر ضرورت مضمون لکھا جاچکا ہے، اسی طرح اس کے ملحقات میں سے قربانی بھی ہے انقلاب کے اثر میں مثل دیگر اعمال دینیہ کے یہ بھی شریک اور اس حیثیت سے واجب الاصلاح ہے۔

اس میں ایک کوتاہی جو راس التنزلیات ہے یہ ہوتی ہے کہ بعض لوگ باوجود وسعت اور وجوب کے قربانی نہیں کرتے بلکہ بعض خاندانوں میں کئی پشت سے قربانی نہیں ہوئی، بلکہ بعض دیہات کے لوگ، اس کو جانتے تک بھی نہیں۔ بعض سستی و بی پروائی کے سبب نہیں کرتے۔ بعض بخل کے سبب کوتاہی کرتے ہیں۔

پس اگر سبب اس کا ناواقفی و بے خبری ہے تو اس کی اصلاح یہ ہے کہ ان کو اس کے وجوب سے اور ترک پر جو وعید ہے جیسا ابن ماجہ میں حدیث مرفوع ہے من وجد سعۃ ولم یضح فلا یقربن مصلانا (یعنی جس کے شخص کے پاس قربانی کرنے کی گنجائش ہو اور پھر بھی وہ قربانی نہ کرے تو ایسا شخص ہرگز ہماری عیدگاہ میں نہ آئے) اس

پر ان کو اطلاع دی جائے بالخصوص واعظین وخطبا، یا ان اہل علم کو جو دیہات میں وعظ وتبلیغ کی غرض سے جاتے ہیں، ضرور ہے کہ وہ دیہات کے لوگوں کو جب کہ وہ جمعہ میں حاضر یا خود دیہات میں جاتے ہیں اس کے وجوب پر بلکہ اس کے متعلق ــــ احکام پر بھی آگاہ کردیں۔

بعض باوجود اس قدر وسعت کہ جس پر قربانی واجب ہوتی ہے اپنے ذہن میں اسے اس لئے سبکدوش سمجھے ہوئے ہیں کہ ان کو اس وسعت کی مقدار معلوم نہیں، تو ان کو اس سے آگاہ کیا جائے کہ جس کے پاس حوائج ضروریہ سے زائد تخمیناً پچاس روپیہ نقد یا مال تجارت یا زیور یا جائیداد و مکانات علاوہ مکان سکونت وکفایت معاش سالانہ کے موجود ہو، پس اتنی وسعت پر قربانی واجب ہوجائیگی ۔ خواہ مرد ہو یا عورت البتہ بچوں پر یا بچوں کی طرف سے واجب نہیں۔

اور اگر بے پروائی اس کا سبب ہے تو ان لوگوں کو غور کرنا چاہیئے کہ دنیا کی جلب منافع ودفع مضار کے لئے اگرچہ وہ درجہ ضرورت میں نہ ہوں اور اگرچہ وہ موہوم بھی ہوں، کس قدر روپیہ موقع پر بلکہ ہر روز ہی خرچ کیا کرتے ہیں اور پھر وہ فانی تو کیا آخرت کے اتنے بڑے ثواب کی تحصیل کے لئے کہ اس سے زیادہ کوئی منفعت نہیں اور اتنے بڑے گناہ و عذاب سے بچنے کے لئے کہ اس سے بڑھکر کوئی مضرت نہیں اور پھر دونوں یقینی اور باقی اور ضروری الرعایت بے پروائی اور سستی کی جائے کتنی بڑی نادانی ہے۔

اور اگر سبب اس کا بخل ہے تو فوری علاج تو اس کا ان ہی منافع ومضار کا استحضار ہے جس کا ابھی بیان ہوا اور باقاعدہ علاج اس کا یہ ہے کہ مادہ بخل کا استیصال کیا جائے جس کی تدبیریں کتب فن میں ملیں گے۔

قربانی کے عبادت ہونے میں شبہ

بعض لوگوں کو اس سے بڑھ کر ایک سبب اس ترک کا ہوگیا ہے کہ وہ اس کے عبادت ہونے میں شبہ کرتے ہیں بالخصوص حج کی قربانی کو بوجہ کثرت ذبائح محض اضاعت مال ہی سمجھتے ہیں ان کی اصلاح یہی ہے کہ وہ علماء محققین سے اپنی تسلی مفصل شبہات

پیش کر کے کرلیں۔

مجمل یہ ہے کہ عبادت کی حقیقت امتثال امر الٰہی ہے جب اس کا مامور بہ ہونا ثابت ہے پھر عبادت ہونے میں کیا شک ہے۔

رہا یہ سوال کہ امر الٰہی کس حکمت سے ہوا گو ایسے سوالات کے جوابات میں اس وقت خاص دلچسپی سے کام لیا جاتا ہے، مگر سچا جواب یہ ہے کہ یہ سوال ہم سے پیش نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ہم بانی قانون نہیں جو قانون کی لم جاننے کے مدعی ہوں ہم ناقل و حاکی قانون ہیں جب واضع قانون کے روبرو کھڑے کئے جائیں گے اگر ہمت ہوگی پوچھ لینا پھر جو جواب ان کے نزدیک مصلحت ہوگا عنایت کر دیں گے خواہ تقریر و مقال سے، خواہ تعذیر و نکال سے۔

دفعات قوانین کی علل وکلاء یا مجسٹریٹ و جج سے پوچھنا سخت نادانی ہے۔ اگر کوئی پوچھے بھی ان کو یہ جواب دینے کا حق ہے کہ واضعان قانون سے پوچھو ہم اس کے ذمہ دار نہیں تو علماء ایسے سائلوں کو ایسا جواب کیوں نہیں دے سکتے اور جب دے سکتے ہیں تو کیوں نہیں دیتے؟ کیوں سائل کی بے محل فرمائش کا اتباع کرتے ہیں؟

اسی طرح اضاعت مال کے شبہ کا جواب ہے کہ اضاعت اس وقت ہوتی ہے جب اس میں کوئی فائدہ نہ ہوتا اور جب فائدہ اس میں رضائے حق ہے جس کا مقابلہ کوئی فائدہ نہیں کر سکتا تو اضاعت کیسے ہوئی؟

سستی قربانی کی تلاش

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض وسعت والے قربانی تو کرتے ہیں تو مگر بڑی کوشش اس کی ہوتی ہے کہ کوئی حصہ سستا مل جائے گو اس میں کچھ عجیب بھی ہو مگر ایسا نہ ہو جو مانع جواز قربانی ہو اور وجہ اس کی دو ہیں۔ ایک بخل جس کا علاج اوپر گذر چکا ہے اور دوسرے یہ خیال غیر واقعی کی قیمت کے بڑھنے سے یا مال کے عمدہ ہونے سے ثواب میں زیادتی نہ ہوگی بلکہ ایک حصہ میں جس قدر ثواب ہوتا ہے وہ قانون حال میں برابر ہوگا اگر زیادتی بھی ہوئی

توہم زیادتی کو کیا کریں گے ؟ پس اتنا ہی کافی ہے کہ برأت ذمہ حاصل ہو جائے اس کی اصلاح یہ ہے کہ یہ خیال بالکل غلط ہے بلکہ جس قدر مال عمدہ ہو گا یا قیمت زیادہ ہو گی ثواب زائد ہوتا جائے گا لن تنالوا البر حتیٰ تنفقوا مما تحبون (تم اس وقت تک نیکی حاصل نہیں کر سکتے جب تک اپنے محبوب اموال میں سے خرچ نہ کرو)

یعنی :۔

اور لَا تَیَمَّمُوا الْخَبِیْثَ مِنْہُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِیْہِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِیْہِ ۔ یعنی (اللہ کی راہ میں خرچ کرتے وقت خراب مال دینے کا قصد نہ کرو کہ اس سے خرچ کرو اور (جب کبھی لینے کا موقع ہو تو) تم اسے لینے والے نہیں ہو، الا یہ کہ چشم پوشی سے کام لو) اور حدیث سمنوا ضحایاکم (اپنے قربانی کے جانوروں کو فربہ کرو) اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے کہ ایک اونٹنی ذبح کی تھی جس کے تین سو دینار ان کو ملتے تھے (رواہ فی التفسیر المظہری) یہ سب دلائل واضح ہیں اس دعویٰ کے۔

اور یہ خیال کہ ہم زیادتی کو کیا کریں گے ؟ صرف برائت ذمہ کافی ہے، اس کا محل وہاں ہو سکتا ہے جہاں صرف مواخذہ سے بچنا ہو اور اس حاکم سے کوئی خاص تعلق نہ ہو نہ خاص تعلق پیدا کرنا مقصود ہو، کیا حق جل وعلیٰ شانہ کے تعلقات کے وجود یا مطلوبیت حصول کا کسی کو انکار ہو سکتا ہے، اگر نہیں ہو سکتا تو اس خیال کی گنجائش کہاں رہی ؟

حقوق العباد چھوڑ کر قربانی کرنا

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض لوگ محض نادار ہیں یا ذخیرہ سے زیادہ ان کے ذمہ حقوق العباد ہیں جن کا ادا و ایفا فرض مقدم ہے مگر یہ لوگ ان سب حقوق کو نظرانداز اور پشت افگندہ کر کے محض فخر اور وضع قدیم نباہنے کے لئے قربانی کی پابندی کرتے ہیں اور پاس نہیں ہوتا تو ادھار کرتے ہیں۔

بعض کو دیکھا ہے کہ متعدد حصص مردوں تک کے کرتے ہیں اور زندوں کے واجب حقوق کو مردہ کرتے ہیں حالانکہ یقینی بات ہے کہ دس روپیہ قرض میں ادا کرنا اس سے بہتر

ہے کہ ان دس روپے کے حصے خریدے جائیں تو اضافہ حقوق کا التزام الگ اور فساد نیت یعنی تفاخر و ترفع کا الگ۔

حضرات سلف سے اس مباہات پر انکار منقول ہے اور اس انکار کے ساتھ ان کا یہ قول بھی مروی ہے کہ ہم تو گھر بھر کی طرف سے ایک بکری ذبح کر لیتے تھے یعنی عدم وجوب کی صورت میں ایک نے اپنی طرف سے کر لی اور گھر بھر نے کھا پی لیا کیونکہ ایک حصہ تو کئی کیطرف سے ہو ہی نہیں سکتا، البتہ کوئی حق ضائع نہ ہوا اور تفاخر بھی نہ ہو تو تطوع کے مستحب اور دلیل محبت ہونے میں کوئی کلام نہیں اسی طرح عام مردوں کی طرف سے یا اپنے بزرگان دینی کی طرف سے بالخصوص حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے قربانی کرنا بھی احب المندوبات اور مقتضا ان حضرات کے حقوق کا ہے لیکن منفعت جب ہی مطلوب ہے جب اس میں کوئی مضرت نہ ہو۔

ناواقفیت سے ہونے والی کوتاہیاں

اور بعض کوتاہیاں مسائل فرعیہ فقہیہ کے نہ جاننے سے ہوتی ہیں جیسے ایسے جانور کی قربانی کرنا جو رعایا سے گھاس چرانے کے عوض میں لیا گیا ہو یا جو جانور حصہ پر کسی کو پرورش کرنے کے لیے دیا گیا تھا اور وہ اس پرورش کنندہ کے حصہ میں لگا دیا گیا پھر اس سے کسی نے خریدا یا خریدنے کے وقت کھال استثناء کر لینا یا جانور خرید کر پھر اس کو کلاً یا بعضاً دوسرے کے ہاتھ بیچ ڈالنا یا اپنا حصہ کسی سے بدل لینا یا دوسرا اول خرید کر پھر پہلا بیچ ڈالنا کہ ان استبدال کی صورتوں میں غنی اور فقیر کے احکام میں نہایت طویل تفصیل ہے یا ان سب سے بڑھکر ایک ایسی صورت میں جو ایک مقام میں سنی گئی کہ جانور ذبح کرنے کے بعد اس کا ایک حصہ ایک شخص کے نام زد کر کے اس کی قربانی کے لئے کافی سمجھا گیا یا مشترک گوشت محض تخمینہ سے تقسیم کرنا یا گوشت کے تین حصہ برابر کرنے کو واجب سمجھنا یا کھال بیچ کر کسی کی تنخواہ و اجرت میں لگا دینا، جب بعض دیہات میں امام و مؤذن کو یہی کہہ کر رکھتے ہیں کہ تم کو قربانی کی کھال بھی ملے گی یا ان داموں سے مسجد کے بوریئے وغیرہ خریدنا یا مسجد کی تعمیر میں لگا دینا یا اپنے خرچ میں لئے آنا کیونکہ بعد بیع چرم کے اس کی قیمت کا مصرف

مثل زکوٰۃ ہوتا ہے، یا کہیں منی آرڈر کرے بھیجنے کی صورت میں اسی میں سے فیس ادا کرنا، وغیر ذالک ان سب کی اصلاح مسائل فقہیہ کی تحقیق کرے ان کے موافق عمل کرنا چاہیئے۔

بعض دوسری مالی عبادتوں میں کوتاہیاں

(اصلاح معاملہ بہ بعض طاعات مالیہ)

مثل وقف کفارہ یمین، نذر، فدیہ، نماز، روزہ و صدقہ نافلہ وغیرہ، جس طرح زکوٰۃ کے ملحقات میں سے صدقہ فطر و قربانی ہے جن کے متعلق اس کے قبل بیان ہو چکا ہے اسی طرح اس کے ملحقات میں سے دوسری بعض طاعات مالیہ بھی حقوق اللہ میں سے ہیں جن میں سے بعض کا نام سرخی بالا کے ضمن میں ہے ترمذی کی حدیث مرفوع انّ فی المالِ لحقًّا سوی الزکوٰۃِ۔ یعنی (بلاشبہ مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی کچھ حق ہے) کے عموم میں یہ سب داخل ہیں اور چونکہ ایسی طاعات میں زکوٰۃ راس و اساس ہے اور اسی وجہ سے ان سب میں وہی شعائر و ارکان اسلام سے ہے، اور باقی سب اس کے بعد کے درجہ میں اسی بنا پر اوروں کو اس کے ملحقات میں سے کہہ دیا گیا، ورنہ یہ مقصود نہیں ہے، اور نہ یہ سمجھنا چاہیئے کہ زکوٰۃ فرض ہے اور دوسرے تطوع، یا یہ کہ جس کے ذمہ زکوٰۃ نہ ہو اس کے ذمہ دوسرے حقوق مذکورہ میں سے کچھ نہ ہوگا، یہ دونوں حکم غلط ہیں۔ واقفان احکام جانتے ہیں کہ صدقہ فطر، قربانی، کفارۂ یمین، ایفاء نذر، فدیہ، صوم و صلوٰۃ کا بھی واجب ہے، گو وقف صدقہ نافلہ واجب نہ ہو،

اور اسی طرح بعض کے ذمہ زکوٰۃ نہیں ہوتی مگر دوسرے حقوق مالیہ واجبہ اس کے ذمہ ہوتے ہیں۔

مقصود یہ ہے کہ اعمال درجہ میں تو زکوٰۃ کے بعد میں مگر پھر بھی شرعاً مطلوب ہیں جنمیں بعض واجب اور بعض مندوب ہیں چونکہ ان میں بھی مختلف کوتاہیاں واقع ہوتی ہیں اس لئے ان پر مختصراً بقدر ضرورت متنبہ کرنا ضروری ہے چنانچہ تھوڑا تھوڑا عرض کرتا ہوں، اور حقوق اللہ اس لئے قید لگائی کہ جو حقوق مالیہ منجملہ حقوق العباد میں وہ از قبیل معاملات ہیں جن کا یہاں ذکر نہیں ہے اس وقت صرف دیانات کا بیان ہے۔

اس میں بعض کوتاہیاں وقف کرنے والے کی طرف سے ہوتی ہیں، اور بعض منتظم اور متولی کی طرف سے اور بعض واقف کی اولاد سے بعض دوسرے اجنبی لوگوں کی طرف سے۔

چنانچہ واقف کی طرف سے ایک کوتاہی یہ ہوئی ہے کہ جس چیز کو وقف کیا ہے اس میں یہ بھی رعایت نہیں کی جاتی کہ حلال سے حاصل ہوئی ہے یا حرام سے محض تفاخر اور شہرت کیلئے نام کرنے کو یہ عمل کرتے ہیں حدیث میں صاف ارشاد ہے:

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍؓ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا يَكْسِبُ عَبْدٌ مَالَ حَرَامٍ فَيَتَصَدَّقُ مِنْهُ فَيُقْبَلُ مِنْهُ وَلَا يُنْفِقُ مِنْهُ فَيُبَارَكُ لَهٗ فِيْهِ وَلَا يَتْرُكُ خَلْفَ ظَهْرِهٖ اِلَّا كَانَ زَادَهٗ اِلَى النَّارِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَمْحُوا السَّيِّئَ بِالسَّيِّئِ وَلٰكِنْ يَمْحُوا السَّيِّئَ بِالْحَسَنِ اِنَّ الْخَبِيْثَ لَا يَمْحُوا الْخَبِيْثَ رواه احمد وكذا فى شرح السنة۔

"حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کوئی بندہ ایسا نہیں جو مال حرام کما کر اس سے صدقہ کرے اور اس کا صدقہ قبول ہو جائے، اور کوئی بندہ ایسا نہیں کہ ایسے مال سے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرے اور اس میں برکت ہو اور کوئی بندہ ایسا نہیں جو اپنے پیچھے مالِ حرام چھوڑ کر جائے، مگر وہ جہنم تک جانے کے لئے اس کا توشہ بن جاتا ہے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ بری چیز کو بری چیز سے نہیں مٹاتا، لیکن بری چیز کو اچھی چیز سے مٹاتا ہے، گندی چیز گندی چیز کو نہیں مٹاتی"

بلکہ اگر حلال بھی ہو مگر ہو تفاخر کے لئے وہ بھی غیر نافع وغیر مقبول ہے، ریار کی مذمت معلوم اور ظاہر ہے، خصوص مساجد بنانے والے اس بلا میں بکثرت مبتلا ہیں، یہی وجہ ہے کہ گو کسی جگہ مسجد قدیم موجود ہو مگر محتاج مرمت ہو لیکن اس کی مرمت نہ کریں گے۔ اور اس کو منہدم ہونے دیں گے اور اپنے نام کے لئے ایک مسجد بنا دیں گے اور یہی راز ہے اس کا اکثر بستیوں میں بکثرت مسجدیں ویران ہیں۔

ایک کوتاہی یہ ہوتی ہے کہ خود وقف ہی مقصود بالذات نہیں ہوتا بلکہ نیت صرف جائیداد کی حفاظت ہوتی ہے اور اسی کو مقصود بالذات قرار دیتے ہیں اور وقف کو اس کا ذریعہ بناتے ہیں۔

پس دین تو مقصود بالعرض ہے اور دنیا مقصود بالذات ہوئی جس کی نسبت ارشاد نبوی ہے۔

اِنَّمَا الاَعْمَالُ بِالنِّیَاتِ وَاِنَّمَا لِامْرِیٔ مَّا نَوٰی فَمَنْ کَانَتْ ھِجْرَتُہٗ اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ فَھِجْرَتُہٗ اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَمَنْ کَانَتْ ھِجْرَتُہٗ اِلٰی دُنْیَا یُصِیْبُھَا اَوِامْرَأَۃٍ یَتَزَوَّجُھَا فَھِجْرَتُہٗ اِلٰی مَا ھَاجَرَ اِلَیْہِ رواہ الشیخان۔

" بلاشبہ تمام اعمال کا مدار نیتوں پر ہے اور بیشک ہر انسان کو وہی ملے گا جس کی اس نے نیت کی ہے، پس جس شخص کی ہجرت اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف ہو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسولؐ ہی کی طرف شمار ہو گی جس کی اس نے نیت کی "

دیکھئے اس مہاجر نے ہجرت کی مگر نیت اس میں غرض دنیوی کی تھی اس لئے ثواب سے محروم رہا اور اسی قبیل سے ہے بعض اوقات وقف علی الاولاد کرنا۔

اس سے یہ مقصود نہیں کہ وقف علی الاولاد صحیح نہیں یا کسی حالت میں موجب ثواب نہیں، صحیح تو ہر حال میں ہے خواہ نیت کچھ ہی ہو، جیسا کہ نماز کو اگر کوئی تمام شرائط و ارکان کے ساتھ ادا کرے مگر نیت یہ ہو کہ لوگ ہم کو نمازی سمجھیں باجماع اہل علم نماز اس کی صحیح ہو جائے گی مگر ثواب سے محروم رہے گا، اسی طرح سے یہ وقف صحیح تو ہو ہی جائے گا۔ گو ثواب

بعض احوال میں نہ ہو اسی طرح بعض حالات میں ثواب بھی ملے گا جب مقصود اعانت اولاد کی دین کے لئے ہو۔

یعنی یہ غرض ہو کہ معاش سے مطمئن رہیں گے تو دین میں مشغول رہیں گے۔ اور کسی کے حق کا ضائع کرنا بھی مقصود نہ ہو اور اگر مقصود اولاد کی اعانت کے لئے یہ بھی شرط ہے کہ یہ ہمیشہ صاحب ثروت وجاہ رہیں گے یا یہ کہ کسی سے قرض لے کر اندیشہ ہوا کہ اب جائیداد نیلام ہو جائے گی، اس وقت وقف کی پناہ لے کر صاحب حق کا حق ضائع کیا، تو نیکی برباد گناہ لازم ہوگا اور اس سے بڑھ کر ایک دوسرے مضمر قبیح غرض ہے کہ اس کا درجہ الحاد تک پہنچتا ہے وہ یہ کہ اصل میں مسئلہ میراث کو خلاف مصلحت و خلاف حکمت اور موجب ضرر اور نامناسب اعتقاد کرتا ہے اور صریح اعتراض کرنے کو بدنامی سمجھکر ایک شرعی عمل کی پناہ لیتا ہے یعنی وقف علی الاولاد کو ترجیح دیتا ہے۔ اور قواعد میراث کو موجب تجزیہ و تضییع جائیداد خیال کرتا ہے پس مبنی اس کی اس تجویز کا ایک حکم شرعی یعنی میراث کو نامناسب اعتقاد کرنا ہی تو اس کا بد دینی ہونا ظاہر ہے اور شیطان کے کافر ہونے کا اصل سبب یہی ہے کہ اس نے ایک حکم منصوص کو خلاف حکمت قرار دیا۔ اور صرف ترک سجود ایک معصیت تھا نہ کہ کفر پس اس وقت بھی ایسے عقیدہ والوں کی تکفیر کرنے والے کو متعصب کہنا خود تعصب ہے۔ جس کے معنی باطل کی حمایت کرنا ہے نہ کہ دین کی پختگی اور تمسک شریعت کے ساتھ ..... اس وقت تصلب کا نام نافہمی سے تعصب رکھ لیا گیا ہے۔

وقف کا غلط مصرف میں استعمال

ایک کوتاہی تو یہ ہوتی ہے کہ اس کے معارف میں بعض بدعات و معاصی کو بھی جزء بناتے ہیں کہ اس کی آمدنی سے فلاں مزار پر عرس کیا جاوے، جس کا مشتمل بر بدعات کثیرہ ہونا ظاہر ہے۔ یا یہ کہ اس کی آمدنی کا ایک حصہ متعارف انگریزی تعلیم میں صرف کیا جاوے جس کا متضمن و مورث قبائح و مفاسد عظیمہ ہونا مشاہد ہے اور بعض کوتاہیاں متولی و منتظم کی طرف سے ہوتی ہے مثلاً بعض وقف کی آمدنی کو اس کے مصارف میں نہیں صرف کرتے۔

بلکہ اپنی راۓ کے موافق جائز و ناجائز سے قطع نظر کر کے جو چاہیں تصرف کرتے ہیں بعض اوقات اس کی شرائط کی مخالفت کی جاتی ہے۔ مثلاً اس میں واقف نے ایک جماعت کو مشیر قرار دیا۔ مگر جس کا زور ہوا وہی قابض ہو کر مستقل و مستبد بالرائے بن بیٹھا۔ اور دوسروں کو پوچھتا بھی نہیں۔ اور اگر واقف نے حساب داخل کرنے کی شرط لکھدی اور کوئی دباؤ بھی پڑا تو فرضی حساب تصنیف کر لیا۔ بعض اوقات اپنی دنیوی اغراض کے لئے وقف کی مصلحتیں برباد کی جاتی ہیں مثلاً کوئی خوش معاملہ کاشتکار اس متولی کی دوسری مملوکہ زمین اس شرط پر رکھتا ہے کہ وقف زمین کا ارزاں ٹھیکہ اس کو دیا جاوے اور دوسرا اجنبی کاشتکار گراں کرایہ پر لیتا ہے۔ اور وہ بھی خوش معاملہ ہے۔ مگر اس کو دینے میں اس کی مملوکہ زمین چھوٹتی ہے۔ تو یہ شخص محض اپنے مصلحت کے لئے وقف کا نقصان کرتا ہے۔ بعض اوقات یہ منتظم تمام آمدنی اس کی خود ہی کھاجاتا ہے۔ پھر کبھی تو اول ہی سے نیت اس کی ادا کی نہیں ہوتی۔ اور کبھی اوّل میں نیت اچھی ہوتی ہے۔ مگر پھر ٹلتے ٹلتے تساہل ہو کر بے فکری ہو جاتی ہے اور وہ رقم ضائع ہو جاتی ہے .... بعض متولی منافع سے متجاوز ہو کر خود رقبہ وقف میں تصرف باطل کرتے ہیں۔ کبھی خوش نیتی سے مگر جہل احکام کے سبب اور کبھی بدنیتی سے اول اس طور سے مثلاً اس وقف کے اچھے دام ملتے ہیں۔ اور اس کی نیت یہ ہے کہ کہ ان داموں سے اور اچھی زمین لے کر اس کو وقف کر دیں گے۔ پھر کبھی کبھی وہ روپیہ بھی ضائع ہو جاتا ہے۔ اور وہ وقف مفت میں برباد ہوتا ہے یا اس کے عوض اس سے اچھی زمین ملتی ہے حالانکہ وقف کا مبادلہ بالکل باطل ہے البتہ جہاں اس کا انکار ہی نہ چلے تو بالکل چھوڑ دینے سے بدل ہی لے لینا کافی ہے۔ اور اس طور سے کہ اس پر مالکانہ تصرف کرنے لگے۔ حتیٰ کہ کبھی اس کو رہن یا بیع بھی کر دی۔ ہزاروں اوقاف ان خائنوں کے بدولت بے نام و بے نشان ہو گئے یا اگر معلوم بھی ہے تو ان کا استخلاص بوجہ رقم کثیر و وقت کثیر کے صرف پر موقوف ہونے کے دشوار ہو گیا ہے۔

افسوس ہے بعض مسلمانوں نے مسجدوں کے ساتھ استعمالاً و بیعاً گھروں کا سا معاملہ کر لیا ہے اور بعض کوتاہیاں اولاد واقف کی طرف سے ہوتی ہے اور وہ کوتاہیاں وہ سب

ہیں۔ جو ابھی منتظم کی کوتاہیوں کی فہرست میں مذکور ہوئیں۔ اور بعض ان سے زائد بھی ہیں۔ اور زائد پر قادر ہونے کا سبب یہ ہو جاتا ہے کہ عرفاً اولاد واقف کو عام لوگ بہ نسبت اجنبی متولی کے وقف میں تصرف کرنے کا زیادہ مستحق سمجھتے ہیں مثلاً لوگوں کو ایسے قبرستان میں دفن کرنے سے روکنا یا کسی کو اپنے باپ دادا کی بنائی ہوئی مسجد میں نہ آنے دینا یا اس کی شکستگی کی حالت میں خود توبوجہ عدم استطاعت کے اس کی مرمت نہ کرسکنا۔ یا بے پروائی کے سبب نہ کرنا۔ اور اوروں کو بوجہ عار اور سبکی کے اجازت نہ دینا حتیٰ کہ وہ اسی طرح اول منہدم ہو جاتی ہے پھر یہی لوگ اس کا ملبہ بیچ کھاتے ہیں حتیٰ کہ وہ منہدم ہو جاتی ہے پھر اس کی زمین بیچ لیتے ہیں خواہ اس میں مجالس فسق ہونے یا کوئی غیر مسلم اس میں گھر بنا کر یا خانہ تک پھرا کرے جو عار اس فضیحت کا سبب ہوئی ہے، اسی کے حق میں کہا جا سکتا ہے

اختار النار علی العار

عار کے مقابلہ میں آگ کو اختیار کر لیا

بعض کوتاہیاں عام اجنبی لوگوں کی طرف سے ہوتی ہیں مثلاً ایک یہ کہ مسجد میں کسی ظالم کا تصرف دیکھ کر یہ رائے گھڑ لینا اور اپنی طرف سے فتویٰ دے لینا کہ اب یہ مسجد ہی نہیں رہی، اس میں ویسا ثواب نہیں ہوگا، یا یہ کہ اس میں اذن عام نہ رہا اس لئے یہاں جمعہ درست نہیں، اور یہ تجویز تراش کر دوسری مسجد کے بنانے کا سامان شروع کر دینا جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو دوسری مسجد آباد نہیں ہوتی، یا پہلی ویران ہو جاتی ہے اور آئے دن کے جھگڑے رہتے ہیں وہ الگ، خود یہ مسئلہ ہی سمجھنا غلط ہے۔ کہ ظالم کے تصرف سے وہ مسجد نہیں رہی یا اذن عام باطل ہو گیا۔ مسجد مسجد ہی ہے اور وہ ظلم اس کا مخلِ اذن عام نہیں ہے۔ اذن عام کا شرط ہونا ارض مملوکہ میں ہے نہ کہ ارض موقوفہ میں، وہاں شریعت کا اذن عام ہے جس کو کسی کا ظلم زائل نہیں کر سکتا، بجائے اس مسئلہ تراشنے کے اس ظلم کو بشرط قدرت روکنا چاہیئے۔ اور وقف کی حفاظت چاہیئے اور مثلاً ایک یہ کہ وقف کو برباد ہوتے ہوئے . . . . دیکھتے ہیں۔ اور وجود قدرت کا التفات نہیں کرتے، کہتے ہیں کہ ہم کو کیا غرض پڑی ہے صاحبو! کیا دین بھی ایسی چیز ہے کہ جس کی نسبت

بی غرض کا دعویٰ کیا جاوے۔ ہم کو تو بہت بڑی غرض ہر وقت ثواب کی پڑی ہے۔ ہاں قدرت نہ ہونے پر مجبوری ہے اور مثلاً ایک یہ کہ بعض لوگ جو مصرف اس وقف کے نہیں ہیں وہ بھی اس سے منتفع ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک مسافر خانہ خاص ساکین کے لئے بنایا گیا مگر اس میں اغنیاء امراء بھی بوجہ بخل کے قیام کرتے ہیں جو کسی طرح جائز نہیں نیز ہر طبقہ کی طبقات مذکورین سے اور بھی کوتاہیاں ہیں مگر نمونہ کے لئے انشاء اللہ اس قدر بھی کافی ہے ان ہی محذورات کو دیکھ کر بعض دانشمندوں کی رائے یہ ہونے لگی ہے کہ اکثر اوقات ایسے اوقاف سے تو یہی بہتر ہے کہ بجائے وقف کرنے کے اس جائیداد وغیرہ کو بیچ کر اس کے دام اپنے ہاتھ سے کسی نیک کام میں صرف کر دے لیکن یہ ایک رائی ہے جس کا منشاء ایک تعلق طبعی ہے کوئی حکم شرعی نہیں خائنوں کی خیانت وقف کے مرغوب فیہ ہونے میں مخل نہیں ہوسکتی واقف کو بوجہ نیت کے بقاء ذات وقف تک باقیات باقیات صالحات کا ثواب ملتا رہے گا۔ سے انتفاع منقطع ہو جائے۔

ساری جائیداد وقف کر دینا

ایک کوتاہی اور ہے کہ رنگ اس کا عبادت ہے۔ مگر اس کے آثار پر نظر کر کے شریعت نے اس کو پسند نہیں کیا، یہ ہے کہ کوئی شخص جس کا قلب متحمل تنگی و تہیدستی کا نہ ہو اپنی تمام جائیداد یا متاع کو وقف کر دے۔ بعض صحابہؓ نے جوش سخاوت میں ایسا ارادہ کیا بھی تھا مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا چنانچہ حدیث میں امسک علیک بعض مالک (اپنے پاس اپنا کچھ مال روک رکھو) مصرح ہے اور راز اس میں یہ ہے کہ بعض اوقات ناداری میں وساوس پریشان کرتے ہیں کہ تو نے سب دیدیا اگر کوئی حاجت پیش آئی اور آمدنی کی کوئی سبیل نہیں، تو کہاں سے کام چلے گا۔ ان وساوس کا بعض اوقات اس قدر ہجوم ہوتا ہے کہ نماز وغیرہ میں خرابی پڑنے لگتی ہے بعض اوقات نیت ڈانوا ڈول ہو کر غیروں کے مال پر نظر پڑنے لگتی ہے۔ بعض اوقات حرام ذرائع کا قصد کرنے لگتا ہے۔ چوری کا جھوٹے مقدمے جھوٹی گواہی کا، کسی سے قرض لے کر مار لینے کا ونعوذ باللہ
اور اگر ان وساوس کے بعد اتفاق سے کوئی کلفت و تنگی بھی پیش آگئی تو وہ وساوس

اس وقت عمل کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ اور معاصی کا صدور ہونا شروع ہوتا ہے جس سے آخرت کا خسارا تو ظاہر ہی ہے۔ بعض اوقات کسی جرم قانونی کا مرتکب ہو کر گرفتار بلا بھی ہوتا ہے یہ دنیا کی مغفرت ہوئی تو وقف کرنے سے اتنی خیر نصیب نہ ہوئی تھی جس قدر اس سے شر پیدا ہوا۔ تو شریعت مطہرہ نے جو اس سے روکا ہے تو واقع میں خیر سے نہیں روکا۔ بلکہ ان شرور سے (جن پر شریعت کی نظر پڑی) وہ ہماری نظر سے مستور ہے۔ روکا ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد اپنے عموم سے ان صورتوں کو بھی شامل ہے۔ عَسٰی ان تحبّوا شیئًا وّھو شرٌّ لکم واللّٰہ یعلم وانتم لا تعلمون۔

تجربہ سے معلوم ہوا کہ اصلی مفلس کو افلاس سے اس قدر پریشانی نہیں ہوتی جس قدر فقیر بعد الغنیٰ کو کیوں کہ وہ پہلے سے اس کا خوگر ہوتا ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے وَارحَمُوا ثلٰثۃ وعَدَّ منھُم غَنِیُّ قوم افتقر (تین آدمیوں پر رحم کرو) اور ان میں سے ایک اس شخص کو بھی شمار کیا جو "کسی قوم میں مالدار آدمی تھا، لبعد میں فقیر ہو گیا)

ہمارے حضرت مرشد رحمۃ اللہ علیہ سے ایک صالحہ بی بی نے اپنی جائیداد کی نسبت ایسی ہی رائے ظاہر کر کے مشورہ طلب کیا۔ حضرتؒ نے فرمایا۔ بھائی ایسا مت کرنا، آدمی کو اپنے نفس کی تسلی کے لئے بھی کچھ رکھنا ضروری ہے۔ اور اسی نکتہ کے سبب حضرتؒ ضعیف القلوب و مالوف بالاسباب لوگوں کے لئے اسباب و تعلقات مثل تجارت و نوکری وغیرہ کے ترک کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ بعض اوقات یہ مفاسد مذکورہ اس درجہ پر نہیں پہنچتے، مگر اتنا ہوتا ہے وقف کر کے پچھتاتا ہے کہ میں نے یہ غلطی و ناعاقبت اندیشی کی، تو اس خیر کا کیا ثواب مل سکتا ہے جس کو کر کے پچھتاوے اور افسوس کرے؟ البتہ جو خود بھی قلب قوی رکھتا ہو اور اس کے اہل و عیال یا تو ہوں ہی نہیں۔ یا اگر ہوں تو وہ بھی اس شخص کے ساتھ اس میں متفق اور راضی ہوں اور اس کو بھی قرآئن سے شہادت قلب مظنون ہو کہ یہ پھر بھی پریشان نہ ہوں گے اور پریشان نہ کریں گے۔ ایسی حالات میں تمام سرمایہ کا وقف کر دینے کا بھی کوئی مضائقہ نہیں بلکہ عزیمت اور ہمت کی بات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جناب صدیق اکبرؓ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں تمام نقیر و قطمیر جو کچھ ان کی

ملک میں تھا۔ سب لے آئے۔ اور آپ نے اس کو بطیب خاطر جائز رکھا۔ اور اس عمل پر مدح میں وحی نازل ہوئی وَسَیُجَنَّبُهَا الْاَتْقَی الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَکّٰی الآیۃ۔ (جہنم سے بچالیا جائے گا، اس متقی ترین شخص کو جو اپنا مال دیتا ہے پاک صاف ہوتے ہوئے) ورنہ جس کو یہ قوت نہ ہو اس کے لئے یہ مشورہ وارد ہے۔ افضل الصدقۃ ما کان عن ظہر غنیً او کما قال (افضل صدقہ وہ ہے جو اپنے پیچھے مالداری چھوڑ جائے) اور قوی کے لئے یہ وارد ہے (اَنْ تَصَدَّقَ وَاَنْتَ صَحِیْحٌ شَحِیْحٌ تَخْشَی الْفَقْرَ وَتَاْمُلُ الْغِنٰی او مثل ذالک (تم اس حالت میں صدقہ کرو کہ تندرست ہو، مال کی رغبت کرنے والے ہو، فقر سے ڈرتے اور مالداری کی امید رکھتے ہو)

سُبْحَانَ اللّٰہ! شریعت مطہرہ کیا عادل ملت ہے؟ فضل اللہ تعالیٰ من جاءنا بھا بیضاء نقیۃ وغراء سویۃ زکیۃ

ایک کوتاہی یہ ہے کہ کئی آدمی رنج وغیرہ کے سبب وارثوں کو محروم کرنا چاہتے ہیں اور اسی غرض سے اپنا متروکہ وقف کر دیتے ہیں، تاکہ وارثوں کو نہ ملے۔ سو سمجھ لینا چاہئے کہ ورثہ کو ضرر پہنچانا جو کہ اس شخص سے صادر ہوا ہے خود معصیت ہے۔ قرآن مجید میں غَیْرَ مُضَآرٍّ[1] کی قید موجود ہے۔ حدیث میں ہے۔

اِنَّ الرَّجُلَ لَیَعْمَلُ وَالْمَرْاَۃُ بِطَاعَۃِ اللّٰہِ سِتِّیْنَ سَنَۃً ثُمَّ یَحْضُرُھُمَا الْمَوْتُ فَیُضَارَّانِ فِی الْوَصِیَّۃِ فَیَجِبُ لَھُمَا النَّارُ وکذا فی المشکوٰۃ۔

"بعض مرتبہ مرد وعورت اللہ کی ساٹھ سال تک اللہ کی عبادت کرتے ہیں، پھر ان کی موت قریب آتی ہے تو وہ وصیت میں اپنے وارثوں کو نقصان پہنچاتے ہیں تو ان پر دوزخ کی آگ لازم ہوجاتی ہے۔"

ایک اور حدیث میں ہے

"من قطع میراث وارثہ قطع اللہ میراثہ من الجنۃ یوم القیامۃ"

جو شخص اپنے وارث کی میراث قطع کرے، اللہ قیامت کے دن جنت سے اس

---

[1] یہ الفاظ قرآن مجید میں اس جگہ آئے ہیں جہاں وصیت کے احکام ہیں، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ وصیت کرنا جائز تو ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ اس وصیت سے وارثوں کو محروم کرنا یا انہیں نقصان پہنچانا مقصود نہ ہو۔ محمد تقی عثمانی۔

کی میراث قطع کر دے گا "

بعض آدمی ضرر پہنچانا تو نہیں چاہتے مگر یہ سمجھتے ہیں کہ وقف کرنے میں تو ثواب ہو گا۔ اور وارثوں کے لئے چھوڑ جانے میں کیا ثواب ہے؟ سو ایسا سمجھنا خود غلط ہے، ثواب صرف وقف میں منحصر نہیں، بلکہ وارثوں کے لئے ترکہ چھوڑ جانے میں بھی اجر اور فضیلت ہے :۔

"انک ان تذر ورثتک اغنیاء خیرٌ من ان تذرھم عالۃً یتکففون الناس"

کذا فی المشکوٰۃ

" بلاشبہ اگر تم اپنے وارثوں کو مالدار چھوڑ کر جاؤ تو یہ بہتر ہے اس سے کہ تم انہیں محتاج چھوڑ کر جاؤ، جو لوگوں کے دست نگر ہوں "

غرض بجائے خود وقف بھی موجب ثواب ہے، اور وارثوں کے لئے چھوڑ جانا بھی موجب ثواب ہے۔ اب ایک دوسرے پر ترجیح دینا۔ یا کسی خاص نسبت سے دونوں پر جائیداد کو تقسیم کر دینا یہ محتاج ہے رجوع کا قواعد شرعیہ اور ماہران شریعت سے استفسار کرنے کی طرف۔

وقف کو استعمال کرنے والوں کی کوتاہیاں

ایک کوتاہی غیر وقف کرنے والوں کی اور یہ بہت عام ہے۔ یہ ہے کہ وقف میں ہر قسم کے تصرفات کو جائز سمجھتے ہیں۔ اور کوئی منع کرتا ہے تو کہتا ہے کہ کیا تمہاری ملک ہے؟۔ یہاں تک کہ اکثر دیندار لوگ تک اس میں مبتلا ہے کہ مسجد کے لوٹے بدھنے میں مریض کے لئے پانی پڑھوا کر لے جاتے ہیں۔ پھر بعض دفعہ وہ کئی کئی روز تک گھر ہی میں رکھا رہتا ہے۔ اور اگر فوراً بھی واپس آجاوے تب بھی خود لیجانا ہی جائز نہیں کیونکہ جس نے مسجد میں رکھا ہی اس کی نیت صرف مسجد میں کام لینے کی ہے۔ نہ کہ گھر لے جانے کی اور خلاف شرط معطی کے جو کہ اس کی نیت سے متعین ہے اور وہ نیت قرآئن سے معلوم ہے اس سے کام لینا جائز نہیں اور مانع سے یہ کہنا کہ کیا تمہاری ملک ہے؟ بالکل لغو عذر ہے کیا منع کرنا اسی پر موقوف ہے کہ وہ دوسرے ہی کی ملک ہو۔ قواعد شریعت نے جس طرح ملک غیر

ہونے کو سبب منع قرار دیا ہے۔ اسی طرح ما فیہ الاستعمال غیر ما وقف لہ، ہونا بھی شرعاً سبب منع ٹھہرایا گیا ہے۔ کیونکہ اصل حق منع شرع کو ہے، یہی وجہ ہے کہ ملک غیر ہونا بھی وہاں سبب منع ہے۔ جہاں اس کو شرع نے سبب منع قرار دیا ہے ورنہ نہیں۔ کحالۃ المضطر فی مخمصۃ حیث یباح بل یفرض تناول مال الغیر اذا لم یجد غیرہ وان ضمنہ اسی میں داخل ہے وہ بے احتیاطی بعض طلباء کی مسجد کے لوٹے پنکھے اٹھا اٹھا کر حجروں میں رکھ لیتے ہیں۔ یا بعض آدمی مسجد کے کلوخ استنجے کے لئے یا گرم پانی مسجد کے سقادہ سے وضو کے لئے گھر لے جاتے ہیں، یا بعض آدمی مسجد کا فرش یا شامیانہ لینے یا کسی دوسرے مدرسہ و انجمن و مسجد کی ضرورت میں خلاف نیت معطی کچھ اینٹ چونہ دوسری مسجد میں یہ سمجھ کر کہ مسجد مسجد سب ایک ہے۔ لگا دیتے ہیں یہ سب اسی فہرست میں داخل ہے۔ اسی طرح مدارس میں جو اشیاء خاص غریب طلباء کے لئے آتی ہیں۔ اس میں سے اغنیاء کو لینا یہ بھی اسی قبیل سے ہے۔

کفارہ مالیہ یمین

اس میں ایک بڑی کوتاہی تو یہ ہے کہ بہت لوگوں کا یہی گمان ہے کہ جب قسم ٹوٹے پس کفارہ میں تین روزہ رکھ لینا کافی ہے۔ ان کو یہ خبر ہی نہیں کہ بعض حالتوں میں روزے.... کافی نہیں ہوتے۔ کسی دوسرے طریقے کی ضرورت ہے۔ سو اس میں تفصیل یہ ہے کہ جب قسم ٹوٹنے کے بعد ارادہ ادائے کفارہ کا کرے اس وقت دیکھنا چاہیئے کہ اس شخص کے پاس قدر کفاف کو مستثنیٰ کر کے آیا اتنی گنجائش ہے یا نہیں کہ دس مسکینوں کو دو وقت شکم سیر کھانا کھلا سکے یا ان دس مسکینوں کو فی مسکین بقدر ایک حصہ صدقہ فطر کے حسب شرائط مذکورہ کتب فقہ غلہ یا اس کی قیمت دے سکے۔ یا دس مسکینوں کو اس طرح کپڑا دے سکے کہ فی مسکین متوسط قیمت کا کپڑا بقدر ایک جوڑا کے دے سکے۔ جس کی تفاصیل جزئیات کتب فقہ میں مذکور ہے۔

پس اگر اس قدر گنجائش رکھتا، ہو تو اس کا کفارہ میں روزہ رکھنا کافی نہیں ہوگا۔ بلکہ ان طریقوں میں سے ایک طریقہ اختیار کرنا ضروری ہوگا۔ تب کفارہ ادا ہوگا۔ اور اگر گنجائش نہیں ہے تب البتہ تین روزے رکھ لینا درست ہوگا۔ اور اس میں قدر کفاف سے زائد ہونا کفارہ مالیہ کے

وجوب کے لئے کافی ہے۔ صاحب زکوٰۃ ہونا شرط نہیں۔ اور قدر کفاف یہ ہے۔ رہنے کا گھر پہننے کا کپڑا اور ایک دن کی خوراک (کذا فی الحاشیۃ الشامیۃ عن الخانیہ)

اور حنفی مذہب میں اس گنجائش کو عزم ادا ر کفارہ کے وقت دیکھا جاوے گا۔ قسم ٹوٹنے کے وقت نہ دیکھا جاوے گا۔ پس اگر حنث کے وقت گنجائش ہو اور ادا کے وقت گنجائش نہ ہو تو روزہ سے کفارہ ادا ہو جاوے گا۔ اور اگر حنث کے وقت گنجائش نہ ہو اور ادا کے وقت گنجائش ہو تو کفارہ مالیہ دینا پڑے گا۔ کذا فی الشامیۃ عن الزیلعی

اس تفصیل سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ ایسے لوگ بہت کم نکلیں گے جن کے لئے روزہ کافی ہو جاوے کیونکہ غربا میں اسی کثرت سے ہیں جن کے پاس کفاف بالتفسیر المذکور سے زائد بقدر خوراک و پوشاک دس مسکینوں کے موجود ہے میں کتنی بڑی کوتاہی ہے کہ ایک طرف سے سب نے روزہ ہی کو کافی سمجھ لیا ہے

کفارہ کے احکام و شرائط کی تحقیق نہ کرنا

(۲) ایک کوتاہی یہ ہے کہ جو لوگ کفارہ مالیہ ادا بھی کرتے ہیں وہ بھی اس کے احکام شرائط کی تحقیق و رعایت نہیں کرتے چنانچہ بعض مطلق مسکین کو اس کا مصرف سمجھتے ہیں حالانکہ اس کا مصرف زکوٰۃ ہونا شرط ہے۔ (کذا فی ردالمختار)

بعضے ایک مسکین کو دو تین حصے ایک تاریخ میں دیدیتے ہیں۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ اگر ایسا کیا تو ایک ہی حصہ ادا ہو گا (کذا فی الشامیۃ)

لیکن اس غلطی کے معلوم ہونے کے وقت اس مسکین سے زائد کا واپس کرلینا جائز نہ ہو گا اس کو جو کچھ دے دیا وہ اس کی ملک ہو گیا (کذا فی الشامیۃ عن الفتح)

اگر ایک ہی مسکین کو زیادہ نفع پہنچانا مقصود ہو۔ تو اس کو مختلف تاریخوں میں ایک ایک حصہ ہر روز دیدے۔ یہ درست ہے (کذا فی الشامیۃ)

اور یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ تاریخ غروب آفتاب سے بدل جاتی ہی پس اگر ایک مسکین کو دو حصوں کا غلہ یا قیمت دینا ہو اور ایک حصہ دن میں دیدیا اور ایک حصہ بعد غروب آفتاب کے تو یوں سمجھا جاوے گا کہ دو تاریخوں میں دیا۔ اور کافی ہو جاوے گا۔ اور اگر ایک حصہ

غروب آفتاب کے بعد دیا اور دوسرا حصہ اس شب کے بعد دن میں دیدیا۔ تو یوں سمجھا جاوے گا کہ ایک ہی تاریخ میں دونوں حصے دیئے اس لئے ایک ہی حصہ ادا ہوگا۔

بعضے بے خبری سے ایک حصہ دو مسکینوں میں آدھا آدھا تقسیم کردیتے ہیں۔ اور صدقہ فطر پر قیاس کرتے ہیں۔ سو جان لینا چاہیئے کہ وہ حصہ ادا نہ ہوگا (کذا فی الشامیۃ عن الجوھرۃ)

بے خبری میں جو کوتاہیاں ہوئیں ان کا تدارک ضروری ہے

(۳) ایک کوتاہی یہ ہے کہ بے خبری کے زمانہ میں جو کوتاہیاں ہوگئیں ان کو بلا تدارک معاف سمجھ جاتے ہیں۔ یا صرف توبہ کو موجب تدارک سمجھتے ہیں۔ سو سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ بدون ادا کیئے ہوئے ساقط نہ ہوگا حتیٰ کہ موت سے بھی ساقط نہیں ہوتا (کذا فی الشامیۃ عن القھستانی)

پس اس بناء پر جب ان کوتاہیوں کی اطلاع ہو ان کا تدارک کرے اور جس قدر تاخیر کرے گا گنہگار ہوگا (کذا فی الشامیۃ عن القھستانی ایضًا)

اور اگر قبل تدارک کے موت آجاوے تو مرنے کے وقت اس کے متعلق وصیت کریں۔

"متعدد قسموں کے لئے ایک کفارہ کافی نہیں"

(۴) ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے کئی کئی قسموں کے بعد ایک کفارہ کو کافی سمجھ لیتے ہیں حالانکہ ہر قسم کا جدا کفارہ ہے۔ بلکہ شیخینؒ کے نزدیک متعدد یمین میں یہ تعدد کفارہ کا ایسا قوی ہے کہ ایک تاریخ میں ایک مسکین کو دو قسموں کی طرف سے دو حصہ دینا بھی درست نہیں وہ ایک ہی حصہ سمجھا جاوے گا (کذا فی الشامیۃ عن کافی الحاکم)

پس اس بناء پر اگر دو قسمیں اس کی ٹوٹی ہوں تو اگر ایک تاریخ میں دونوں کفارے ادا کرنا چاہیئے۔ تو ایک کفارہ کے لئے جدا دس مسکین تجویز کرے۔ اور دوسرے کفارے کے لئے جدا دس مسکین اور اگر بیس مسکینوں سے کم کو زیادہ نفع پہنچانا چاہے۔ تو تاریخیں متفرق کردے جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔

مدرسہ یا انجمن میں کفارہ ادا ہونے کا طریقہ

بعضے یہ کوتاہی کرتے ہیں کہ کفارہ یمینؑ کا داموں سے حساب کرکے یا حساب کرا کے کسی مدرسہ اسلامیہ میں اہل مدرسہ کو سپرد کردیتے ہیں۔ اور اطلاع نہیں کرتے کہ یہ کفارہ یمین ہے۔ جب ان لوگوں کو اس کی خبر ہی نہ ہو تو وہ کسی طرح رعایت اس کے احکام کی نہیں کرسکتے۔ اور اس لئے نہیں کرتے اور اس صورت میں وہ کفارہ ادا نہیں ہوتا۔ اور حق واجب اس شخص کے ذمہ رہتا ہے۔ تو دیا بھی اور ادا نہ ہوا اس لئے نہایت ضروری ہے کہ اصل مدرسہ کو تصریحاً اس کی اطلاع دے دیا کریں۔

بعضے یہ کوتاہی کرتے ہیں کہ کسی انجمن وغیرہ میں ایسے کارکن کے سپرد کرتے ہیں۔ جو بیچارہ خود ہی ان احکام سے بے خبر ہے یا اگر باخبر ہے۔ تو قلت تدین کے سبب اس پہ وثوق نہیں کہ وہ ان احکام کی رعایت کرے گا اور اس لئے وہ شخص خواہ بے علمی سے یا قلت مبالاۃ یعنی بے پروائی سے اپنی رائے یا خواہش کے موافق اس رقم یا جنس کو صرف کرتا ہے۔ اور اس دینے والے کا کفارہ ادا نہیں ہوتا۔ اور خود یہ کارکن بھی وبال میں مبتلا رہتا ہے۔ اس لئے بے حد ضروری ہے کہ ایسے جاہل بیباک آدمی کو ہرگز ایسی چیز سپرد نہ کریں بلکہ جہاں یہ احتمال ہو اور اس کے ساتھ ہی مدرسہ یا انجمن میں پہنچانا بھی ہو تو اس کی بہتر صورت یہ ہے کہ وہاں جا کر مستحقین طلباء یا یتامیٰ کو جو کہ مصارف زکوٰۃ ہو تحقیق و انتخاب کرکے اپنے ہاتھ سے حسب احکام شرعیہ تقسیم کردے اور مدرسہ اور انجمن کے حساب میں جمع کرادے تاکہ وہ اپنی اعانت کے وقت اسکو محسوب کرسکیں اور طور پر مدرسہ و انجمن کو مدد پہنچ جاوے۔

اگر کسی کے جبر و اکراہ سے قسم توڑ دی اس کا کفارہ بھی واجب ہے

بعض عوام ایک عجیب کوتاہی میں مبتلا ہیں کہ کسی کے مجبور کرنے پر اگر قسم توڑ دیں تو اپنے اوپر کفارہ واجب نہیں سمجھتے یا اس جابر کے کہنے پر کہ میرے ذمہ گناہ رہا یا میں کفارہ دیدوں گا

عہ قسم ۱۲

اپنے کو سبکدوش سمجھتے ہیں یا اس کے روزہ رکھدینے کو کافی سمجھتے ہیں سو یہ سب غلطیاں ہیں جو قسم توڑے گا۔ اس پر کفارہ واجب ہوگا۔ پھر اگر یہ حانث کفارہ مالیہ پر قادر نہیں، تو خود ہی اس کو تین روزے رکھنے پڑیں گے اور اگر قادر ہے تو واجب اسی کے ذمہ ہوگا۔ اس جابر کے کہنے سے بے فکر ہونا درست نہیں۔ بلکہ اگر اس جابر نے ادا بھی کیا۔ لیکن اس حانث نے کہا تھا جب بھی ادا نہیں ہوا۔ البتہ اگر اس حانث نے اس کو وکیل بنادیا۔ اور اس نے ادا کردیا صرف اس صورۃ خاصہ میں ادا ہو جاوے گا پس عوام کا تمام تر اس تفصیل سے غض بصر کرنا بڑی غلطی ہے۔ ھذا ما حضرنی الآن ولعل عند غیری اسبغ من ھذا البیان

تسہیل مضمون مذکور برعایت تفہیم جمہور

احقر اشرف علی تھانوی عفی عنہ عرض کرتا ہے کہ میرے مضامین مندرجہ رسالہ ھذا کی نسبت بعض ناظرین نے تقریراً و تحریراً عام لوگوں کے سمجھ میں نہ آنے کی بعض اوقات شکایت ظاہر کی بعد تکرر سماع کے مجھ کو بھی کسی کسی وقت اس کی تلافی کا خیال ہوتا تھا۔ یہ تو مجھ سے ہو نہ سکا اور مناسب بھی معلوم نہ ہوا کہ مضمون کے لکھنے کا طرز بدل دوں کہ اس میں تکلف بھی زائد تھا۔ اور اہل علم کو بھی اس سے انس نہ رہتا۔ یہ سہل اور مصلحت معلوم ہوا کہ اول اپنے طرز سابق میں بیساختہ مضمون لکھ لیا جایا کرے۔ پھر اگر کسی حصہ یا پورے مضمون میں ضرورت ہوئی تو اسی کی عبارت کو دوسرے عنوان سے خوب سلیس کردیا جایا کرے اس تجویز کے شروع ہونے میں بھی تفاق سے دیر ہوتی رہی مگر آج اس کے نفاذ اور آغاز کا بتوفیقہٖ تعالیٰ وقت آگیا۔ چنانچہ مضمون کفارہ مالیہ یمین مذکور بالا کو سہل عبارت میں اعادہ کرتا ہوں اور سہولت ہی کے لئے معلوم ہوتا ہے کہ مضمون کو مسلسل نہ رکھا جاوے گا۔ بلکہ اس کے چھوٹے چھوٹے جدا جدا ٹکڑے کردیا جایا کرینگے بعنوان مسئلہ یا اور جو عنوان مضمون کے مناسب ہو۔

خلاصۂ مضمون سابق

اعادہ بغرض تسہیل بعنوان مسائل

مسئلہ: جس شخص کی قسم ٹوٹ جاوے۔ یا وہ توڑ دے۔ تو ہر شخص کو کفارہ میں تین روزہ رکھ لینا کافی نہیں بلکہ جس کے پاس ضروری گذر سے زائد اتنی گنجائش ہو کہ وہ دس مسکینوں کو دو وقت پیٹ بھر متوسط معمولی کھانا کھلا سکے۔ یا دس مسکینوں کو فی مسکین اتنا اناج دے سکے جتنا عید کے دن صدقہ فطر میں دیا جاتا ہے۔ یا دس مسکینوں کو فی مسکین معمولی قیمت کا جوڑا مثلاً کرتہ پائجامہ یا چادر لنگی یا کرتہ لنگی یا چادر پائجامہ دے سکے۔ تو اس کا اس وقت ادا ہوگا جب اس طرح دس مسکینوں کو کھانا یا کپڑا یا ان کے دام دے۔

اور ضروری گذر کا مطلب یہ ہے کہ رہنے کا گھر پہننے کا کپڑا اور ایک دن کا کھانا اگرچہ غریب ہی ہو۔ اور زکوٰۃ اس پر واجب نہ ہو۔ اور جس کے پاس اتنی گنجائش بھی نہ ہو اس کا کفارہ البتہ تین روزے پے درپے رکھنے سے ادا ہو جاوے گا۔

اور اس سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ بہت کم لوگ ایسے ہیں جن کا کفارہ روزے سے ادا ہوتا ہو۔ کیونکہ اتنی گنجائش والے تو کثرت سے ہیں۔

مسئلہ: یہ گنجائش ہونا یا نہ ہونا اس وقت دیکھا جاوے گا جب کفارہ ادا کرنے کا قصد ہو۔ قسم ٹوٹ جانے کے وقت نہ دیکھا جاوے گا۔ سو اگر قسم توڑنے کے وقت گنجائش نہ تھی اور ادا کرنے کے وقت گنجائش ہو گئی تو دس مسکینوں کو بطریق مذکور کھانا یا غلہ یا کپڑا یا دام دینا ہوگا اور اگر قسم توڑنے کے وقت گنجائش تھی پھر ادا کے وقت گنجائش نہ رہی تو روزے ہی سے کفارہ ادا ہو جاوے گا۔

مسئلہ: ہر مسکین کو دینا کفارہ میں درست نہیں۔ بلکہ وہ مسکین ایسا ہو سید اور بنی ہاشم میں سے نہ ہو۔ اور اسی دینے والے کا باپ، دادا، نانا، ماں، دادی، نانی، بیٹا، پوتا، بیٹی پوتی، نواسی، نواسہ، میاں بی بی نہ ہو۔ البتہ بیٹے کی بی بی کو یا داماد کو دینا درست ہے۔

مسئلہ ایک مسکین کو ایک تاریخ میں دو تین حصہ دینا درست نہیں اگر ایک ہی مسکین کے

ساتھ زیادہ احسان کرنا منظور ہو تو اس کو ہر روز ایک حصہ دے دیا کرے اور تاریخ شریعت میں دن چھپنے سے شروع ہو کر اگلے دن کے چھپنے پر ختم ہوتی ہے۔

مسئلہ: اگر غلطی سے کوئی کفارہ ادا نہ ہوا تو توبہ کافی نہیں بلکہ پھر یاد کر کے ادا کرنا چاہیئے اور بلا عذر دیر کرنے سے گناہ ہوگا۔

"اگر زندگی میں کفارہ ادا نہ کر سکا تو کیا کرے"

مسئلہ: اگر کفارہ ادا نہ کرنے پایا تھا کہ موت آگئی۔ تو اس کے ذمہ واجب ہے کہ وارثوں کو وصیت کرے کہ وہ اس کے ترکہ سے اس کو ادا کریں۔ اور وارثوں پر اس کا ادا کرنا اس شرط سے واجب ہے کہ وہ اس میت کے ترکہ کے تہائی حصہ سے نکل سکے۔ مثلاً اس کے ذمہ چار قسموں کا کفارہ واجب تھا اور وہ پانچ روپے کے غلہ سے ادا ہو سکتا ہے اور میت کا ترکہ اتنا ہے کہ اسی تجہیز و تکفین کر کے اور قرضہ مہر وغیرہ دے کر پندرہ روپیہ یا زائد بچتے ہیں تو اس صورت میں اس کی وصیت کا پورا کرنا ان کے ذمہ واجب ہوگا۔ اور جو مثلاً ساڑھے سات روپے بچتے ہیں تو صرف دو کفاروں کا ادا کرنا اڑھائی روپے سے واجب ہوگا اور اگر مثلاً تین ہی روپے بچتے ہیں تو ایک کفارے کا بھی ادا کرنا واجب نہ ہوگا۔

اسی طرح نرخ کے اختلاف سے کفارہ کی قیمت کی کمی بیشی کا حساب دیکھ لیا جاوے۔ البتہ ایسی صورت میں اگر کوئی وارث بالغ اپنے حصے ترکہ سے یا اپنے سرمایہ سے ادا کر دے تو بڑا ثواب ہے۔ لیکن وارث کے روزہ رکھنے سے کفارہ ادا نہ ہوگا۔

اگر میت کے پاس نقد نہ ہو لیکن غلہ یا کپڑا سلا ہوا یا بے سلا تہائی ترکہ کے اندر اتنا ہو کہ وہ دس مسکینوں کو فی مسکین بقدر صدقہ فطر یا ایک جوڑا تقسیم ہو سکے تب بھی کفارہ دینے کی وصیت کو پورا کرنا واجب ہے۔

"اگر متعدد قسمیں ٹوٹیں تو ایک کفارہ کافی نہیں"

مسئلہ: اگر دو قسمیں ٹوٹیں تو کفارہ (۲) دینا واجب ہے۔ اور امام ابو حنیفہؒ اور

امام ابویوسف رح کے نزدیک اگر ایک تاریخ میں ایک مسکین کو دونوں کفاروں کا ایک ایک حصّہ دینا چاہے تو درست نہیں اگر ایسا کیا تو ایک ہی حصّہ ادا ہوگا دوسرا اس کے ذمہ رہے گا۔ جیسا ایک قسم کے کفارہ کے دو حصے ایک مسکین کو ایک تاریخ میں دینا درست نہیں۔ البتہ اگر ایک تاریخ بدل جائے تو درست ہے۔

"کفارہ ادا ہونے کیلئے تملیک شرط ہے"

مسئلہ: کفارہ کی رقم یا جنس یا کپڑا جب تک کسی خاص مسکین کی ملک نہ کیا جاویگا اس وقت تک وہ کفارہ ادا نہ ہوگا۔ خواہ اپنے ہاتھ سے کسی کو مالک کردے یا دوسرے شخص کے سپرد کردے کہ وہ کسی کو مالک کردے۔ مثلاً کسی مدرسہ کے مہتمم کو دے دیا۔ یا کسی انجمن کے کارکن کو دیدیا۔ اس صورت میں وہ اس کفارہ والے کا وکیل ہو جاوے گا۔ اور کفارہ محض اس کے سپرد کرنے سے ادا نہ ہوگا۔ بلکہ جب وہ وکیل موافق احکام شرعیہ کے مساکین کو دے گا۔ تب ادا ہوگا۔ پس اگر اس وکیل نے کوئی غلطی کی تو کفارہ دوبارہ دینا پڑے گا۔ اس لئے ایسے شخص کو وکیل نہ بناوے جو احکام شرعیہ سے بے خبر ہو۔ یا کہ خبردار ہو مگر دیندار اور احتیاط والا نہ ہو۔

مسئلہ: اوپر کے مسئلہ سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ جن کارخانوں میں کوئی خاص تملک نہیں ہوتا گو وہاں رفاہ عام کے کام ہوتے ہوں وہاں دینے سے ایسی رقمیں جیسے کفارہ ہے، زکوٰۃ ہے، صدقہ فطر ہے، چرم قربانی کی قیمت ہے۔ خواہ خود مالک چرم نے فروخت کی ہو خواہ اس کے وکیل نے۔ اور بھی جن جن رقموں میں تملیک خاص شرط ہے۔ ادا نہیں ہوتے۔ پس جنہوں نے چندہ حجاز ریلوے میں ایسی رقمیں دی ہوں ان کو چاہیئے کہ وہ دوبارہ پھر موافق شرعیت کے ادا کرے۔

"وکیل اگر روزہ رکھدے یا بلغیر اجازت کے کفارہ ادا کرے تو ادا نہ ہوگا"

مسئلہ: اگر قسم توڑنے والے کی طرف سے دوسرا شخص کفارہ ادا کرنا چاہے۔ تو

اگر کفارہ میں اس دو سے کم نے روزے رکھے تب بھی کفارہ ادا نہ ہوگا۔ اور اگر دس مسکینوں کو موافق مسائل مذکورہ بالا کھانا یا کپڑا یا غلہ یا دام دیئے تو اگر کفارے والے نے اجازت نہیں دی تھی۔ تو بھی کفارہ ادا نہ ہوگا۔ اور اگر تصریحاً اجازت دیدی ہے تو ادا ہوجاویگا فقط (باقی اجزاء مضمون کے آسان ہے محتاج تسہیل نہیں)

"منت مالی کے متعلق کوتاہیاں"

(ایفاء نذر مالی)

منجملہ طاعات ملحقہ بالزکوٰۃ کے نذر مالی کا ایفاء ہے۔ اس میں بھی مثلاً دیگر طاعات کے چند کوتاہیاں واقع ہوتی ہیں۔

اگر نذر کو کسی شرط پر معلق کیا تو اس شرط کے وجود سے ایفاء واجب ہوگیا چاہے اس شرط کا دوام نہ ہو۔

ایک کوتاہی تو یہی ہے کہ بعضے لوگ شوق شوق میں نذر تو کر لیتے ہیں مگر اس کا ایفاء نہیں کرتے یا تو یاد نہیں رکھتے یا یہ سمجھ کر کہ اب تو کام نکل گیا۔ بے پروائی و سستی کرتے ہیں۔ یا اس کامیابی کا اگر بقاء نہ ہو تو عدم بقاء کو مثل عدم حدوث کے قرار دے کر ایفاء کو واجب نہیں سمجھتے مثلاً کسی نے نذر کی کہ اللہ تعالیٰ فلاں مریض کو شفاء دے تو میں دس روپے خیرات دوں گا۔ اور وہ تندرست ہوگیا۔ مگر نذر پورا کرنے سے پہلے وہ پھر بیمار ہوگیا۔ تو یہ گمان غلط ہوگا کہ اب نذر پورا کرنا ضروری نہیں رہا۔ کیونکہ معلق تندرست ہونے پر کیا تھا۔ نہ کہ عمر بھر تندرست رہنے پر جب معلق بہٖ پایا گیا ایفاء نذر واجب ہوگا علاج ان کوتاہیوں کا مسائل معلوم کرنا اور جزاء معصیت کو پیش نظر رکھنا ہے۔ تاکہ نہ غلطی ہو نہ بے پروائی۔

○

۱؎ وجود ۔ ۱۲

"غیر اللہ کی منت شرک ہے"

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے نذر غیر اللہ کی کرتے ہیں بعض تو کھلم کھلا کہ اے فلاں بزرگ اگر ہمارا کام ہوگیا۔ تو آپ کی نام کا کھانا کریں گے۔ یا آپ کی قبر پہ غلاف چڑھا دیں گے۔ یا آپ کی قبر پختہ بنادیں گے یہ تو بالکل شرک جلی ہے۔ کیونکہ نذر بھی عبادت کی ایک قسم ہے (رد المحتار عن الاختیار اول احکام النذور و قبیل باب الاعتکاف)

عبادت میں کسی کو شریک کرنا صریح شرک ہے اس کا علاج توبہ اور عقیدہ کی درستی ہے۔ اور وہ نذر بھی منعقد نہیں ہوتی۔ اس کو پورا نہ کرے۔ اور اگر انتساب بغیر اللہ سے قطع نظر کر کے بھی وہ غیر مشروع ہو۔ تو اس کا مضاعف وبال ہے جیسا قبر پہ غلاف چڑھانا۔ یا قبر پختہ بنانا کہ خود بھی غیر مشروع ہے۔ اور غیر اللہ کے تقرب کا ذریعہ بنانا یہ دوسری معصیت ہے۔ اور ایسا کھانا مَا اھل بہ لغیر اللہ میں داخل ہونے کے سبب مباح التناول بھی نہیں اور ایسا غلاف دوسرے سبب سے بھی کسی کے لئے جائز الاستعمال نہیں۔ جیسا بعض مجاورین اس میں تصرف درست سمجھتے ہیں اور دوسرا سبب مالک کا اس کے لئے اذن نہ ہونا ہے۔ کیونکہ اس کی نیت صرف قبر پوشی کے لئے ہے نہ کہ مجاور کے گھر لے جانے کی البتہ اگر ناذر[1] توبہ کرے۔ تو پھر وہ کھانا مجاور کے لئے اور وہ غلاف مالک کے اذن سے کھا لینا اور استعمال کر لینا حلال ہے اور اگر کوئی جانور تھا۔ جو اسی نیت پر ذبح ہو چکا۔ تو اب توبہ سے وہ حلال نہ ہوگا۔ اسی طرح ایسی قبر کی اینٹیں لے جانا غیر مالک کے لئے حلال نہیں۔ البتہ مالک کو اختیار ہے کہ قبر سے اکھاڑ کر جو چاہے کرے۔

قبر کی کوئی چیز نیک کام میں بھی استعمال کرنا جائز نہیں ہے

یہ بے احتیاطی بعض اتقیا سے بھی ہوتی ہے کہ پختہ قبر کو منہدم کر دینے کو ثواب سمجھتے ہیں اور یہاں تک تو ٹھیک سمجھے مگر آگے یہ بھی گمان کر لیتے ہیں کہ بعد انہدام ان

[1] منت ماننے والا ۱۲

اینٹوں کو کسی اچھی جگہ لگا دیا جاوے ۔ سو یہ غلط ہے ۔ اسی طرح قبروں پر جو مورچھل یا جاروب وغیرہ رکھی رہتی ہیں یا پھول چڑھے ہوتے ہیں ان کا استعمال کرنا کسی کو جائز نہیں ۔ گو ان کا چڑھانا گناہ ہوا ۔

بعض دفعہ شرک ظاہر نہیں ہوتا بلکہ مدفون ہوتا ہے

اور بعض لفظاً تو اللہ ہی کے لئے نذر کرتے ہیں لیکن اس کے تحت میں شرک مدفون ہوتا ہے کہ ذرا التفات و تامل سے کام لیا جاوے تو اس کا ادراک ہوتا ہے مثلاً نذر کی کہ اے اللہ اگر میرا فلاں کام ہو جاوے تو آپ کے نام کی ایک دیگ کھانے کی پکوا کر کھلا کر بڑے پیر صاحب کو ثواب بخشوں گا ۔ اور یہ نہایت ہی احتیاط کا صیغہ سمجھا جاتا ہے ۔ تو یہ ظاہر میں تو نذر اللہ کے لئے ہے لیکن یہ یقینی ہے کہ یہ لوگ اس مقصد میں ضرور ان بزرگ کو کسی قدر معین اور دخیل اور متصرف سمجھتے ہیں چنانچہ اگر ان سے کہا جاوے کہ ان بزرگ کو دوسرے وقت ثواب پہنچا دینا اس وقت اس منضم مت کرو خالی نفع مساکین کی نیت رکھو تو ان کے دل میں ضرور یہ خطرہ قریب مرتبہ اعتقاد گذرے گا کہ اس کے منضم نہ کرنے سے اس نذر میں اثر ضعیف ہو جاوے گا جس کا سبب ان بزرگ سے روحانی امداد کا پہنچنا ہے ۔

پس ہر مسلمان اس پر غور کر کے دیکھ لے کہ یہ خلاف توحید ہے یا نہیں اور اس کا ایک امتحان ہے ۔ وہ یہ کہ اگر وہ کام ہو جانے کے بعد اس ناذر سے کہا جاوے کہ صرف اللہ کے نام مساکین کو دیدو اور کسی کو ثواب مت پہنچاؤ، یا جن کے ثواب پہنچانے کی نیت کی ہے ان کو نہ پہنچاؤ ۔ اور کسی بزرگ کو بخش دو کیونکہ نذر میں ایسی تخصیصات شرعاً لازم و معتبر نہیں ہوتیں ۔ (جیسا آگے بھی آتا ہے) تو اس وقت نذر کرنے والوں کی حالت دیکھنے کے قابل ہے کہ اس کو گوارا کر سکتے ہیں ۔ یا نہیں ۔ اگر گوارا نہ کیا تو سمجھ لیجئے کہ اعتقاد میں خلل ہے اس کا علاج بجز اس کے کچھ نہیں کہ اگر عقیدہ میں بھی فساد محسوس نہ ہو تب بھی حاجت کے لئے نذر کرنے کے وقت ہرگز کسی بزرگ کے ایصال ثواب کو منضم نہ کیا کریں ۔ اس کو دوسرے وقت بلا نذر ثواب بخش دیا کریں ۔

اغنیاء کو دینے سے منت پوری نہیں ہوتی

ایک کوتاہی یہ ہے یہ کہ بعضے لوگ نذر کے مصرف میں اغنیاء اور ہر مستحقین کو بھی شامل سمجھتے ہیں چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ قبول کی ہوئی شیرینی مسجد میں لاکر سب نمازیوں کو تقسیم کرتے ہیں۔ جن میں اغنیاء اور ناذر کے اصول وفروع بھی ہوتے ہیں جن کو دینے سے نذر ادا نہیں ہوتی —

(ردالمحتار قبیل باب الاعتکاف)

بلکہ جس قدر ان لوگوں کے حصہ میں آیا ہے اسی قدر دوبارہ مساکین کو دینا واجب ہوگا۔ البتہ نذر ہی کرنے کے وقت، یہ کہہ دیا کہ میں اغنیاء وغیرہم کو بھی دوں گا تو ان کے حصے کی نذر ہی منعقد نہیں ہوتی (درالمختار عن القنیۃ)

یہاں سے مانی ہوئی گیارھویں کی شیرینی کے حصے خوش حال دوستوں کے گھر بھیجنے کا بھی حکم معلوم ہوگیا ہوگا۔ اور خود اس گیارہویں کی تحقیقات کا بدعت ہونا یا نیت عوام کا شرک جلی یا خفی ہونا یہ مستقل بحث ہے۔

نذر کی تمام تخصیصات کا التزام ضروری نہیں

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے لوگ نذر کی تمام تر تخصیصات کو لازم و واجب سمجھتے ہیں مثلاً نذر کی کہ دو روپے کی مٹھائی دوں گا یا کسی مسجد میں دوں گا یا اتنی رقم مکہ معظمہ بھجواؤں گا۔ یا رمضان میں خیرات کروں گا تو اس کا اہتمام کرنا کہ مٹھائی ہو اور مسجد میں جاوے۔ یا مکہ معظمہ ہی میں بھیجے یا رمضان کا انتظار کرے ضروری نہیں۔ بعض اوقات بعض تخصیصات کی ایفاء پر قدرت نہ ہونے سے اصل نذر ہی ادا ہونے سے رہ جاتی ہے۔

مثلاً مکہ لے جانے والا کوئی نہ ملا اور یہاں ادا نہ کی۔ اسی میں موت آگئی۔ تو گنہگار مرا۔ یا اگر ایفاء تخصیصات پر قدرت بھی ہوئی لیکن کسی وجہ سے دوسرا مصرف یا دوسری صورت افضل ہو۔ تو ملتزم تخصیص اسی فضیلت سے محروم رہتا ہے مثلاً اکثر اوقات مسجد میں مٹھائی بانٹنے والوں سے یہ افضل ہے کہ گھر بیٹھنے والوں محتاجوں کو ۲ روپے نقد یا اس

کاغلہ دیدیا جاوے۔ تو ایسے التزام مالایلزم میں کیوں مبتلا رہو۔ البتہ جو نذر معلق ہو اس میں قبل وجود شرط ادا صحیح نہیں بس اتنی تخصیص شرعًا معتبر ہے اور دوسری تخصیصات نذر معلق میں بھی معتبر نہیں (درمختار)

یہاں سے زنان عوام کی اس تخصیص کا حکم بھی معلوم ہوگیا ہوگا کہ فلاں کام ہو جاوے تو میں مسجد کا طاق بھروں گی سو یہ قید بھی شرعًا معتبر نہیں، البتہ اگر کوئی نذر کرے کہ اگلے سال قربانی کروں گا۔ یہاں تخصیص ایام نحر کی ہو جاوے گی (ردالمحتار) نہ اس وجہ سے کہ زمان مقصود بلکہ اس لئے کہ جو ایام نحر میں نہ ہو وہ قربانی ہی نہیں جو کہ مقصود ہے اور جو صدقہ مکہ میں نہ ہو وہ بھی صدقہ ہی ہے اور صدقہ ہی مقصود ہے یہ فرق ہے دونوں تخصیصوں میں۔

ناجائز فعل کی نذر اور اس کا ایفاء جائز نہیں

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ ہم جس فعل کی نذر کر رہے ہیں۔ وہ شرعًا جائز ہے یا ناجائز اور اس لئے بعض معاصی کی نذر کرتے ہیں مثلاً قبروں پر غلاف چڑھانا، عرسوں میں جانا، یا بطریق بدعت مولود شریف کرانا سو ظاہر ہے کہ یہ نذر خود معصیت ہے اور اس کا ایفاء جائز نہیں۔ بلکہ توبہ واجب ہے۔ علاج اس کا علم دین ان ابواب میں حاصل کرنا اور اہل حق کی صحبت اختیار کرنا ہے۔ البتہ اگر نذر ہو طاعت کی اور معلق کیا ہو۔ اس کو معصیت کے ساتھ وہ نذر منعقد ہو جاتی ہے پھر اگر وہ معصیت سرزد ہو جاوے تو اگر مقصود اس قائل کا اس تعلیق سے اس معصیت کے ترک کا عہد ہے تو خواہ نذر پوری کرے یا کفارہ یمین دے۔ اور اگر مقصود اس معصیت کی تحصیل پر اظہار مسرت ہے یعنی وہ معصیت اس کو مرغوب ہے تو اس نذر کا ایفاء اس پر واجب ہے (درمختار و ردمحتار)

اور اگر وہ فعل جائز بھی ہو مگر قربت مقصودہ نہ ہو، مثلاً وضو تب بھی گو جواز اصلی کی وجہ سے اس فعل کا کرنا جائز ہے مگر نذر منعقد نہ ہو گی اور وہ واجب نہ ہو گا۔ یہاں سے حکم معلوم ہو گیا ہو گا مولد بطریق مشروع کی نذر کا کہ اس کا ایفا واجب نہیں ہو گا۔

جو چیز ملک میں نہیں ملک کیطرف اضافت کئے بغیر اسمیں نذر منعقد نہیں ہوتی۔

ایک کوتاہی علمی یہ ہے کہ بعض دفعہ جوش میں اس قدر مال کثیر کی نذر کر لیتا ہے جو اس کی ملک میں نہیں۔ اور پھر اس کا پورا کرنا دشوار ہوتا ہے یا ملک غیر میں نذر کر لیتا ہے۔ پھر یا تو ایسے امر میں کوتاہی کرتا ہے جس کو واجب سمجھتا ہے اور یا ادا کرنے کا ارادہ کرتا ہے اور پریشان ہوتا ہے اور تمام محاصل اور مکاسب اس کے نذر کرتا ہے اور دوسرے حقوق واجبہ تلف کرتا ہے حالانکہ جو چیز ملک میں نہ ہو۔ اس کے ساتھ نذر متعلق نہیں ہوتی۔

مثلاً کسی نے ایک ہزار روپے دینے کی نذر کی۔ اور نذر کے وقت اس کی ملک میں سو روپیہ ہے۔ جبکہ نذر مطلق ہو اور اگر معلق ہو تو وجود شرط کے وقت (کمافی رد المختار) سو روپے یا اتنے کا سامان ہو تو اس شخص پر ہزار روپے واجب نہ ہوں گے۔ (درمختار ورد محتار)

اور اگر ہزار روپے نقد نہ ہوں لیکن اتنا سامان موجود ہو تو اس کو بیچ کر دینا واجب ہوگا (ردمحتار) لیکن اگر سب دے ڈالنے میں تکلیف ہو تو بقدر کفاف کے رکھ کر بقیہ دیدے پھر جب گنجائش ہو۔ جتنا پہلے حاجت کی وجہ سے رکھ لیا۔ اتنا پھر دیدے (ردمحتار)

اسی طرح اگر نذر کرے کہ فلاں شخص سے گائے خرید کر اللہ کے واسطے ذبح کرونگا یہ نذر بھی منعقد نہیں ہوتی (درمختار) البتہ اضافت الی سبب الملک حکم ملک میں ہے۔ مثلاً اگر یہ نذر کی کہ اگر فلانی گائے خریدوں تو اس کی ذبح للتصدق کی نذر کرتا ہوں تو گو وہ اس وقت ملک میں نہیں لیکن اسی طور سے نذر منعقد ہو جاوے گی اور بعد اشترار (خریداری) اس نذر کا ایفار واجب ہوگا۔

اور ملک غیر میں نذر کرنے کی ایک فرع یہ بھی ہے کہ کسی یتیم کے تندرست ہونے پر نذر کرتے ہیں کہ اسی کے روپیہ میں سے اتنے مساکین کو کھانا کھلادیں گے۔ یہ نذر بھی باطل ہے۔

ایسی چیز کی نذر نہ کرے جو اپنی طاقت سے باہر ہو اگر کرلی تو ایفا ر واجب ہوگا

ایک کوتاہی یہ ہے کہ جس طرح صورت بالا میں نذر مالی اس قدر کرلی تھی جو ملک میں نہ تھی اسی طرح بعضے ایسے عبادات بدنیہ کی نذر کرلیتے ہیں جو ان کی طاقت سے خارج ہوتی ہے۔ مثلاً یہ نذر کرلی کہ عمر بھر روزے رکھا کروں گا۔ یا تازیست ہر سال حج کروں گا۔

اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ خفیف خفیف نذریں بہت سی جمع ہونے سے وہ ثقیل ہوگئیں مثلاً کئی بار میں دس دس روزوں کی نذر کی مگر ادا میں سستی کرنے سے وہ جمع ہوکر ایک ہزار روزے ہوگئے۔ جو تین سال میں جبکہ بلا ناغہ رکھے جائیں پورے ہوسکتے ہیں جس کا موقع بظاہر ملنا نہایت بعید ہے۔ پھر اس کے بعد ناواقفی سے یہ کوتاہی ہوتی ہے کہ اس میں سے جتنا جی چاہا پورا کردیا بقیہ کا کوئی تدارک نہیں کیا جاتا سو سمجھ لینا چاہیئے کہ اولاً ایسی نذر نہ کرے اور اگر ہوجائے تو اس کو پورا کریں اور اگر پورا ہونے سے رہ جائے۔ اس کا بدل کرے اور اگر موت آجاوے تو اپنے ترکہ میں اس کے متعلق وصیت کریں۔ مثلاً عمر بھر کے روزے رکھنے کی نذر کرلی تو جتنے روزے نہ رکھ سکے اس کا فدیہ دے (درمختار) اور جو مرنے کے وقت رہ جاویں فدیہ کی وصیت کرے (درمختار و ردالمحتار قبیل از باب اعتکاف) یا تیس حج کی نذر کرلی اور نہ کرسکا تو وصیت کرجاوے (ردالمحتار)

حل شبہ: ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ نذر مت کرو کہ نذر سے تقدیر نہیں ٹلتی۔ البتہ اس کے ذریعہ سے بخیل کے پاس سے کچھ (نیک کام میں) نکل آتا ہے (جو بلا نذر اس نیک کام میں خرچ نہ کرتا) اھ (بالحاصل) اس سے شبہ یہ ہوتا ہے کہ اوپر نذر کا عبادت ہونا ثابت ہوچکا ہے اور عبادت مامور بہ ہوتی ہے گو درجہ ندب ہی میں ہو اور اس حدیث سے اس کا منہی عنہ ہونا ثابت ہوتا ہے گو درجہ کراہت ہی میں ہو پس ان میں جمع ہونے کی کیا صورت ہے۔ جواب یہ ہے کہ نذر خود عبادت مقصودہ نہیں بلکہ اس کا عبادت ہونا اس لئے ہے کہ وہ دوسری عبادت مقصودہ سے متلبس و متعلق اور ان کا ذریعہ اور سبب ہے (فی ردالمختار، احکام الیمین والنذر) ماکونہ قربۃ فلما یلازمہ من القرب

کالصلوٰۃ والصوم والحج والعتق ونحوھا)

اوران عبادات مقصودہ کے عمل میں لانے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک بدون نذر کے۔ اور دوسری بعد نذر کے اور اوّل صورت افضل ہے دوسری سے اور مقبول بمقابلہ فاضل وافضل کے اولیٰ بالترک ہوتا ہے۔ پس نہی عن النذر اس درجے میں ہے۔ تو یہ منافی نہیں اس کے مامور بہ فی درجۃ التوسل بہ الی الطاعات المقصودہ (یعنی طاعات مقصودہ کے لئے وسیلہ بننے کے درجہ میں) ہونے کے اس حدیث میں یہ تو عمل کی اصلاح ہے۔ اور ایک عقیدہ کی اصلاح ہے کہ عوام کی طرح یوں نہ سمجھو کہ نذر کرنے کو اس کارروائی میں کچھ خاص دخل اور اثر درجۂ مزعومہ عوام کا ہے۔ اور اگر نذر نہ ہوتی تو یہ کام نہ ہوتا کام تو ہر حال میں اس طرح ہوتا جس طرح مقدر تھا اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی بلکہ اور اسباب طبعیہ یا دعا جن کا اثر مشاہدہ و سمع سے ثابت ہے نذر میں اتنا اثر بھی ہونے کے لئے دلیل کی حاجت ہے اور ظاہراً یہ حدیث بھی اس کی نفی کر رہی ہے۔ ورنہ نہی نہ ہوتی بلکہ مثل دواؤ دعا اس کی ترغیب ہوتی اور اس میں بھی مثل ان کے تبدیل قدر کے شبہ کے جواب میں یہ ارشاد ہوتا وذالک من القدر) (اور یہ بھی تقدیر میں سے ہے)

مقصود حضور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ہے کہ نذر کے دباؤ سے خیر کرنا بخل ہے۔ بلا نذر خیر کرنا زیادہ بہتر ہے اھ

اور اگر شکریہ کارروائی میں خیر کرنے کی نیت ہو تو زبان سے کہنے کی کیا ضرورت ہے دل میں رکھے اور موقع پر عمل کرے۔ نیت کرنے سے نذر بھی نہیں ہوتی (لانہ مما یتعلق بالقول (یعنی اس کا تعلق قول سے ہے) کما فی الدر المختار ۔ اور اصل مقصود بھی حاصل ہو جاتا ہے شارع کا بھی کہ نفس عبادت ہے۔ اور اس عامل کا بھی کہ اقتران، انجاح حاجت وقصد طاعت ہے۔ واللہ اعلم بالصواب ۱۲

خلاصہ مضمون سابق

(تسہیل مضمون مذکور برعایت تفہیم جمہور)

بعنوان مسائل : مسئلہ شرعی منت کا ادا کرنا فرض ہے۔ مسئلہ اگر منت مانی کہ

تندرست ہو جاؤں تو اتنا خیرات کروں پھر بالکل تندرست ہو گیا۔ اور اتفاق سے پھر بیمار ہو گیا تو پہلی منت اس کے ذمہ رہے گی ادا کرنا ضروری ہے۔ مسئلہ: خدا کے سوا کسی کی منت ماننا جائز نہیں۔ جیسے بعض عوام کا طریقہ ہے کہ بزرگوں سے عرض کرتے ہیں کہ ہمارا فلاں کام ہو جاوے تو آپ کے نام کی دیگ کریں گے مسئلہ۔ اور اگر صورت مذکورہ میں خود وہ فعل بھی ناجائز ہو تو دوگناہ ہوئے۔ ایک غیر اللہ کی منت دوسرے معصیت کی منت، مسئلہ: ایسی منت کی چیز استعمال میں لانا نہ چاہیئے۔ مسئلہ: البتہ اگر نذر کرنے والا توبہ کرے تو وہ چیز درست ہو جاوے گی۔ مسئلہ: اگر اسی نیت پر جانور ذبح ہو چکا تو اب توبہ سے کچھ نہ ہوگا۔ مسئلہ: اگر نیت اللہ کے واسطے ہو تب بھی منت میں کسی کے ایصال ثواب کو ملا دینا خلاف احتیاط ہے۔ عوام کو یہ خیال ہو ہی جاتا ہے کہ ان بزرگ کا نام لگا دینے سے کچھ سہارا ان بزرگ کی طرف سے بھی لگے گا۔ مسئلہ: منت کی چیز خوش حال لوگوں کو یا بنی ہاشم کو جن میں سید بھی داخل ہے۔ یا اپنے ماں، باپ، دادا، دادی، نانا، نانی، یا بیٹے، بیٹی، نواسا، نواسی، پوتا، پوتی، کو دینا درست نہیں۔ اگر ایسا کیا تو جتنا ان کو دیا ہے اتنا پھر محتاجوں کو دینا پڑے گا۔ اگر مسجد میں بانٹے تو خوش حال لوگوں کو نہ دے۔ مسئلہ: منت ماننے میں کسی کھانے کی یا کسی مسجد کی یا مکہ کی تخصیص لازم نہیں ہے پس اگر مٹھائی یا کھانے کی منت مانی تو روپے پیسے کپڑے دینا بھی درست ہے۔ داموں میں دونوں چیزیں برابر ہوں۔ اسی طرح بجائے مسجد میں بانٹنے کے گھروں میں دے دینا بھی درست ہے اسی طرح بجائے مکہ معظمہ کے ہندوستان کے حاجت مندوں کو دے دینا بھی درست ہے۔

مسئلہ: جو فعل خود یا کسی خاص طریقے سے شرعاً درست نہ ہو۔ اس کی منت ماننا درست نہیں۔ جیسے یوں کہنا کہ میرا فلاں کام ہو جاوے تو خواجہ صاحب کے عرس میں جاؤں۔ یا جس طرح سے اکثر جہلاء و عوام مولود شریف پڑھتے ہیں ایسے مولود کی نذر کرنا، یہ درست نہیں۔ اور اگر ذکر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بطریق سنت ہو جائز ہے۔ مگر نذر کرنے سے وہ بھی واجب نہیں ہوتا جیسا وضو کے باوجود عبادت ہونے کے اس کی نذر منعقد نہیں ہوتی۔

مسئلہ: جو چیز اپنی ملک میں نہ ہو۔ اس کی نذر صحیح نہیں ہوتی۔ مثلاً کسی نے منت مانی کہ اگر فلاں کام ہو جاوے تو ہزار روپیہ دوں گا۔ اور کام ہو گیا اور ہزار روپیہ اس وقت موجود نہیں نہ اتنا سامان ہے تو یہ نذر نہیں ہوئی پس اگر ایک مہینہ کے بعد ہزار روپیہ اس کو مل گئے تو اس نذر کا پورا کرنا واجب نہ ہوگا۔ البتہ کام پورا ہونے کے وقت جتنے روپیہ یا جتنا سامان اس کی ملک میں ہے اس کا دینا واجب ہوگا۔ اگر نقد نہ ہو تو سامان بیچ ڈالنا واجب ہوگا۔ اگر سب کے بیچنے سے تکلیف اور حرج ہو تو بقدر ضرورت تھام لے پھر گنجائش ہونے کے وقت جتنا تھام لیا تھا وہ بھی بیچ کر دے ڈالے مثلاً ہزار روپیہ کی منت مانی تھی مگر کام ہو جانے کے وقت پانچ سو روپیہ کا سامان موجود ہے تو وہ نذر پانچ سو روپے کے ساتھ متعلق ہوگی۔ اس میں اگر سو روپے کے سامان اپنی ضروریات کے لئے رکھ لیا تو چار سو اب دیدے اور سو کا سامان پھر دے۔ اسی طرح دوسرے کی ملک میں نذر نہیں ہوتی مسئلہ نذر کرنے سے پہلے سوچ لے کہ جس عبادت کی نذر کرتا ہوں مجھ سے اس کا سرانجام ہو سکے گا یا نہیں۔ کیونکہ جو نذر کرے گا وہ اس کے ذمہ واجب ہو جاوے گی۔ پھر ادا کرنا مشکل ہوگا۔ یا بھول جاوے گا تو اس کے ذمہ وبال اور گناہ رہے گا۔ اگر ہزار روزوں کی نذر کر لی یا کئی نذریں جمع ہو کر ہزار روپئے ہو گئے تو ان سب کا ادا کرنا واجب ہوگا۔ اور جب طاقت نہ رہے گی فدیہ دینا پڑے گا۔ اور جب مرنے لگے گا تو وصیت کرنا پڑے گی کہ میرے ترکہ میں سے اس قدر فدیہ ادا کر دیا جاوے۔

تتمہ آخر مضمون نذر

(وھو جوھر نفیس لایجوز ان یطرح)

اور یہ نہی نذر کرنے سے جو حدیث میں وارد ہے جس کی تحقیق اس سے مضمون میں مذکور ہوئی ہے۔ مخصوص ہے نذر معلق کے ساتھ جیسا کہ اس نہی کی اس تعلیل سے صاف ظاہر ہے انه لایرد شیئا وانما یستخرج به من البخیل۔ یعنی یہ نذر (تقدیر میں سے) کسی چیز کو نہیں ٹال سکتی بلکہ اس نذر کے ذریعہ بخیل سے (مال) نکالا جاتا ہے۔

جس کا حاصل یہ ہے۔ انہ لم یخلص من شائبۃ العوض حیث جعل القربت فی مقابلۃ الشفاء ولم تسمح نفسہ بہا بدون التعلق علیہ مع ما فیہ من ایہام اعتقاد التاثیر للنذر فی حصول الشفاء اھ (یعنی اس کا یہ عمل عوض کے شائبہ سے خالی نہ رہا کیونکہ اس نے ایک عبادت کو شفاء کے مقابلے میں لاکھڑا کردیا اور ساتھ اس میں اس بات کا بھی احتمال ہے کہ وہ حصول شفاء میں نذر کو مؤثر اعتقاد کرنے لگے (جو ایک خلاف شرع عقیدہ ہے)

بخلاف نذر منجز کے کہ اس میں یہ علت نہیں فہو تبوع محض بالقربۃ للہ تعالیٰ والزام النفس بما عساہ لا تفعلہ بدونہ فیکون قربۃ کذا فی رد المختار ج ۱، ص۱۳۳ (یعنی نذر منجز ایک زائد چیز ہے جس سے مقصد اللہ کی عبادت ہے اور نفس کو ایک ایسی چیز کے ساتھ لازم کرنا ہے جسے بغیر نذر کے نفس کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا لہٰذا یہ عبادت ہوگی۔

"نماز و روزہ کے متعلق کوتاہیاں"

(فدیہ صوم و صلوٰۃ)

مثل دیگر طاعات مالیہ (مذکورہ سابقہ) اس میں بھی متعدد کوتاہیاں واقع ہوتی ہیں۔

اگر کسی کی کچھ نمازیں یا روزے رہ گئے ہوں جو اپنی زندگی میں ادا نہ کرسکے، مرتے وقت فدیہ کی وصیت کرنا ضروری ہے۔

مثلاً ایک کوتاہی یہ ہے۔ کہ باوجود اس کے کہ ان کے ذمہ بہت سی نمازیں اور روزے چڑھے ہوتے ہیں۔ مگر مرنے کے وقت بھی فدیہ کی وصیت نہیں کرتے حالانکہ ایسے شخص کو فدیہ کی وصیت کرنا واجب ہے۔

لوجوب الفدیۃ عن الصوم نصًا وعن الصلوٰۃ قیاسًا)

مقدار ایک روزہ اور ایک نماز کی فدیہ کے برابر صدقہ فطر کی ہے۔ خواہ غلہ یا قیمت یا ایک مسکین کو دو وقت کھانا کھلادینا اور نمازیں ایک دن کی پانچ فرض اور ایک وتر کل چھ ہیں۔

فدیہ کے بھروسہ پر نمازیں اور روزے قضا نہیں کرنے چاہئیں

اس کے مقابل ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے آدمی فدیہ کے بھروسہ اپنے اوپر نمازیں اور روزے چڑھاتے چلے جاتے ہیں کہ ہم مالدار ہیں۔ فدیہ کی وصیت کر جائیں گے۔ تو اس میں ایک تو بڑی بیباکی ہے کہ گویا نماز روزہ اس کے نزدیک قابل اہتمام ہی نہیں۔ خصوصاً مالداروں سے گویا اس کا جرمانہ لے کر ان کو سبکدوش کر دیا گیا ہے (نعوذ باللہ من ذالک)

دوسرے چونکہ نمازوں کا بہت عدد بڑھ جاتا ہے۔ اور اس لئے اس کا مجموعہ فدیہ اکثروں کی وسعت سے متجاوز ہو جاتا ہے۔ تو اگر کل ادا کیا گیا تو وارثوں کو ضرر پہنچایا گیا اور اگر کل ادا نہ ہوا تو اس کے ذمہ بار رہا اور یہ دونوں امر غیر مشروع ہیں۔
اور اسی فدیہ کے بھروسہ پر رہنے کے متعلق اس زمانہ میں نئی غلطی مگر بہت گندی غلطی یہ ایجاد کی گئی ہے کہ روزہ قضا ہو جاوے تو باوجود صحت بدن کے بھی اس کی طرف سے فدیہ دیدینا کافی ہے۔ روزہ رکھنا فرض نہیں (اس کا بطلان اچھی طرح سے احقر نے رسالہ اصلاح ترجمہ دہلویہ کے متن میں مختصراً اور اس کے خاتمہ یہ بعبادت عربیہ مبسوطاً اور عزیزم مولوی شبیر احمد صاحب سلمہ دیوبندی نے القاسم کے نمبر ۲ جلد میں عقلاً و نقلاً ثابت کر دیا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے)

قدرت یا امید قدرت کے ہوتے ہوئے فدیہ دینا درست نہیں ہوتا

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے لوگ باوجود اس کے کہ وہ نمازیں قضا کر سکتے ہیں۔ اور صحت سے بھی مایوس نہیں ہوئے اور صحت کے بعد روزے قضا کر سکتے ہیں۔ مگر پھر بھی ارزاں نسخہ فدیہ کا یاد کر کے اس کے استعمال کو کافی سمجھتے ہیں۔ سو سمجھ لینا چاہئے، کہ قدرت یا امید قدرت ہوتے ہوئے فدیہ دینا درست نہیں ہوتا۔ پس نماز پر تو انسان ہر وقت قادر ہے۔ اگر رکوع و سجود نہ ہو سکے اشارہ ممکن ہے۔ پس مرض میں بھی وقتیہ کو ادا اور

فائتہ کو قضا کر سکتا ہے۔ اس کا فدیہ تو اس لئے جائز نہیں رہا۔ روزہ تو جب تک صحت کی امید ہے۔ بعد صحت کے بقدر زمانہ صحت اس پر قضا کرنا واجب ہوگا۔

البتہ اگر ایسا مرض ہوگیا کہ اب بالکل امید صحت کی نہیں رہی۔ یا ایسا بوڑھا ہوگیا کہ اب بالکل امید قوت کی نہیں رہی۔ یا کسی نے عمر بھر روزہ رکھنے کی نذر کر لی تھی۔ مگر اب اس سے بالکل عاجز ہوگیا۔ حاصل یہ کہ ایسا عذر لازم ہوگیا کہ اب قضا پر قادر ہونے کا قطعاً احتمال نہیں رہا۔ ان حالات میں حیات میں بھی روزہ کا فدیہ دینا جائز اور کافی ہے۔ (ردالمحتار ج ۲ ص ۱۹۱)

اور اس کا مقتضاء یہ ہے کہ اگر قضاء نمازیں بہت کثرت سے ہوگئیں اور مرض کی ایسی حالت ہو کہ اشارہ سے بھی زیادہ قضاء نہیں پڑھ سکتا۔ اور امید صحت کی منقطع ہوگئی۔ تو بقدر قدرت قضاء کرنا واجب ہوگا۔ اور بقیہ کا فدیہ حیات میں بھی دینا درست ہوگا (لکن لم اراہ فلیراجع)

زندگی میں جواز فدیہ کی صورت

اور جو نمازیں اور روزے قضاء اور فدیہ سے رہ جاویں۔ ان کے فدیہ کے لئے وصیت کرنا واجب ہوگا۔ البتہ اگر ناامیدی کے قبل بھی اس نظریہ سے فدیہ دیدے کہ معلوم نہیں میرے ورثہ وصیت پر عمل کریں یا نہ کریں۔ اور یہ بھی نیت رکھے کہ بعد فدیہ کے اگر قدرت قضاء کی ہوگئی تو قضاء کر دوں گا۔ اور اگر قدرت نہ ہوئی۔ اور مسائل بالا کی رو سے جس مقدار فدیہ کا ناکافی ہونا ثابت ہوگا وصیت بھی کر دوں گا۔ ایسے فدیہ کا کچھ مضائقہ نہیں۔ بلکہ مستحسن اور احتیاط ہے۔ بشرطیکہ اگر مرض الموت میں ہو تو ثلث سے زیادہ نہ دے۔

اور قضاء سے ناامیدی ہونے کی حالت میں جو روزہ کے فدیہ کا جواز اوپر مذکور ہوا ہے اس میں ایک اور بھی شرط ہے وہ یہ کہ یہ روزہ کسی اور واجب کا بدل نہ ہو ورنہ اس میں یا اصل واجب کو ادا کرے۔ اور وہ نہ ہو سکا تو صرف وجوب وصیت متعین ہے فدیہ کسی حال میں نہیں ہو سکتا جیسا کفارہ یمین میں روزہ اس وقت ہوتا ہے جب اعتاق و اطعام وکسوت پر قدرت نہ ہو، پس اس روزہ کا فدیہ حیات میں درست نہیں اگر اصل اور بدل دونوں پر

قدرت نہ ہو تو مرتے وقت ترکہ میں فدیہ کی وصیت واجب ہوگی (ردالمختار ج ۱ ص ۱۹۱)

وارثوں کی کوتاہیاں

ایک کوتاہی وارثوں کی ہے کہ باوجود وصیت اور وسعت کے اس کی کچھ پرواہ نہیں کرتے اور میت پر گرانبار رہتا ہے حالانکہ ثلث کے اندر وصیت مقدم ہے ترکہ پر بھی۔

ایک کوتاہی پہلی کوتاہی سے کم درجہ کی یہ ہے کہ وہ بلا وصیت مرجاوے تو اس فدیہ سے کم درجہ کے مصارف میں بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ فضول مصارف میں اور اس سے بھی مزید یہ کہ معاصی میں میت کا ترکہ اڑاتے ہیں۔ مگر اس طرف کسی کو توجہ نہیں ہوتی کہ اور مصارف بند کرکے کچھ فدیہ میں دیدے۔ اور گو ایسی حالت میں دینا بعض فقہاء کے نزدیک مسقط واجب نہ ہوگا لیکن بعض کے نزدیک مثل حالت وصیت کے یہ بھی مسقط واجب ہو جاوے گا۔ اور جو مسقط واجب نہیں ان کے نزدیک بھی اس طرح سے نافع ہونا تو یقینی ہے۔ کہ میت کو اس کا ثواب ہی پہنچ جاوے گا۔ کیا عجب ہے کہ وہ ثواب اس ترک واجب کے عذاب کو زائل کردے۔ (ردالمختار ج ۱ ص ۱۹۱)

اور یہ کوتاہی کم درجے کی اس لئے ہے کہ صورت سابقہ میں بوجہ وصیت کے فدیہ واجب تھا اور اس صورت میں بوجہ وصیت نہ کرنے کے واجب نہیں ہوا۔ لیکن جب اس سے ان محل میں صرف کیا ہے تو یہ اس سے احق واسبق واقدم واہم ہے۔

جو فدیہ قواعد شرعیہ کے موافق نہ ہو وہ ادا نہیں ہوتا، اس کی ایک مثال

ایک کوتاہی ورثہ ہی کی یہ ہے کہ بعضے مقامات پر بزعم خود فدیہ ادا کرتے ہیں اور وہ بوجہ قواعد شرعیہ پر منطبق نہ ہونے کے ادا نہیں ہوتا اور ورثہ پر ارتکاب منہی عنہ کا اور مورث پر ترک عمل واجب کا بار رہتا ہے۔

اور وہ طریق غیر منطبق یہ ہے کہ میت کی تمام عمر کے نمازوں اور روزوں کا حساب کرکے اس کی ایک رقم مثلاً دس ہزار روپے تجویز کرکے ایک ملا کے ہاتھ ایک قرآن مجید دس ہزار

روپے کو ہدیہ کرتے ہیں، پھر وہ قیمت اس ملّا کو بہ نیت فدیہ کے معاف کر دیتے ہیں اور عمل کو اسقاط کہتے ہیں اور یہ صورت ان سب اسقاط کی صورتوں سے اسلم جن کو جہلاء عمل میں لاتے ہیں کہ ان میں تو کوئی شائبہ بھی انطباق علی القواعد کا نہیں ان میں سے یہ صورت سرسری نظر میں منطبق سمجھی جاتی ہے۔

لیکن ظاہر ہے کہ جب یہاں بیع مقصود نہیں تو ثمن بھی واجب نہ ہو گا۔ پھر فدیہ کس رقم سے ادا ہوا۔ اور دلیل بیع مقصود نہ ہونے کے علاوہ وجدان کے یہ ہے کہ اگر ملّا کو ثمن معاف نہ کیا جاوے بلکہ اس کا مطالبہ کرنے لگیں تو کیا اور تمام دیکھنے والے اس ثمن کو واجب اور اس مطالبہ کو حق سمجھیں گے ؟ ہرگز نہیں پھر یہ تو ایک قسم کا فریب دینا ہوا۔ البتہ جس کو وسعت کم ہو اس کے لئے دوسرا طریق درمختار میں لکھا ہے۔ وہ قواعد پر منطبق ہے مثلاً ایک روپیہ مسکین کو فدیہ میں دیا اور اس نے بخوشی ولی کو ہبہ کر دیا ولی نے پھر اس کو فدیہ میں دیا۔ اسی طرح اگر ہزار بار کیا تو ہزار روپیہ ادا ہو گئے۔ اور اس میں ہر بار میں اختیار ہے، جب چاہے رکھ لے دوسرے کو نہ دے۔ فقط

تنبیہ: صوم وصلوٰۃ کے فدیہ میں اباحت وتملیک اور ایک مسکین کو نصف صاع سے زائد دیدینا سب درست ہے لیکن نصف صاع سے کم نہ دے یہ یقینی ہو (ردالمحتار ج ۱ ص ۱۸۸ ص ۱۸۹) واللہ اعلم بالصواب

خلاصہ مضمون سابق

(تسہیل مضمون مذکور برعایت تفہیم جمہور)

بعنوان مسائل

مسئلہ: جس شخص کے ذمے کچھ نمازیں اور روزے قضا ہوں اور ان کو قضا نہ کر سکا ہو اس کو واجب ہے کہ مرنے سے پہلے ان کے فدیہ کی وصیت کر جاوے۔

مسئلہ: ایک روزے کا فدیہ اس قدر ہے جس قدر صدقہ فطر دیا جاوے۔ اسی طرح ایک نماز کا بھی اسی قدر ہے اور ہر روز کی چھ نمازیں شمار کی جاتی ہیں۔ پانچ تو فرض اور ایک واجب یعنی وتر۔ مسئلہ: فدیہ کے بھروسہ نماز اور روزہ کا قضاء کر ڈالنا

یا جو قضا ہو گئے ہیں ان کی ادا میں سستی کرنا سخت گناہ ہے۔

مسئلہ: بیماری میں جو روزے قضا ہوئے اگر اس بیماری کے بعد زمانہ صحت اتنا ملا جس میں کل روزے یا بعض روزے قضا رکھ سکتا تھا۔ اسی قدر واجب ہوں گے باقی واجب نہ ہوں گے تو اگر بیس روزے قضا ہوئے۔ دس کی طاقت مل سکی اور قضا رکھنے نہ پایا تھا کہ موت آگئی تو دس روزے کے فدیہ کی وصیت واجب ہوگی۔ **مسئلہ:** فدیہ کی وصیت ثلث ترکہ سے زائد میں صحیح نہیں یعنی تجہیز و تکفین اور قرض سے مثلاً تین سو روپے بچ گئے تو سو روپے سے زائد میں وصیت صحیح نہ ہوگی۔ البتہ اگر بالغ وارث اپنے حصہ میں جائز رکھے تو ان کو اختیار ہے۔ **مسئلہ:** جبتک روزہ قضا کرنے کی قدرت رہے اس وقت تک فدیہ دینا کافی نہیں۔ بلکہ قضا ہی رکھنا فرض ہوگا۔ ایک مترجم قرآن کے حاشیہ پر وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ الآیۃ کی تفسیر میں جو اس کے خلاف لکھدیا ہے وہ بالکل غلط ہے اس پر عمل حرام ہے۔ اہل علم نے اپنی تحریرات میں اس کی غلطی کھول دی ہے۔

مسئلہ: اسی طرح جب تک امید صحت اور قوت کی ہو فدیہ دینا کافی نہیں۔ البتہ اگر کوئی ایسا مرض ہو کہ اس سے صحت کی امید نہ رہے اور مرض کی حالت میں قوت نہ ہو یا بہت بوڑھا ہو گیا اور قوت روز بروز گھٹتی جاتی ہو۔ تو ایسے شخص ادا اور قضا روزہ کے بدلے فدیہ دینا درست ہے۔ اسی طرح سے اگر نادانی سے بارہ مہینہ روزہ سے رہنے کی نذر کرلی تھی اور اب ہار گیا تو اس کو بھی روزانہ روزے کا فدیہ دینا درست ہے۔ **مسئلہ:** لیکن مرض و ضعف میں نماز چونکہ اشارہ سے بھی درست ہے۔ اس لئے قضا نمازوں کا فدیہ اس وقت درست ہو سکتا ہے۔ جب اشارہ سے بھی ان کے پورا کرنے کی امید نہ رہے۔ جیسے مرض الموت میں ایسی حالت ہو جاتی ہے (مگر اس مسئلہ کو زیادہ تحقیق بھی کرلیا جاوے)

مسئلہ: اگر کوئی ایسی حالت میں کہ فدیہ کافی نہ ہو۔ اس نظر سے فدیہ دیدے کہ شاید میری وصیت کو وارث پورا نہ کریں اور یہ بھی نیت رکھے کہ اگر صحت و قوت عود کر آئے تو اس فدیہ کو کافی نہ سمجھوں گا بلکہ نمازیں اور روزے قضا کروں گا تو اس کا مضائقہ نہیں۔ **مسئلہ:** جو روزہ قسم کے کفارہ میں اس پر واجب تھا۔ حیات میں اس کا فدیہ درست نہیں بلکہ اگر اخیر عمر تک ادا سے عاجز رہے تو مرتے وقت فدیہ کی وصیت کرے۔

مسئلہ: اگر میت بلا وصیت مرجاوے۔ تب بھی ورثہ کو بہت ثواب ہوگا۔ اگر اس کی نماز اور روزہ کا فدیہ ادا کردیں۔

مسئلہ: ایک عمل بعض جگہ عوام میں اسقاط کے نام سے مشہور ہے۔ اس سے فدیہ ادا نہیں ہوتا۔

مسئلہ: جہاں رقم فدیہ بہت زیادہ ہو اور اس قدر گنجائش ہو نہیں تو بالکل اس کو نظر انداز کرنے سے یہ صورت کرلیں کہ مثلاً وارث ۱۰ روپے کسی مسکین کو بہ نیت فدیہ دیں پھر وہ اپنی خوشی سے اس وارث کو وہ رقم ہبہ کردے۔ یہ وارث پھر اس کو بہ نیت فدیہ کے دیں۔ تو گویا بیس روپے فدیہ میں پہنچے اسی طرح اگر سوبار کیا تو ہزار روپے ادا ہوگئے مگر گنجائش ہوتے ہوئے ایسا نہ کرے۔

مسئلہ: فدیہ میں اختیار ہے خواہ مساکین کو بٹھلا کر کھلاوے۔ خواہ غلہ بقدر صدقہ فطر دیدے یا اتنی قیمت دیدے کہ ایک مسکین کو ایک حصہ سے کم نہ دے۔ زیادہ دینا درست ہے یعنی ایک مسکین کو کئی حصے ایک تاریخ میں دیدینا بھی درست ہے۔

صدقۂ نافلہ کے متعلق کوتاہیاں

(اصلاح معاملہ بصدقۂ نافلہ)

منجملہ طاعات ملحقہ بزکوٰۃ جن کا اوپر سے ذکر چلا آرہا ہے۔ ایک صدقۂ نافلہ ہے اس میں بھی مثل دیگر اعمال کے متعدد کوتاہیاں واقع ہورہی ہیں۔

شریعت میں صدقات نافلہ کا بھی حکم ہے۔

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض لوگ باوجود زائد علی الحاجۃ ہونے اور مصارف دینیہ ضرورۃ پیش آنے کے محض بوجہ بخل کے بجز زکوٰۃ اور صدقات واجبہ کے صدقہ نافلہ میں ایک کوڑی خرچ نہیں کرتے بلکہ میں نے ان میں سے بعض سے سُنا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہم کو ایک فہرست دیدی ہے۔ ہم کو اس سے تجاوز کرنا کیا ضرور۔ تو ایسے لوگ صرف یہی نہیں کہ صدقات نافلہ میں بے رغبت ہوں بلکہ اس سے ترقی کر کے ان کو ناپسند اور ان کو زیادت علی الشرع سمجھتے ہیں۔ یہ شیطان کی بہت بڑی رہزنی ہے جو براہ تلبیس دین کے

پردہ میں کی ہے۔ اور مکروہ کو بصورت مستحسن دکھلایا ہے۔ چونکہ منشار اس کا بخل ہے۔ اس لئے ناپسندیدہ ہونا اس ترک صدقہ کا ظاہر ہے اور علاوہ قواعد کلیہ شرعیہ کے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی کسی درجہ میں مہتم بالشان ہونے کی تصریح بھی فرمائی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ ان فی المال لحقا سوی الزکوۃ۔ یعنی مال میں زکوٰۃ کے سوا اور بھی بعض حقوق ہیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے استشہاد میں اس آیت کی تلاوت فرمائی۔ داتی المال علی حبہ ذوی القربی والیتامیٰ والمساکین وابن السبیل والسائلین وفی الرقاب واقام الصلوٰۃ والتی الزکوٰۃ۔ ترجمہ: اور مال دیتا ہو اللہ کی محبت میں رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور مسافروں کو اور سوال کرنے والوں کو اور گردن چھڑانے میں اور نماز کی پابندی رکھتا ہو اور زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہو

اور وجہ استشہاد ظاہر ہے کہ آتی المال الخ کو اٰتی الزکوٰۃ سے علیحدہ فرمایا جس سے معلوم ہوا کہ یہ علاوہ زکوٰۃ کے ہے۔ اور اس کو صدقات واجبہ کے ساتھ خاص نہیں کہہ سکتے۔ چنانچہ آتی المال کے بعد مصارف کو بعنوان استحقاق و احتیاج کے بیان فرمانا مشیر اس طرف ہے کہ مسوق لہ الکلام ان کے حقوق و حاجات کو پورا کرنا ہے۔ اور ان کے مصارف زکوٰۃ کی حیثیت سے مذکور نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس کے بعد زکوٰۃ کا مستقلاً بیان ہے جس سے ثابت ہوا کہ زکوٰۃ کے علاوہ جو اتنا مال ہو وہ اس حیثیت سے مطلوب ہے کہ ان مصارف کی اعانت ہے۔ اور ظاہر ہے کہ صدقات واجبہ میں خود وہ تصدق بھی شرعاً مقصود ہوتا ہے۔ اعانت کی یہ خصوصیت مقصود نہیں ہوتی۔ پس یہ قرینہ ہے اس کا کہ یہ شامل ہے صدقات نافلہ کو بھی۔

ایک شبہ کا ازالہ

اور بعد استشہاد بالآیت کے اس شبہ کا جواب بھی ہو گیا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو ایک فہرست دیدی ہے پھر اس سے تجاوز کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ جواب یہ ہوا کہ اس فہرست میں صدقہ نافلہ بھی تو داخل ہو گیا۔ چنانچہ ابھی ظاہر ہوا۔ پھر اگر فہرست سے مراد فہرست واجبات کی لی جاوے۔ تو اول تو جب دونوں فہرستیں ہم کو دی گئی ہیں پھر وجہ کیا کہ ایک فہرست کو لیا جاوے اور دوسری کو چھوڑا جاوے۔ دوسرے تجاوز کرنے کے یہ معنی ہی غلط

ہیں۔ کہ نوافل کو ادا کیا جاوے۔ اگر یہ ہے تو نوافل کے فضائل منصوصہ کا کیا جواب ہوگا۔ بلکہ مطلب اس کا یہ ہے کہ حدود کو نہ چھوڑا جاوے۔ مثلاً جس جگہ صرف کرنا ممنوع ہے وہاں پر صرف کیا جاوے۔ یا اتفاق غیر واجب کو واجب سمجھ لیا جاوے۔ پہلا تجاوز عملی اور معصیت ہے اور دوسرا تجاوز اعتقادی اور بدعت ہے۔ اور جب یہ نہ ہو تو وہ تجاوز نہیں ہے۔

اور بعض صدقات نافلہ کے اعتبار سے ایک اور بھی جواب ہو سکتا ہے۔ وہ یہ کہ بعضے ان میں سے تامل کرنے سے فہرست واجبات ہی میں داخل معلوم ہوتے ہیں اور ان کو نفل کہنا باعتبار ان کی ذات کے قطع نظر خصوصیات سے ہے ورنہ عوارض کے اعتبار سے وہ واجب ہی ہے۔

"واجبات کی دو قسمیں ہیں"

پس واجبات کی مشہور فہرست مطلق واجب کی فہرست نہیں ہے بلکہ وہ واجبات موظفہ کی فہرست ہے۔ یعنی ایک وہ واجبات ہیں۔ جو فی نفسہ واجب ہے۔ عوارض و خصوصیات کا اس میں دخل نہیں۔ جیسے زکوٰۃ صدقۂ فطر وغیرہما خواہ کوئی مستحق پیش نظر ہو یا نہ ہو مال میں سے مقدار خاص نکالنا ضروری ہے۔ پھر مستحق کو تلاش کرکے اس تک پہنچانا ضروری ہے۔ ان کو واجبات موظفہ کہنا چاہیئے۔

دوسرے وہ واجبات کہ اگر کوئی مستحق معلوم نہ ہو تو اس کا تلاش کرنا ضروری نہیں۔ اس مرتبہ وہ نفل ہے لیکن اگر کوئی مستحق روبرو آجاوے اور اس کی احتیاج درجۂ اضطرار تک ہو یا کوئی مصرف دینی عارض ہو جاوے اور اس کی تکمیل درجۂ ضرورت تک ہو تو اس وقت اس میں خرچ کرنا واجب ہوگا۔ کہیں علی الکفایہ کہیں علی العین، مثلاً کوئی مسافر محلہ کی مسجد میں اترے اور سب اہل محلہ اپنے گھروں میں کھائیں پئیں اور اس کو نہ پوچھیں تو سب گنہگار ہوں گے۔ اس وقت اس کی اعانت سب اہل محلہ پر اور ان کی اعانت نہ کرنے کی صورت میں جس کو خبر پہنچی ان سب پر واجب ہے علی الکفایہ۔

اور اگر کوئی کھانا لے کر بیٹھا اور کھانا اس کی حاجت سے بہت زائد ہے اور ایسے میں کوئی گرسنہ آیا جس کی جان بھوک سے نکل جاتی ہے اور اس نے آکر اس شخص سے سوال کیا

تو حضرت استاذی مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ کیا کوئی اس کا قائل ہو سکتا ہے۔ کہ اس شخص پر اس سائل کو بقدر ضرورت کھانا دینا واجب نہیں اور یہ وجوب اس وقت علی العین ہوگا۔

پس حاصل یہ ہوا کہ بعض صورتیں صدقہ نافلہ کی بھی واجب ہیں اور تنفل اور وجوب کے اجتماع کا اشکال ابھی مرتفع کر دیا گیا ہے۔ اور بعض صدقات نافلہ جو ہر حال میں نافلہ ہیں گو ایسے بہت کم نکلیں گے لیکن جتنے بھی ہوں وہ گو فہرست واجبات میں داخل نہ ہوں مگر ان میں جواب سابق جاری ہوگا۔ یعنی ہم کو دوسری فہرست بھی ملی ہے۔ پس دونوں فہرستوں پر عمل کرنا چاہیئے اور تارکین صدقہ نافلہ کے ذم میں یہ قید جو لگائی گئی کہ محض بخل کی وجہ سے الخ وجہ اس کی یہ ہے کہ سبب اس کا کبھی کوئی مصلحت باطنی ہوتی ہے یعنی افتقار و انکسار واسطے معالجہ عجب و ادلال کے یا عدم حصول خشوع و خلوص یا حسم مادۂ مدح و مثل ذالک سو وہ مذموم نہیں لیکن یہ ترک اس مصلحت کے وجود تک محدود ہوتا ہے۔ اس کے بعد یہ ترک متروک ہو جاتا ہے۔ اور یہ مسئلہ فن سلوک کا ہے یہ مقام اس کے ذکر کا نہیں ہے۔ ایسے تارک نوافل کو اصطلاح میں قلندر کہتے ہیں۔ یہاں تک بحث تھی ترک صدقات نافلہ کی جو کہ اس کے متعلق ایک کوتاہی ہے۔

"صدقہ نافلہ میں زیادہ غلو بھی درست نہیں"

ایک کوتاہی اس باب میں اس کے مقابل یہ ہے کہ ان کو اس باب میں اس قدر غلو ہوتا ہے کہ گو حقوق واجبہ ضائع ہو جاویں۔ گو قرض خواہ روتے پھریں۔ مگر ان کو اس کا شوق ہے کہ کوئی سائل اور مسافر محروم نہ جاوے۔ خاص خاص تاریخوں میں خاص صدقات قضاء نہ ہوں اور اس پر بعض اوقات خود بھی فخر کرتے ہیں اور دوسرے خود غرض لوگ اور بعضے بے غرض مگر کم فہم لوگ مدح بھی کرتے ہیں حدیث وابدء بمن تعول (اپنے زیر پرورش والوں سے شروع کرو) اس طرز کو ناجائز بتلا رہی ہے حقوق واجبہ اہل و عیال کے ہوں یا قرض

خواہوں کے یہ ان نوافل سے مقدم ہے بلکہ اگر کسی کے ذمہ کوئی حق واجب بھی نہ ہو مگر اپنی طبیعت کے انداز سے جانتا ہے کہ ناداری کا تحمل نہ کر سکے گا تو ایسے شخص کو بھی جائز نہیں کہ تمام ذخیرہ مصارف خیر میں صرف کر کے خالی ہاتھ رہ جاوے۔ حدیث "افضل الصدقۃ ماکان عن ظہر غنی" بہترین صدقہ وہ ہے جو (کہ انسان تمام مصارف ضروریہ سے) بے نیاز ہو کر کرے" اس پر صاف دال ہے۔ اور اکثر تو ایسے لوگ ریاءً یا وافتخاراً خرچ کیا کرتے ہیں۔ سو اس کا مذموم ہونا ظاہر ہی ہے (یہاں چندہ جمع کرنے والوں کو بھی متنبہ ہونا چاہیئے کہ ایسے لوگ جو اپنی حیثیت سے زائد جوش میں آکر دینا چاہیں تو یہ حضرات نہ لیا کریں)

صدقہ صرف اللہ کے نام پر دینا چاہیئے کسی دوسرے کے نام پر دینا شرک ہے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے آدمی جو صدقہ نافلہ نکالتے ہیں ان کا دل گوارا نہیں کرتا کہ محض حق تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے خرچ کریں۔ بلکہ وہ ہر چیز کو کسی پیر فقیر شہید ولی کے نامزد کر دیتے ہیں۔ سو اگر خود وہ بزرگ ہی اس سے مقصود ہے تو وہ ما اھل بہ لغیر اللہ۔ الایۃ (یعنی جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو) میں داخل ہو کر بڑی دور یعنی حد شرک تک پہنچ گیا۔ اور بعض غلاۃ جہلاء کا واقعی یہی عقیدہ ہے۔ سو ایسی چیز کا تناول بھی درست نہیں۔

اور اگر مقصود اس عمل سے حق تعالیٰ ہے اور ان بزرگ کو محض ثواب ہی بخشنا ہے تو وہ اس حد تک تو نہیں پہنچا اور ظاہراً جائز بھی ہے۔ لیکن عوام بلکہ بعض خواص کالعوام کے حالات وخیالات کی تفتیش سے، معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ محض ثواب ہی پہنچانے کو مقصود نہیں سمجھتے بلکہ ان کی نیت یہ ہوتی ہے کہ فلاں ولی کو ثواب پہنچے گا تو وہ خوش ہوں گے اور ہماری اس حاجت میں مدد کریں گے خواہ تصرف باطن سے اور زیادہ عقیدہ یہی ہے اور اس کا بھی قریب شرک ہونا ظاہر ہے۔ اور خواہ دعاء سے سو احتمال دعاء کا عقیدہ تو ناجائز نہیں۔ لیکن دو عقیدے اس میں بھی فاسدین ایک اس احتمال

کے وقوع کا عقیدہ کرنا کہ جس پر کوئی دلیل نہیں اور بلا دلیل عقیدہ کرنا کذب نفس اور مخالف ہے۔ آیت "لاتقف ما لیس لک بہ علم" جس کا تجھے علم نہیں اس کے پیچھے نہ پڑ" کی دوسرے بعد فرض وقوع دعا اس دعا کے بالقطع مقبول ہو جانے کا عقیدہ کرنا دعا تو بعض اوقات حضرات انبیاء علیہم السلام کی بھی کسی مصلحت سے قبول نہیں ہوتی۔ تا بغیر انبیاء چہ رسد۔

اس لئے مصلحت یہی ہے کہ جب بزرگوں کو کچھ بخشنا ہو اپنی حاجت کا خیال ان میں نہ ملایا کریں۔ کہ توحید کے خلاف ہے کما ذکر۔ اور اگر بہت ہی احتیاط کی تو اخلاص کے تو خلاف ہے۔ ایسی مثال ہو گئی کہ کسی زندہ کو ہدیہ دیا وہ سمجھا کہ محبت سے دیا۔ اور خوش ہوا پھر معلوم ہوا کہ کسی مطلب کو دیا فوراً وہ مکدر ہو جاوے گا۔

صدقہ میں ردّی اور خراب چیز نہ دینا چاہئیے

ایک کوتاہی یہ ہے۔ کہ اکثر لوگ اللہ کی نام کی وہ چیزیں نکالتے ہیں جو کسی کے کام کی نہ رہی ہو۔ مثلاً کھانا جب دیں گے کہ سڑ جاوے کپڑا جب دیں گے کہ گل جاوے۔ وعلی ھذا حق تعالیٰ کا ارشاد ولا تیمموا الخبیث منہ تنفقون ولستم باخذیہ الا آن تغمضوا فیہ واعلموا ان اللہ غنی حمید اور ردی چیز کی طرف نیت مت لے جایا کرو کہ اس میں سے خرچ کرو حالانکہ تم کبھی اس کے لینے والے نہیں۔ ہاں مگر چشم پوشی کر جاؤ (تو اور بات ہے) اور یہ یقین کر رکھو کہ اللہ تعالیٰ کسی کے محتاج نہیں تعریف کے لائق ہیں۔ اس باب میں کافی ہدایت ہے۔ حق تعالیٰ کا اس میں یہ ارشاد ہے:۔
لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون الخ .... تم خیر کامل کو کبھی حاصل نہ کر سکو گے یہاں تک کہ اپنی پیاری چیز کو خرچ نہ کرو گے۔ اور اس سے یہ نہ سمجھا جاوے کہ پرانا کپڑا مثلاً خدا کی راہ میں دینا ممنوع ہے۔ حدیث میں نیا کپڑا پہن کر پرانا دیدینے کی خود فضیلت آئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ برا ہے۔ کہ جب دے ناکارہ چیز ہی دے اور اگر اصل عادت تو عمدہ چیز دینے کی ہو۔ اور پرانی پھٹی چیز بھی دیدیا کرے تو مضائقہ نہیں تو ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ پرانی ہی دیا

کرے اور پانی بھی دیا کرے۔ اول مذموم دوسرا ماذون فیہ

وارثوں کو محروم کر کے تمام مال خرچ نہیں کرنا چاہیئے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے آدمی صرف وارثوں کو محروم کرنے کے لئے سب اندوختہ خیرات کر ڈالتے ہیں۔ مبنی اس غلطی کا یہ ہے کہ وارثوں کے لئے چھوڑ جانے کے ثواب کی ان کو خبر نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے ہی موقع پر یہ ارشاد فرمایا ہے:۔ وانک ان تذر ورثتک اغنیاء خیر من ان تذرھم عالۃ یتکففون الناس۔ اور تم اپنے ورثہ کو غنی، چھوڑ نا یہ بہتر ہے تیرے لئے اس سے کہ تم ان کو فقیر کی حالت پر چھوڑ دو اور وہ لوگوں سے (بھیک) مانگتا پھرے۔ اور گو وہ ملک اضطراری ہے۔ جس میں مورث کے قصد کو بھی دخل نہیں۔ لیکن حدیث میں ہے کہ کھیت میں سے اگر کوئی بہیمہ کھا جاوے تو کھیت والے کو ثواب ملتا ہے۔ تو کیا مسلمان وارث بہائم سے بھی گئے گذرے ہوئے۔

کوئی تاریخ متعین کر کے صدقہ دینا بدعت ہے۔

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض صدقات کو بطریق بدعت خرچ کرتے ہیں۔ جیسے خاص تاریخوں کی پابندی سے یا میت کے رسوم میں اس کی تفصیل اصلاح الرسوم میں ملاحظہ فرمائی جاوے۔

میت کی کوئی چیز وارثوں کی اجازت کے بغیر صدقہ کرنا درست نہیں

ایک کوتاہی یہ ہے کہ اکثر شرائط شرعیہ کا لحاظ نہیں کرتے۔ خواہ وہ شرائط ظاہرہ ہوں۔ مثلاً میت کے کپڑے حسب رواج سب نکال کر مدارس ومساجد ومساکین کو دیدیئے جاتے ہیں۔ حالانکہ ترکہ مشترکہ میں بالغین کا اذن شرط ہے اور اذن بھی وہ جو بطیب خاطر ہو شرم اور لحاظ اور پابندی رسم کی مجبوری سے نہ ہو۔ اور نابالغوں کا اذن بھی معتبر نہیں یہ بلا بھی بہت عام ہے۔ اور خواہ شرائط باطنہ ہوں مثلاً قبول ہونے کی یہ شرط ہے کہ ریا وافتخار سے نہ ہو مال حرام سے نہ ہو اس میں بہت بے پروائی ہے۔ اکثر نمائش کے لئے خرچ ہوتا ہے۔ اکثر سود اور رشوت سے نیک

کاموں میں لگاتے ہیں اور یہ بھی شبہ نہ کرے کہ حلال اس زمانے میں کہاں ہے۔ تو کیا نیک کاموں میں خرچ کرنا بالکل ہی چھوڑ دیں۔ جواب یہ ہے کہ یہی غلط ہے کہ اس زمانہ میں حلال نہیں۔ ابواب فقیہہ دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ معاملات میں بہت توسع ہے۔ پھر اگر حلال غالب بھی ہو تب بھی صرف کرنا امور خیر میں جائز ہے۔ گو اس میں جتنا جز حرام ہے۔ اس کی تحصیل کا گناہ مستقل ہوگا۔ فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ ط جو شخص ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا اور جو شخص ذرہ برابر بدی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا۔

خلاصہ مضمون سابق

(تسہیل مضمون مذکور برعایت تفہیم جمہور)

مسئلہ: علاوہ صدقات واجبہ کے کبھی کبھی کسی قدر نفل صدقہ بھی نکالا کرو اور حاجتمندوں کو دیا کرو اور نیک کاموں میں خرچ کیا کرو۔ مسئلہ: نفل صدقہ میں یہ خیال کیا کرو کہ کسی کا حق واجب ضائع نہ ہو۔ مثلاً اپنے اہل وعیال کو پہلے دو۔ کسی کا قرض آتا ہو۔ اس میں پہلے دو۔ جب ان سب سے بچے نیک راہ میں اٹھاؤ۔

مسئلہ: بعض نفل صدقہ بعض خاص موقع پر واجب ہو جاتے ہیں۔ جیسے کوئی بھوکا آجاوے۔ تو ہمارے پاس کھانا زیادہ موجود ہو تو اس کی امداد واجب ہوگی۔ یا کہیں اشاعت علوم دینیہ کی ضرورت ہو۔ اور وہاں مدرسہ قائم کیا جاوے۔ تو سب پر واجب ہوگا کہ چندہ
علوم دینیہ کی ضرورت ہو۔ اور وہاں مدرسہ قائم کیا جائے تو سب پر واجب ہوگا کہ چندہ سے اعانت کریں مسئلہ: اتنا خیرات نہ کر ڈالے کہ خود محتاج ہو کر بیٹھ رہے۔ اور پھر صبر نہ ہو سکے۔ اس لئے گناہوں میں مبتلا ہو جاوے۔ مسئلہ: جو شخص اپنی گنجائش سے زیادہ دے۔ لینے والے کو چاہیئے نہ لے اور سمجھاوے۔ مسئلہ: بعضے لوگ بزرگوں کو اس لئے ثواب پہونچاتے ہیں کہ وہ خوش ہو کر۔ ہمارا کام کر دیں گے۔ سو یہ شرک ہے اور اگر یہ سمجھے کہ دعا کریں گے اور وہ دعا ضرور قبول ہوگی۔ تو یہ دونوں مقدمات بھی غلط ہیں۔ نہ تو کہیں یہ ثابت ہے کہ وہ ضرور دعا کریں گے۔ اور نہ یہ ثابت ہے کہ دعا ضرور قبول ہوگی۔ پس ایسی مشکوک بات کا پختہ یقین کر لینا بھی گناہ ہے۔ مسئلہ: اللہ کی راہ میں جو چیز دی جاوے وہ اچھی کار آمد ہونا چاہیئے۔ ایسا شخص کبھی پرانے پھٹے بھی دیدے۔

تو اجازت ہے اور ہمیشہ نکمی ہی چھانٹ کر دینا یہ برا ہے۔ مسئلہ: جس کے وارث موجود ہوں۔ اپنا تمام مال خیرات میں نہ لٹا دیوے۔ خاص کر جب وہ حاجت مند ہوں۔

مسئلہ: بعض بدعات کا رواج ہو گیا ہے۔ ان میں صرف کرنے سے ثواب نہیں ہوتا پس ان میں خرچ نہ کرے۔ مسئلہ: مردہ کے سب کپڑے اللہ کی راہ میں اس طرح دیدینا کہ نہ غیر حاضر وارثوں سے اجازت لی جاوے۔ اور نہ نابالغوں کے حصہ بدلا ان کو دیا جاوے۔ جیسا عام رواج ہو رہا ہے جائز نہیں۔

مسئلہ: صدقہ قبول اس وقت ہوتا ہے جب کہ اس میں نمائش نہ ہو۔ فخر و قصد شہرت نہ ہو۔ اور مال بھی حلال ہو۔ اگر کسی کے حلال خالص نہ ہو۔ تو حلال غالب ہو۔ مثلاً دس روپے میں اگر چھ حلال۔ اور چار حرام ہوں۔ اور ان سب روپوں میں تمیز نہ رہے تو مجموعہ کو نیک کام میں کرنا جائز ہے۔ اگرچہ ان چار روپوں کے کمانے کا گناہ الگ ہو گا۔

مختلف مالی تبرعات کے متعلق کوتاہیاں

(اصلاح معاملہ بہ تبرعات مالیہ متفرقہ)

منجملہ تطوعات مالیہ ملحقہ بزکوٰۃ کے اور بھی بعض اعمال ہیں۔ جن میں مختلف کوتاہیاں ہوتی ہیں مختصراً ان کا بیان بھی مناسب مقام ہے۔ ایک ان میں سے سائل کو دینا ہے۔ اس میں چند کوتاہیاں ہوتی ہیں۔ بعض دینے میں اور بعض نہ دینے میں۔

سائل سے بے رخی اور اسے تکلیف نہیں پہنچانا چاہیئے بلکہ اسے دیکھ کر اللہ کی نعمت یاد کرنا چاہیئے۔

چنانچہ بعضے تو بوجہ بخل یا بے رحمی کے سائل سے نہایت نفرت اور بے رخی کرتے ہیں۔ گو وہ کیسا ہی محتاج یا اپاہج ہو۔ اس کے حال پر ذرا توجہ نہیں کرتے بلکہ بعضے تو بالعکس اس سے تمسخر یا اس کے ساتھ سختی کرتے ہیں۔ دھکے دلوا دیتے ہیں۔ پٹواتے ہیں۔ قرآن وحدیث میں سائل کا بڑا حق آیا ہے۔ دوسرے سائل کو دیکھ کر حق تعالیٰ کی نعمت کو یاد کرنا چاہیئے کہ ہم کسی کے دروازے پر سائل نہیں ہوئے۔ اور اس نعمت کے شکر میں سائل پر رحم اور اس کی اعانت کرنا چاہیئے۔

اس مضمون کو شیخ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ نے نظم میں خوب ادا فرمایا ہے۔

نہ خواہندہ بر در دیگراں

بشکرانہ خواہندہ از در مراں

البتہ یہ ضروری نہیں کہ جو مانگے وہ ضرور ہی دے۔ یہ اس کی حاجت اور اپنی گنجائش پر ہے اور اگر اتفاق سے دینے کو نہ ہو تو اس کو نرم جواب دیکر سمجھاوے کہ اس وقت میرے پاس گنجائش نہیں ہے۔ اگر دوسرے وقت وسعت ہوئی اور تمہاری حاجت اس وقت تک رفع نہ ہوئی تو انشاء اللہ تعالیٰ خیال رکھوں گا۔

صدقہ دیکر احسان جتلانا ممنوع ہے

اور بعضے دیتے تو دیتے ہیں لیکن دیکر اس کو خریدنا چاہتے ہیں یعنی اس کے منتظر رہتے ہیں کہ وہ ہمارا احسان مند ہو۔ ہمارا شکریہ ادا کرے۔ جب ہم سے ملے ہم کو سلام کرے۔ اگر ہم کچھ حکم دیں تو وہ اس کا امتثال کرے اور اگر سائل کی طرف سے کسی امر میں کوتاہی ہو تو اس کو سخت تعجب ہوتا ہے اور ناگوار گذرتا ہے اور آئندہ کو سلسلہ احسان کا بند کرنے کا ارادہ کر دیتے ہیں بالخصوص اگر اس کی طرف سے کسی معاملہ میں، گو اس میں وہ سائل ہی حق پر ہو۔ صفائی کا برتاؤ عمل میں آوے تو اس وقت تو صاف صاف کہتے ہیں کہ یہ بڑا نمک حرام ہے۔ ہم نے اس اس طرح اس پر احسان کئے اور اس نے ہمارا خیال نہ کیا۔

اس طرح بے مروتی کی من واذیٰ جس کی ممانعت قرآن مجید میں آتی ہے وہ یہی ہے۔ اس سے صدقہ کا اجر باطل ہو جاتا ہے حق تعالیٰ شانہ نے ایسے دینے والوں کی مدح وفضیلت بیان فرمائی ہے جو دیکر اس کا صلہ اور شکریہ نہیں چاہتے۔ لوجہ اللہ خدمت کرنا یہی ہے — قال اللہ انما نطعمکم لوجہ اللہ لا نرید منکم جزاء ولا شکورا۔..... ہم تم کو محض خدا کی رضامندی کے لئے کھانا کھلاتے ہیں۔ نہ ہم تم سے (اس کا فعلی) بدلہ چاہیں اور (اس کا قولی) شکریہ (چاھیں)

بعضے اس کے مقابل یہ افراط کرتے ہیں کہ ہر سائل کو دنیا فرض سمجھتے ہیں بعضے تو تفاخر

کے واسطے کہ نام ہوگا کہ فلاں شخص کے پاس سے کوئی سائل محروم نہیں آتا اور بعضے بوجہ غایت تدین ذقلت علم کے کہ اس کی حاجت روائی کو فرض شرعی سمجھتے ہیں۔ اور بعضے بوجہ طمع یا خوف دینوی، کے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ شاید اس پردہ میں کوئی کامل ہو۔ اس کی خدمت کرنے سے ہم مالامال ہوجاویں گے۔ مال میں اولاد میں ترقی ہوگی۔ اور اگر نہ دیں گے۔ شاید بددعا کریں۔ یا ناراض ہوجاویں۔ تو ہم برباد ہوجاویں گے اور اس افراط کے سبب (جس کا منشار مختلف ہے کہ بعض میں تفاخر بعض میں کثرت تدین ہے اور قلتہ العلم بعض میں غرض دینوی) یہ لوگ اکثر قرض دار بھی ہوجاتے ہیں اور اس قرض کا خمیازہ کبھی اپنے کو بھگتنا پڑتا ہے۔ کبھی اولاد کو کبھی ادا نہیں ہوتا۔ اور آخرت کا گناہ سر پر رہتا ہے۔ حق تعالیٰ نے یہ نہیں اجازت دی کہ خود ننگے ہوجاؤ مگر سائل کا پیٹ بھرو۔ قال اللہ تعالیٰ لا تجعل یدک مغلولۃ الی عنقک اور نہ رکھ اپنا ہاتھ بندھا ہوا اپنی گردن کے ساتھ۔ اس میں تفریط مذکور اولا کی اصلاح ہے)۔ ولا تبسطہا کل البسط فتقعد ملوما محسورا۔ اور نہ کھول دے اس کو بالکل، پھر تو بیٹھ رہے الزام کھایا ہارا ہوا (یعنی ایسی کشادہ دستی نہ دکھلا کہ پھر بھیک مانگنی پڑے)

کمانے کے قابل شخص کو سوال کرنا جائز نہیں

بلکہ بعض اوقات باوجود اپنی گنجائش دنحمل کے بھی بعض مسائل کو دینا بجائے ثواب یا جائز کے گناہ اور ناجائز ہوتا ہے۔

فقہار نے تصریح فرمائی ہے کہ اگر ایک سائل قوی مکتسب ہو۔ یعنی ہاتھ پاؤں سے درست ہو اور معاش کی قدرت رکھتا ہو تو ایسے سائل کو سوال کرنا بھی حرام ہے اور سوال پر اس کو دینا بھی بدیں وجہ کہ اعانت علی المعصیت ہے۔ ناجائز ہے اور جب ناجائز ہوا۔ تو ایسے دینے سے وہی مثل ہوگئی۔ نیکی برباد گناہ لازم اور اکثر تو بلا ٹالنے کے لئے اس طرح دیتے ہیں کہ ثواب کی بھی نیت نہیں ہوتی۔ تو اس صورت میں ثواب نہ ملنا اور زیادہ ظاہر ہے۔

اور ان لوگوں نے ایک غلطی یہ کی کہ یہ تو سمجھ لیا کہ ہم پر سے بلا ٹل گئی لیکن یہ نہ سمجھا کہ ہمارے دینے سے سائل یہ سمجھے گا کہ لپٹنے سے اور سر ہوتے ہی سے ملا کرتا ہے۔ تو یہ سمجھ کر اور بھائی

مسلمانوں کو پریشان کرے گا۔ تو اپنی بلا تو ٹالی مگر وہ بلا اوروں کے سر ڈالی۔ البتہ اگر ایسے قوی مکتسب کو بلا سوال دیدے تو کچھ مضائقہ نہیں یا باوجود قوی مکتسب ہونے کے بعض صورتوں کا استثنا بھی آیا ہے۔ ان مواقع استثنا میں سوال پر دیدے بھی تو جائز ہے۔ کیونکہ ان مواقع میں سوال بھی جائز ہے۔ اور وہ مواقع یہ ہیں۔

لا تحل الصدقة لغنی ولا لذی مرة سوی الا لذی فقر مدقع او غرم مفظع او لذی دم موجع الحدیث .... صدقہ نہ غنی کے لیئے حلال ہے اور نہ قوی و تندرست کے لیئے مگر (تین شخصوں کے لیئے) ایسے[۱] فقیر کے لیئے جس کو فقر نے مٹی کے ساتھ ملا دیا ہو یا[۲] بھاری قرض دار کے لیئے یا[۳] ایسے شخص کے لیئے جس پر دیت واجب ہو اور اس کو ادا کرنے کی طاقت نہ ہو۔

حاصل ان مواقع کا یہ ہے کہ اس شخص پر بوجہ قرض کے یا کسی مقدمے کے یا ایسے ہی کسی سبب کے مالی بار اتنا پڑا کہ اگر یہ کمانا شروع کرے تب بھی اتنا ذخیرہ جمع نہ ہو سکے کہ روز مرہ کے حوائج پورے ہو کر اس بار سے سبکدوشی حاصل کر سکے تو ایسا شخص اگر سوال نہ کرے تو پھر کیا تدبیر کرے اس لئے ایسے شخص کو سوال کی اجازت ہے جب سوال جائز ہے تو پھر کیا تدبیر کرے اس لیئے ایسے شخص کو سوال کی اجازت ہے جب سوال جائز ہے تو اس کے سوال پر دینا بھی جائز ہے اور اسی حکم میں ہے۔ وہ مسافر جس کو سفر میں کوئی خسارہ یا حاجت ایسی پیش آگئی کہ اگر کمانا شروع کرے تو بس سفر ہی میں رہا کرے۔ گھر نہ پہنچ سکے اور گھر سے بھی خرچ منگانا یا تو ممکن نہ ہو، یا اتنی مہلت نہ ہو اور اسی حکم میں وہ شخص بھی ہے جو قوی تو ہے مگر بوجہ خوگر نہ ہونے کے متحمل تعب کا نہیں اس لیئے مکتسب نہیں ہو سکتا۔ پس ان سب لوگوں کو سوال پر بھی دینا جائز ہے۔

اور اگر سبب اس افراط کا تفاخر و شہرت یا طمع و خوف دنیوی ہے تو اس دینے کا بیکار ہونا بلکہ موجب گناہ ہونا بہت ہی ظاہر ہے اور بالخصوص اگر یہ طمع و خوف بے شرعی فقیروں سے ہے جیسا اس زمانہ میں اکثر دنیا پرست لوگ ایسے بھنگڑوں کو غوث و قطب سمجھ کر اپنا مال اور دین دونوں خراب کرتے ہیں تو اس کو تو مصداق ظلمٰت بعضها فوق بعض کا کہیں گے۔

یہ ذکر تھا سائل کے دینے نہ دینے کے متعلق کوتاہیوں کا۔ اور ایک ان اعمال مالیہ مقصودہ بالذکر میں سے قرض مانگنے والے کو قرض دینا ہے۔ اس میں بھی چند کوتاہیاں ہوتی ہیں۔

اگر گنجائش ہو تو قرض مانگنے والے کو قرض دینا چاہیئے

ایک یہ کہ بعضے لوگ باوجود اس کے کہ اپنے پاس حاجت سے زائد رقم رکھی ہے یا بآسانی انتظام کر سکتے ہیں اور مانگنے والا سخت حاجت مند ہے اور بے اعتبار بھی نہیں مگر پھر بھی غایت بے رحمی سے قرض دینے سے انکار کر دیتے ہیں۔ بعض اوقات جھوٹ بولتے ہیں کہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ وجہ اس کی یا بخل ہے یا بے رحمی ہے یا جہل، کہ یہ سمجھتا ہے کہ قرض دینے سے فائدہ کیا ہوگا اس لئے نہ دینا تجویز کرتا ہے اگر بخل یا بے رحمی ہے تو اس کا مذموم ہونا ظاہر اور مسلم ہی ہے۔ محتاج بیان نہیں اور اگر جہل ہے تو اس کا فائدہ سمجھانا ضرور ہے۔ تاکہ اس علم سے وہ جہل مرتفع ہو جاوے سو اول تو جس قلب میں ترحم کا جوش ہوتا ہے وہ اسوقت فائدہ کو بھی نہیں سوچتا خود ترحم حامل علی الاعانۃ ہوتا ہے۔ کیا جو شخص اپنی اولاد کی پرورش کرتا ہے گو اسمیں فائدہ بھی ہے دنیا کا بھی آخرت کا بھی۔ مگر کیا پرورش کے وقت اس فائدہ کو سوچتا ہے کیا اگر فائدہ نہ سوچے تو پرورش نہ کرے گا۔ پس مسلمانوں میں باہم وہی تراحم و توادد ہونا چاہیئے جو اقارب میں ہوتا ہے۔

اگر بدون فائدہ سمجھے ہوئے قرض دینے کی ہمت نہ ہو تو فائدہ بھی سمجھ لینا چاہیئے اور گو فائدہ دنیوی بھی ہے مثلاً ممنون کے قلب میں محسن کی محبت پیدا ہونا باہم الفت و ہمدردی بڑھنا۔ لیکن مسلمانوں کو مسلمان ہونے کی حیثیت سے فائدہ دنیویہ کو مطمح نظر نہ بنانا چاہیئے اس لئے اس سے قطع نظر کر کے فائدہ اخرویہ سمجھنا چاہیئے اور وہ ثواب ہے جو کہ حدیث میں آیا ہے کہ حضور اقدس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں نے جنت کے دروازہ پر لکھا دیکھا کہ صدقہ دینے سے دس گنا ثواب ملتا ہے اور قرض دینے سے اٹھارہ گنا اور حدیث میں اس کی وجہ بھی آئی ہے کہ صدقہ تو وہ شخص بھی مانگ لیتا ہے جس کو حاجت نہ ہو۔ مگر قرض بدون حاجت کے (اور حاجت بھی اکثر اضطراری) کوئی نہیں مانگتا کیوں کہ اپنی گردن کو کون بندھائے) یعنی غالب عادت یہی ہے۔ پس صدقہ دینے میں ضروری نہیں کہ رفع اضطرار ہوا ہو اور قرض دینے میں رفع اضطرار ہوتا ہے اور اضطرار اور پریشانی کا رفع کرنا ظاہر ہے کہ کس قدر عظیم راحت پہنچاتا ہے اس

لئے اس کا ثواب زیادہ ہوا۔

رہ گئی تخصیص اٹھارہ عدد کی۔ گو اس کا نکتہ نہ سمجھنا ہم کو ضروری ہے اور نہ سمجھانا۔ کیونکہ طبیب کے نسخہ میں مریض کو منصب نہیں اوزان ادویہ کی لم دریافت کرنے کا بلکہ استعمال اور اعتقاد ضروری ہے۔ اسی طرح ہمارا مذہب بندہ ہونے کی حیثیت سے یہ ہونا چاہیئے۔

زبان تازہ کردن باقرار تو
نینگیختن علت از کار تو

حدیث میں اٹھارہ عدد کی تخصیص کیوں کی گئی۔

مگر تبرعاً و تفریحاً اگر کوئی تقریبی بات سمجھ میں آجاوے تو اس کے ذکر کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن چونکہ وہ تقریبی اور تخمینی مضمون ہوگا اس لئے اگر اس میں کوئی خدشہ نکل آوے تو مضر بھی نہیں کیونکہ اصل ایمان نص پر ہے نہ کہ اپنے نکات و لطائف پر غرض وہ نکتہ جو خاطر فاتر میں اس کے متعلق آیا ہے یہ ہے کہ اصل میں ثواب قرض کا صدقہ سے بحیثیت مذکورہ دونا ہے۔ پس صدقہ اگر دس تک مضاعف ہوتا ہے تو قرض بیس تک ہونا چاہیئے۔ تو قرض کا ایک درہم صدقہ کے دو درہم کے برابر ہوا لیکن چونکہ وہ درہم واپس آجاوے گا۔ اس لئے بیس کے عدد میں سے دو عدد کم ہوگئے اس لئے اٹھارہ رہ گئے۔ واللہ اعلم

اور جب قرض کا ثواب صدقہ سے مضاعف ہونا معلوم ہوگیا۔ تو اسی سے یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ نصوص سے ثابت ہے کہ دس حصہ تک ثواب کا بڑھنا یہ ادنیٰ درجہ ہے۔ ورنہ تفاوت خلوص سے اس سے بڑھ کر سیکڑوں ہزاروں تک پہنچتا ہے۔ پس صدقہ کا ثواب دس سے زائد بھی ہوتا ہے او قرض کا ثواب اس سے مضاعف بھی ہے اور اخیر میں ایک عشر منہا ہو جاتا ہے پس قرض کا ثواب بھی اٹھارہ تک محدود نہیں بلکہ کبھی چھتیس حصہ ہوگا۔ یعنی چالیس حصہ ہو کر چار گھٹ جاوے گا اور کبھی اسی ہو کر اس میں سے آٹھ گھٹ کر بہتر رہ جاوے گا۔ حتیٰ کہ اگر صدقہ کا ثواب سات سو تک ہو تو قرض کا ثواب چودہ سو تک ہوگا جو اخیر میں بارہ سو ساٹھ رہ جاویں گے تو کیا یہ فائدہ نہیں ہے کہ ایک روپیہ قرض دیا اور آخرت میں مثلاً بارہ سو ساٹھ روپے کا ثواب ملا ؎

خود کہ یابد ایں چنیں بازار را
کہ بہ یک گل میخری گلزار را

نیم جاں بستاند و صد جاں دہد
آنچہ در وہمت نیاید آں دہد

اور یہ عدد تو بطور مثال کے فرض کیا گیا ورنہ جب صدقہ میں سات سو کی حد نہیں لقولہ تعالیٰ بعد قولہ ۔ انبتت سبع سنابل فی کل سنبلۃ مائۃ حبۃ واللہ یضاعف لمن یشاء واللہ واسع علیم ط

اگیں سات بالیں ہر بال میں سو سو دانے، اور اللہ بڑھاتا ہے جس کے واسطے چاہے، اور اللہ نہایت بخشش کرنے والا ہے، سب کچھ جانتا ہے۔

تو قرض میں بھی بارہ سو ساٹھ کی حد نہ ہوگی۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ توقع ہے۔ کیا اس کو بھی فائدہ نہ کہے گا۔

اور تضاعف ثواب القرض علی ثواب الصدقۃ کی تقریر کی تفصیل میں جہاں خاطر فاترہ کا حوالہ ہے بحیثیت مذکورہ کی قید اس لئے لگائی گئی کہ اس سے کوئی نہ سمجھ جاوے کہ قرض کا ثواب علی الاطلاق صدقہ سے مضاعف ہوتا ہے۔ اور یہ سمجھ کر یا تو صدقہ کی جگہ بھی قرض ہی دینے لگے۔ اور یا کہ صدقہ میں بے رغبت ہوجاوے۔ اور اس میں خسارہ سمجھے۔ سو یہ بات ہے کہ مختلف احکام مختلف حیثیات سے ہوتے ہیں۔ سو ایک حیثیت سے تو جس کا کہ ذکر ہوا قرض کا ثواب زیادہ ہے مگر دوسری حیثیات سے صدقہ کا ثواب قرض سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ مثلاً قرض میں واپسی ہوتی ہے۔ صدقہ میں واپسی نہیں ہوتی۔ اور اس وجہ سے صدقہ لینے والے کے قلب پر کوئی بار نہیں رہتا۔ اور قرض لینے والے کے قلب پر بار رہتا ہے۔

ایک خدشہ کا ازالہ

اور ہم نے قرض دینے میں فائدہ دنیویہ بیان کیا ہے کہ باہم الفت و محبت و ہمدردی بڑھتی ہے گو یہ فائدہ مقصود نہیں۔ مگر چونکہ واقعی ہے اس لئے اس پر کوئی خدشہ واقع ہو۔

تو اس کا دفع کرنا ضروری ہے۔ تو اس میں ظاہراً ایک خدشہ ہے وہ یہ کہ ہم تو اکثر اس کے خلاف یہ دیکھتے ہیں کہ قرض دینے سے پہلی الفت بھی قطع ہو جاتی ہے اور ہمیشہ کے لئے باہم رنج و کدورت پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ایک تجربہ کار بزرگ کا ارشاد ہے۔

مدہ شان قرض و ستان نیم حبہ
فان القرض مقراض المحبہ

تو آلہ فصل کو آلہ وصل کہنا کیسے صحیح ہوگا۔ دفع اس خدشہ کا یہ ہے کہ یہ قطع محبت اثر قرض کا نہیں ہے اس کا اثر تو وہی ہے جو اوپر مذکور ہوا یعنی ازدیاد محبت والفت، بلکہ یہ اثر متقرضین، یعنی لینے والوں کی بد تدبیری کا ہے۔ وہ یہ کہ اکثر لوگوں کی حالت دیکھی جاتی ہے۔ کہ قرض لے کر بے فکر ہو جاتے ہیں۔ باوجود گنجائش کے اور تمام فضول کارروائیوں کے قرض کے ادا کا اہتمام نہیں کرتے۔ بعضے تو بہت ہی ٹال کر دیتے ہیں اور بعضے دیتے ہی نہیں۔ اگر تقاضا کیجئے برا مانتے ہیں۔ اور ان کی اس حرکت سے مقرض (یعنی قرض دینے والے کو) کلفت ہوتی ہے۔ اور جب یہی کلفت روز مرہ مدتوں تک پہنچے تو ضرور اس کا اثر یہ ہوگا کہ محبت قلب سے نکل جاوے گی اور رنج وشکایت پیدا ہو جاوے گی۔ تو اپنی بے عنوانی کے اثر کو قرض کی طرف منسوب کرنا بڑی غلطی ہے۔ پس خدشہ رأساً واساساً منقلع و منقطع ہو گیا۔

لیکن معمولی کلفت سے تنگ دل ہو کر قرض دینے کا سلسلہ بند نہ کرنا چاہیئے کیونکہ یہ بھی اجر سے خالی نہیں۔ احادیث میں اس سے کم تنگ دلی پر وعدۂ ثواب آیا ہے کہ اگر کوئی چیز کہیں رکھ کر بھول جاؤ اور اس کی تلاش میں قدرے پریشانی ہو۔ پھر وہ مل جاوے تو اس میں بھی ثواب ہے۔ تو قرض وصول نہ ہونے پر یا وقت پر وصول نہ ہونے پر تو اس سے بہت پریشانی ہوتی ہے۔ تو اس میں اس سے زیادہ اجر کیوں نہ ملے گا۔ اس لئے بقدر تحمل اتلاف کو بھی برداشت کر لینا چاہیئے لیکن اس کے ساتھ قرض لینے والے کو بھی وصیت کرتا ہوں کہ اس کو بھی چاہیئے کہ قرض دینے والے کا احسان مانے۔ اور اس کو تکلیف نہ دے۔ اور وقت پر اس کی امانت پہنچا دے تاکہ پھر بھی قرض لینے کا منہ رہے۔

اور اس نادہندی کی بدولت آپس میں قرض نہیں ملتا۔ پھر کافروں سے سودی لیتے ہیں۔

اور تباہ ہوتے ہیں۔ ورنہ اگر وقت پر دوسرے کا حق پہنچ جایا کرے۔ تو بہت مسلمان ایسے ہیں کہ وہ خود اپنی مصلحت سے اپنے روپیہ کا قرض پر چلتا رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں کہ حفاظت سے بچتے ہیں۔ اور تجارت کو یہ لوگ پسند نہیں کرتے۔ یا تو بوجہ احتمال خسارہ کے اور یا بوجہ توحش تعلقات کے۔ یا بوجہ عدم مناسبت کے تو ایسے لوگوں کا روپیہ قرض میں باآسانی مل سکتا ہے اور غیر قوموں کو سود دے کر اپنا گھر تباہ ہونے سے بچا سکتے ہیں۔ لیکن معاملات خراب ہیں کہ لے کر دینا نہیں چاہتے۔ دو چار جگہ ٹھوکر کھا کر سب سے متوحش ہو جاتا ہے اور بقول شخصے دودھ کا منہ جلا چھاچھ کو پھونک کر پیتا ہے۔ وہ کسی کو بھی قرض نہیں دیتا۔ اور ایک باب عظیم خیر کا بند ہو جاتا ہے جس کا وبال ان نادہندوں کی گردن پر ہوگا۔ اس کوتاہی مذکور کا حاصل تو قرض نہ دینا ہے۔ جس کا مفصل بیان ہو چکا۔

نادار کو مہلت دینا قرآن کی رو سے واجب ہے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ قرض تو دیدیتے ہیں لیکن تقاضا بیڈ حسب کرتے ہیں وقت آنے پر مہلت دینا جانتے ہی نہیں۔ حالانکہ نبص قرآنی "وان کان ذو عسرۃ فنظرۃ الی میسرۃ " اور اگر وہ تنگ دست ہے تو (اس کو) کشادہ حالی تک مہلت دینی چاہیئے "

تنگ دست نادار کو مہلت دینا واجب ہے اور اس کی بھی فضیلت احادیث میں آئی ہے۔

رہن کی چیز سے نفع حاصل کرنا سود میں داخل ہے۔

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے بدون سود کے قرض نہیں دیتے۔ پھر سود کے طریقے مختلف ہیں۔ بعضی صورتیں تو وہ ہیں جن کو یہ لوگ بھی سود سمجھتے اور کہتے ہیں یعنی آدہ آنہ روپیہ پر لینا یا آنہ روپیہ پر لینا۔ اور بعضی وہ صورتیں ہیں جن کو سود نہیں سمجھتے۔ مگر واقع میں وہ سود ہیں۔ جیسے رہن رکھکر اس سے نفع حاصل کرنا۔ اس کا سود ہونا مع جواب شبہات عوام وخواص کے رسالہ صفائی معاملا میں احقر نے ثابت کر دیا ہے۔ اور بھی تاجروں میں بہت صورتیں متعارف ہیں پھر ان دونوں قسم کے سود لینے والوں میں بعضے ایسے جری ہیں کہ اس کو حلال سمجھتے ہیں۔ کوئی بعض عبارات فقہیہ سے

بزعم خود تمسک کرتا ہے۔ کوئی تمدنی و قومی مصلحتوں کو شریعت پر مقدم ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کوئی حربی کی روایت کو پیش کرتا ہے۔ علماء شکر اللہ تعالیٰ سعیھم (اللہ تعالیٰ ان کی کوشش کا بدلہ دے) نے ان سب کی اچھی طرح اپنی تحقیقات لسانیہ و کتابیہ میں خدمت کردی ہے۔ بندہ نے بھی بقدر ضرورت رسالہ صفائی معاملات میں جس کا اوپر حوالہ ہے اور رسالہ تحذیر الاخوان میں اور اپنی تفسیر بیان القرآن تحت آیۃ یاایھا الذین اٰمنوا اتقوا اللہ وذروا ما بقی من الربوا الخ اے ایمان والو ڈرو اللہ سے اور چھوڑدو بقایا سود کو، میں اس کی کافی بحث لکھدی ہے۔ اور اس کا مطالعہ منصف کے لیئے انشاء اللہ کافی ہے۔

اور سود کی ان صورتوں میں سے کوئی صورت ظاہر میں بھی تو کسی ضابطہ فقیہہ پر منطبق نہیں۔ بجز ایک صورت بیع بالوفار کے اور ایک صورت اس کی بھی خارج از ضابطہ ہے۔

بیع بالوفار کی تحقیق

تفصیل یہ ہے کہ اس وقت کے عرف میں دو معنے بیع بالوفار کے مشہور ہیں۔ ایک تو یہ کہ زید نے عمرو سے کہا کہ ہم کو ایک ہزار روپے قرض دے کر ہمارا باغ رہن رکھ لو اس شرط پر کہ اگر ہم دس سال کے اندر ہزار روپیہ ادا کردیں تو اپنا باغ چھڑالیں اور اگر نہ ادا کریں تو وہ باغ اسی ہزار روپے میں تمہارے ہاتھ بیع ہے اور دوسرے یہ کہ زید نے عمرو سے کہا کہ تم ہمارا باغ ہزار روپے میں خریدلو اور زرثمن ہمیں دیدو۔ اور یہ وعدہ ہے کہ اگر ہم دس سال میں تمہارا زرثمن واپس کردیں تو تم ہمارا باغ واپس کردو۔ اور بیع کا اقالہ یعنی فسخ کردو۔

سو اول معنی کے اعتبار سے تو بالاجماع حرام اور سود ہے اور دوسری صورت کو بھی فقہار متقدمین نے منع کیا ہے لیکن بعض متاخرین نے لوگوں کو مبتلا سود دیکھ کر اجازت دیدی ہے۔ اگر کسی شخص کا دل بوجہ غایت بے مروتی کے ویسے قرض دینے کو گوارا نہ کرے اور بوجہ ضعف قوت تقویٰ کے وہ متقدمین کے قول کو بھی نہ لے۔ تو خیر سود کی اور صورتوں سے بیع بالوفار (یعنی بالمعنی الثانی) پھر غنیمت ہے کہ حرمت اس کی متفق علیہ تو نہیں لوگوں کی کم ہمتی پر نظر کرکے بادل ناخواستہ کہتا ہوں کہ خیر اسی کو کرلیا کریں اوروں سے تو بچیں۔ یہ بحث تھی قرض کے متعلق کوتاہیوں کی۔

کوئی چیز عاریت دینے میں بخل نہ کرنا چاہیئے

اور ایک ان اعمال مالیہ مقصودہ بالذکر میں سے کسی کو کوئی چیز عاریتاً دینا ہے۔ اس میں بھی بعض لوگ بہت بخل کرتے ہیں۔ حق تعالیٰ نے اس میں بخل کرنے کو ناپسند اور اعمال منافقین سے فرمایا ہے۔ حیث قال فویل للمصلین الذین هم عن صلوتهم ساهون الذین هم یراؤن ویمنعون الماعون (سو ایسے نمازیوں کے لیئے بڑی خرابی ہے جو اپنی نماز کو بھلا بیٹھتے ہیں جو ایسے ہیں کہ ریاکاری کرتے ہیں اور برتنے کی چیز تک نہیں دیتے۔

اور اسی حکم میں ہے وہ چیز جو بطور رعایت نہ مانگی جاوے بطور تملیک ہی مانگی جاوے۔ لیکن وہ بہت کم قیمت جیسے ایک تولہ نمک جیسے ایک لوٹا پانی جہاں پانی کی فراغت ہو۔ جیسے ایک مٹھی گھاس اور عاریت جیسے دیگچی، پتیلی، چمٹا، قلم بنانے کا چاقو، ایک خط لکھنے کے لیئے قلم دوات ومثل ذالک البتہ اگر کوئی عذر ہو۔ مثلاً ایک شخص کا تجربہ ہو گیا ہے کہ وہ چیز لے کر نہیں دیتا، یا خراب کر دیتا ہے۔ یا بے پروائی سے کہیں ڈال دیتا ہے اہتمام کر کے ادا نہیں کرتا تو ایسے شخص کو عاریت دینے سے انکار کر دینا جائز ہے لیکن کم قیمت چیز کے دینے سے بھی انکار نہ کرے۔

ان طاعات مذکورہ کے علاوہ اور بھی تطوعات مالیہ ہیں کہ وقتاً فوقتاً ان کو عمل میں لانا موجب نفع خلائق ہے۔ جیسے مہمانوں کی خدمت استادوں کی اور پیروں کی خدمت، دوستوں کو ہدیہ دینا، روزہ داروں کے لیئے افطاری لے آنا، اقارب کے ساتھ صلہ رحمی کرنا۔ اور بعض صورتوں میں اقارب کی خاص خدمات وانفاق واجبہ ہے۔ جس کی تفصیل کتب فقہیہ میں مذکور ہے بالخصوص جو صدقات جاریہ ہیں۔ جیسے مساجد کی اعانت تعمیر، یا لوٹا بوریہ وتیل سے مدارس اسلامیہ کی اعانت۔ کنواں بنا دینا پل بنا دینا، راہ پر درخت لگا دینا، قرآن مجید یا کتب دینیہ وقف کر دینا، ومثل ذالک کہ ان کا ثواب مرنے کے بعد بھی لکھا جاتا ہے۔

اب میں طاعات مالیہ کی فہرست میں ان مذکورات بعد الزکوٰۃ پر اکتفا کرتا ہوں۔ طالب دین صاحب فہم اور متروک صورتوں کو اس سے بخوبی سمجھ کر عمل کر سکتا ہے۔

میت کے معاملہ کے متعلق کوتاہیاں

(اصلاح معاملہ بموتیٰ)

یہ معاملے تین قسم کے ہیں۔ ایک قبل الموت (یعنی حالت مرض میں) دوسرے وقت الموت (یعنی موت کے بہت قریب) تیسرے بعد الموت (یعنی موت کے بعد جب تک اس کے متعلق کوئی تذکرہ یا کوئی کارروائی جاری رہے) اور ان تینوں قسموں میں مختلف کوتاہیاں واقع ہوتی ہیں۔ جو اختصار کے ساتھ ذکر کی جاتی ہے۔

"حالتِ مرض"

حالت مرض میں بھی حتی الامکان نماز کی پابندی ضروری ہے

اس میں ایک کوتاہی یہ ہوتی ہے کہ بوجہ غایت ترحم مریض کو نماز کے وقت کی اطلاع نہیں کرتے اور نماز پڑھنے کے لئے اس سے نہیں کہتے کہ اس کو تکلیف ہوگی۔ بعضے مریض تو خود بھی جاہل یا کاہل ہوتے ہیں گو پہلے سے نماز کے پابند ہوں مگر مرض میں (یا وسوسہ سے کہ کپڑے خراب ہیں، بدن ناپاک ہے یا صاف نہیں ہے۔ یا یہ کہ وضو وغسل نہیں کیا جاتا۔ اور تیمم کو دل نہیں گوارا کرتا۔ اور اس سے

طبیعت صاف نہیں ہوتی۔ وشل ذالک) نماز قضا کر دیتے ہیں۔ یہ تو جہل ہے۔ یا کم ہمتی سے کہ کون اہتمام کرے تیمم کا یا رخ سیدھا کرنے کا کہ اس میں تکلیف ہوتی ہے۔ اگر چہ وہ تحمل سے زائد نہیں۔ مگر کسی قدر آرام تو فوت ہوتا ہے۔ اور دل کو سمجھا لیتے ہیں کہ اچھے ہو کر سب پوری کر لیں گے۔ اس لئے نماز چھوڑ دیتے ہیں۔ اور یہ کاہلی ہے۔

اور علاج اس کا یہ ہے کہ اس کو سمجھایا جاوے کہ شریعت نے ہر حال میں آسانی کی رعایت کی ہے۔ بدن یا پارچہ کا صاف ہونا تو کچھ فرض نہیں اگر میلے ہیں ہونے دو۔ اسی طرح نماز پڑھو اور اگر ناپاک ہے تو ان کے پاک کرنے میں زیادہ تکلیف نہیں ہوتی۔ تو پاک کرنا کیا دشوار ہے۔ آخر تھوڑی بہت مشقت سے تو کوئی کام بھی خالی نہیں۔ چنانچہ مرض میں دوا پینا کیا مشقت نہیں؟ بعض اوقات کروٹ بدلنا مشقت ہے مگر مصلحت بدنی کے لئے اس کو گوارا کرتے ہیں۔ مگر نماز کے لئے بھی کہ مصلحت روحانی ہے۔ جس کی رعایت بدن سے بھی اہم اور اقدام ہے۔ کسی قدر مشقت گوارا کر لی جاوے۔ تو کیوں گرانی ہے۔ اور اگر پاک ہونے میں سخت تکلیف ہوتی ہے۔ تو بدون پاک کئے ہوئے نماز پڑھ لو۔ کہ شرع کی اجازت ہے۔ صرح الفقہاء بہ اور وضو اور غسل اگر نہیں ہو سکتا تو تیمم کی اجازت ہے اور اگر وضو ہو سکتا ہو اور غسل نہ ہو سکتا ہو تو وضو کر لو اور بجائے غسل کے تیمم کر لو اور طبیعت کا صاف ہونا نہ ہونا کوئی چیز نہیں اور اگر نماز نہ پڑھی تو اس سے طبیعت کون سی صاف ہو گئی اگر آدمی کو حس ہو تو معلوم ہو کہ اس سے اور بھی گندی اور میلی ہو جاتی ہے۔ یہ جہل کا علاج ہے۔

اور ناپاک کپڑے اور بدن کے پاک کرنے کے متعلق جو ابھی مضمون لکھا گیا ہے وہ علاج ہے کاہلی کا بھی کہ کم و بیش مشقت تو ہر کام میں ہوتی ہے مثلاً ناگوار دوا پیتے ہی ہیں بلکہ ترقی کر کے کہا جاتا ہے کہ بعض اوقات غذا کھانے میں بھی بعض مشقتیں لاحق ہو جاتی ہیں مثلاً مرچ لگ گئی منہ جل گیا۔ لقمہ گلے میں اٹک گیا یا شوربے وغیرہ کا بلکہ بعض اوقات پانی کا پھندا پڑ گیا۔ کیسی بری حالت ہو جاتی ہے بعض اوقات پان کھانے میں چونا زیادہ ہوا یا تیز ہوا، اور منہ اور زبان کے ٹکڑے اڑ گئے مگر ان عارضی مشقتوں کے سبب کوئی بھی کھانا پانی نہیں چھوڑتا اگر اسی مریض کو کہا جاوے کہ تم منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل کر اگر فلاں شخص سے جا کر ملو جو کہ یہاں سے ایک فرلانگ پر ہے تو تم کو دس روپیہ یا سو روپیہ یا ہزار روپیہ مل جاویں تو اس وقت بیماری

مشقتیں راحت معلوم ہونے لگیں۔ تو کیا خدا تعالیٰ کے یہاں کا اجر اتنی قدر بھی نہیں رکھتا۔ خصوصاً جبکہ دینوی کاموں سے بہت زیادہ ان دینی کاموں میں سہولت رکھی گئی ہے۔ چنانچہ جب کھڑے نہ ہو سکیں بیٹھ کر پڑھیں۔ اگر بیٹھ کر نہ پڑھ سکیں تو لیٹے لیٹے پڑھیں اور رکوع سجدہ سر کے اشارے سے کریں۔ اور ایسا شاذونادر ہے کہ اس قدر ضعف ہو جاوے کہ سر سے بھی اشارہ نہ کر سکیں لیکن اگر اتفاق سے ایسی نوبت آجاوے تو پھر شریعت کی سہولت دیکھئے کہ نماز کا مؤخر کر دینا اور بعد میں قضا کر لینا اس حالت میں جائز فرما دیا۔ پس ان سہولتوں کے بعد کسی کے پاس کیا عذر ہے اور یہ خیال کہ اچھے ہو کر قضا پڑھ لیں گے نہایت ہی جرارت کا خیال ہے۔ کیا ان کے پاس کوئی سند و پروانہ اس معاہدہ کا ہے کہ یہ اس مرض سے ضرور اچھے کر دیئے جاویں گے۔ ممکن ہے کہ یہ ان کا اخیر ہی مرض ہو۔ مرض میں بوجہ اس کے کہ ہر مرض پیام موت ہے۔ آدمی کو زیادہ تنبیہ اور تہیۂ آخرت کے طرف زیادہ توجہ چاہیئے۔

ع شاید ہمیں نفس نفس واپسیں بود

یہ تو ان مریضوں کا ذکر تھا جن کو خود بھی جہل یا کسل سے نمازوں کا اہتمام نہیں ہوتا بعض مریض ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو پورا اہتمام ہے لیکن مرض کے غلبہ سے ان کو پورے طور سے اوقات وغیرہ کی اطلاع نہیں ہوتی یا نماز کے وقت کچھ نیند کا غلبہ ہو جاتا ہے یا غایت ضعف سے آنکھیں بند ہو کر غفلت سی ہو جاتی ہے لیکن اگر ان کو نماز کے لئے آگاہ کیا جاوے تو ہرگز کوتاہی نہ کریں۔ مگر اوپر کے لوگ اس وجہ سے کہ ان کو اس مریض کی راحت جسمانیہ کے ساتھ تو اعتنا رہے لیکن دین کی کچھ مبالات نہیں۔ اس مریض کو اطلاع ہی نہیں کرتے۔ یا اگر اس کو کسی طرح اطلاع بھی ہو گئی تو اس کی امداد نہیں کرتے مثلاً اس کے لئے پانی یا تیمم کے لئے کلوخ نہیں لاتے اس کی چارپائی قبلہ کی طرف نہیں بدلتے۔ اس کو پاک کپڑے نہیں بدلوا دیتے۔ اس تساہل میں یا تو مریض پھر غافل ہو گیا۔ یا اس پر بھی کسل غالب آگیا اور ایسی اس کی نماز برباد ہوئی۔ ان لوگوں کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ اپنے جس عزیز کی تھوڑی سی معمولی تکلیف گوارا نہیں۔ اس کے دوزخ میں جلنے کی تکلیف کیسے گوارا کر لیتے ہیں۔ اور اگر غایت بے رحمی سے اس کی یہ تکلیف گوارا کر لیں تو اپنی کیسے گوارا کر لیں گے۔ اس لئے کہ یہ تعاون فی الدین واجب ہے۔ اور یہ امر بالمعروف بالید کی ایک فرد ہے جو کہ محل قدرت اور

توقع قبول میں فرض ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ

اور اگر یہ وسوسہ ہو کہ جب اس کو اوقات نماز کا ہوش نہیں ہے تو بے ہوشی میں نماز معاف ہوئی تو اس کا دفعیہ یہ ہے کہ اس بے ہوشی میں نماز معاف نہیں ہوتی وہ وہ بے ہوشی ہے کہ جس میں آگاہ کرنے سے بھی آگاہ نہ ہو پھر اس میں بھی مطلقاً معافی نہیں بلکہ یہ تفصیل ہے کہ اگر چھ نمازیں متصل بے ہوشی میں گذر جائے تب تو بالکل معاف ہے یعنی نہ ادا نہ قضا اور اگر اس سے کم بے ہوشی ہوئی ہے مثلاً چار نمازیں یا پانچ نمازیں اس حال میں گذر گئیں تو اس وقت تو ادا کا مکلف نہیں۔ مگر ہوش میں آنے کے بعد ان کی قضاء واجب ہوگی۔ اور اگر قضاء میں سستی کی تو فدیہ کی وصیت مرتے وقت واجب ہوگی۔ اور اگر وصیت میں بھی غفلت ہوئی تو وارث کو ثواب ہوگا۔ اگر فدیہ ادا کر دیا لیکن اس صورت میں اپنے حصے میں سے ادا کرے مشترکہ ترکہ سے ادا نہ کرے۔

وضو اور قیام کی قدرت ہوتے ہوئے تیمم سے اور بیٹھ کر نماز نہیں ہوتی

بعضے مریض یہ کوتاہی کرتے ہیں کہ باوجودیکہ وضو سے کوئی ضرر نہیں پھر تیمم کر لیتے ہیں۔ بعض دفعہ اوپر کے لوگ وضو سے روکتے ہیں کہ میاں تیمم کر لو شرع میں آسانی ہے۔ اسی طرح بعض دفعہ باوجود قدرت علی القیام بیٹھ کر نماز پڑھ لیتے ہیں۔ بعض دفعہ نماز ہی میں باوجود قدرت ضبط کے غایت کم ہمتی سے کراہتے ہیں۔ آہ آہ خوب صاف لفظوں سے کہتے ہیں اور اس کی پروا ہی نہیں کرتے کہ ہماری نماز رہیگی یا جائے گی۔ سو خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ مطلق مرض سے تیمم یا قعود کی اجازت نہیں اس میں ابواب فقہ کی تحقیق کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح قدرت ضبط ہوتے ہوئے آہ یا ہائی وغیرہ کرنے سے نماز جاتی رہتی ہے۔ نماز بڑی احتیاط کی چیز ہے اس کو بے کار نہ سمجھیئے۔

بعضے ان ظاہری بے احتیاطیوں کے مقابل ایک دقیق بے احتیاطی کرتے ہیں۔ جو ظاہراً ان کے زعم میں بڑا تقویٰ ہے وہ یہ کہ خواہ ان پر کچھ ہی مصیبت گذر جاوے۔ خواہ کیسا ہی مرض بڑھ جاوے اور خواہ مر ہی جاویں مگر تیمم جانتے ہی نہیں مریں گے۔ کہیں گے، مگر وضو ہی کرینگے

سو حقیقت میں اس غلو کے معنی یہ ہیں کہ حق تعالیٰ نے ایسا حکم دیا ہے جو واقع میں ناقص ہے اس لئے ہم اس کو قبول نہیں کرتے۔ اصل میں شیطان کی مطرودیتہ[۵] کا مبنیٰ اس کا یہی خیال ہے کہ یہ حکم حق تعالیٰ کا نامناسب ہونے کے سبب قابل عمل نہیں یہ معصیت تو اس کے عقیدے کے ہوئی۔ اور اگر اس کو کوئی ضرر شدید پہنچا... تو اہلاک نفس سے معصیت عملی ہوگی خوب فرمایا ہے ؎

بزھد وورع کوش وصدق وصفا
ولیکن میفزائے بر مصطفیٰ

ولیس من البر الصیام فی السفر...

اور دوسری حدیثیں بھی اس کی صاف ادلہ ہیں۔ یہ کوتاہیاں تو نماز کے متعلق تھیں۔

حالت مرض میں بھی مریض کا ستر بغیر ضرورت کے دیکھنا جائز نہیں

ایک کوتاہی یہ ہوتی ہے کہ مریض کا ستر چھپانے کا اہتمام نہیں کیا جاتا۔ اگر زانو کھل گیا تو کوئی پرواہ نہیں کی جاتی۔ اگر ران کھل گئی تو کچھ خیال نہیں کیا جاتا۔ اگر بضرورت تداوی کسی موقع کے کھولنے اور دیکھنے کی حاجت ہوئی تو اس کی احتیاط نہیں کہ بقاعدہ الضروری یتقدر بقدر الضرورۃ اتنا ہی بدن کھلے جس کے کھلنے کی ضرورت ہے۔ یا صرف انہیں لوگوں کے سامنے کھلے جن کا تعلق اس تداوی سے ہے۔ وہ بھی دیکھتے ہیں اور دوسرے حاضرین اور عیادت کرنے والے بھی بے تکلف دیکھیں گے۔ بلکہ اس کو ہمدردی سمجھیں گے۔

غرض نہ دوسروں کو دیکھنا جائز اور نہ مقدار ضرورت سے زیادہ دیکھنا جائز یہاں تک کہ اگر عورت کے جننے کے وقت کافر دائی جاوے تو موقع تولد کا دیکھنا تو اس کو اگر حاجت ہو درست ہے لیکن بوجہ اس کے کہ کافر عورت نامحرم مرد کے حکم میں ہے۔ اس کے روبرو عورت کو سر کھولنا حرام ہوگا۔ کیونکہ اس کا کھولنا بلا ضرورت ہے۔

اسی طرح اگر عورت کے ہاتھ میں فصد لی جاوے تو فصّاد کو تو موقع فصد کا دیکھنا جائز ہے مگر دوسرے حاضرین کو وہاں سے ٹل جانا یا آنکھ بند کر لینا یا منہ پھیر لینا واجب ہے۔ اوروں کو اجازت

---

[۵] اللہ کے دربار سے دور کیا جانا ۱۲

نہیں کہ اس کے ہاتھ کا وہ حصہ کھلا ہوا دیکھیں۔ اسی طرح ختنہ میں اگر بچہ سیانا ہو جس کا کھلا ہوا بدن دیکھنا جائز نہیں تو ختان کو تو بقدر ضرورت دیکھنا درست ہے۔ دوسروں کو درست نہیں۔ اسی طرح اگر کسی عضو مستور میں دنبل وغیرہ میں شگاف دیا جائے تو جراح یا ڈاکٹر کے سوا یا ایسے شخص کے سوا جس کے دیکھنے میں کوئی مصلحت معالجہ کی ہو دوسروں کو اس موقع کے دیکھنے کی اجازت نہیں۔ یہ جزئیات استطراداً ذکر کر دیئے گئے اصل مقصود بیان کرنا مریض کے ستر کا ہے کہ اس میں بے پروائی برتی جاتی ہے۔

ناپاک اور حرام دوا سے پرہیز کرنا چاہیئے

ایک کوتاہی دوا کے متعلق یہ کی جاتی ہے کہ دوا کے حلال و حرام طاہر و نجس ہونے کی کچھ پروا نہیں کی جاتی خصوص امراء کے یہاں کہ برانڈی تک سے پرہیز نہیں خواہ تناول یا استعمال کے ساتھ ہی دم نکل جاوے مگر کچھ انقباض ہی نہیں ہوتا۔ مسلمانوں کے حال پر تعجب ہے کہ جس چیز کو طبیعت قابل نفرت بتلاوے مثلاً پیشاب پینا اس سے تو نفرت ہو اور جس چیز کو شریعت قابل نفرت بتلاوے۔ مثلاً شراب پینا اس سے نفرت نہ ہو تو گویا اس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہیں کہ یہ شخص اپنے کو نفس کا بندہ سمجھتا ہے خدا کا بندہ نہیں سمجھتا۔ تو کیا مسلمان ہونے کے یہی معنی ہیں مصرع

ببیں کہ از کہ گسستی و باکہ پیوستی

ایک وسوسہ کا ازالہ

اور اگر یہ وسوسہ ہو کہ دوا کے لئے تو شرع میں بھی اجازت ہے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کا دعویٰ علی الاطلاق محض غلط ہے اصل مذہب میں تو کسی حالت میں بھی دوا کے لئے ایسی چیز کی اجازت نہیں ہاں مضطر بالمخمصہ یا مغصوص باللقمہ کے لئے ایسی چیز سے ابقاء حیوٰۃ مشروع ہے اور تداوی کا اس پر قیاس اس لئے صحیح نہیں کہ مقیس علیہ میں نفع عادۃً متیقن ہے اور مقیس میں غیر متیقن، چنانچہ اطباء خود فن ہی کو ظنی کہتے ہیں اس لئے نفس معالجہ ہی واجب نہیں بخلاف اساغہ مغصوص کے کہ واجب ہے اس دوا میں ایسی چیز کی اصلاً اجازت نہیں خواہ مرض کیسا ہی ہلاک ہو

اور نفع کیساں ہو مجرب سمجھا جاوے۔

البتہ بعض متاخرین نے ضرورت شدیدہ اور تجربۂ نفع کی قید کیساتھ اجازت دیدی ہے۔ مگر جو بے احتیاطی کرتے ہیں وہ ان قیدیوں کا کب لحاظ کرتے ہیں بلکہ وہ تو محض احتمال نفع ہی پر سرعت برار یعنی تعجیل صحت ہی کے لئے بلکہ بعض اوقات بدون مرض کے محض تقویت طبیعت ہی کے لئے یا مرض کے غیر خطرناک ہونے پر بھی بے تکلف ان چیزوں کا استعمال کرتے ہیں پس وہ اس فتویٰ سے کیسے تمسک کر سکتے ہیں۔ یہ تو جواز و عدم جواز میں گفتگو تھی باقی جو لوگ قلب سلیم طبع طاہر رکھتے ہیں وہ تو اختلافی اجازت سے بھی منتفع ہونا پسند نہیں کرتے۔ جس طرح بعض لطیف المزاج لوگ بعض اشیاء مکروہ طبعی کو حلق سے اتار نہیں سکتے اور اگر دھوکہ سے اتر جاوے تو معدہ اس کو قبول نہیں کرتا۔ اسی طرح جن کا مزاج لطافت دینی رکھتا ہے ان کی ان اشیاء مکروہ شرعی کے تناول یا امساک فی المعدہ کے ساتھ یہی کیفیت ہے اور ادویہ محرمہ کچھ برانڈی ہی وغیرہ کے ساتھ خاص نہیں۔ بہت سی ادویہ طب یونانی میں بھی ایسی ہی حرام و نجس ہیں جیسے جند، بیدستر، دما یہ شتر اعرابی اور لبوب کبیر میں قضیب گاؤ۔

میں نے اپنے ایک طبیب دوست سے استدعا کی ہے کہ ایسے ادویہ کی ایک فہرست شائع کردے۔ اور خاص کر ایسی چیزوں کا استعمال ایسی جگہ کرانا تو ظلم عظیم ہی ہے جہاں مریض خود محتاط اور ایسی اشیاء سے نفور ہو۔ مگر اس کی بے خبری میں یا اس کو دھوکہ دے کر کھلا پلا دیا جاوے۔ کبھی تو اس کو اگر خبر ہوگئی تو بے حد کلفت ہوتی ہے اور اس کلفت سے اس کا مرض بڑھتا جاتا ہے۔ اور اس طرح سے اس کو جسمانی ضرر بھی لاحق ہوتا ہے اور اگر خبر بھی نہ ہوئی تو اس خیر خواہ نے پرائی دنیا کی درستی کے لئے اپنا دین برباد کیا۔ جس کا برباد کرنا خود اپنی دنیا کی درستی کے لئے بھی مذموم و مبغوض عند اللہ ہے۔ اور یہ تو اس سے بھی بڑھ کر ہوا کہ حظ آخرت تو فوت ہوا ہی کوئی حظ دنیا بھی نصیب نہ ہوا۔ خسر الدنیا والاخرۃ کا مصداق بنا۔

دعا غلاموں کی طرح کرنی چاہیئے نہ کہ شکایت کرنے والوں کی طرح

ایک کوتاہی دوسرے قسم کے معالجہ یعنی دعا ختم یا صدقہ و نذر میں ہوتی ہے کہ ان میں حدود شرعیہ

کو ملحوظ و محفوظ رکھنے کی طرف توجہ نہیں ہوتی۔ مثلاً دعا بصیغہ شکایت ہوتی ہے۔ اللہ میاں سے کہا جاتا ہے۔ اے اللہ کیا ہوگا۔ بس میں تو بالکل ہی تباہ ہو جاؤں گا۔ یا تباہ ہو جاؤں گی۔ یہ بچے کس پر ڈالونگی بس جی میرا تو کہیں ٹھکانہ ہی نہ رہے گا۔ اے اللہ ایسا تو نہ کیجیو۔ گویا شکایت الگ کی جاتی ہے۔ اور رائے الگ دی جاتی ہے۔

استغفر اللہ، کیا حق تعالیٰ کا یہی ادب ہے۔ یہی عظمت ہے۔ دعا کرو غلاموں کی طرح اجازت ہے بلکہ محبوب ہے آگے رضا بالقضا واجب ہے۔ مصرع

ہر چہ آں خسرو کند شیریں بود

ختم پڑھا جاتا ہے بعض جگہ تو غیر مشروع الفاظ سے مثلاً یا شیخ عبدالقادرؒ شیئاً للہ اور بعض جگہ اس سے غامض خرابی مضمر ہوتی ہے کہ الفاظ تو مشروع مگر اس کا ثواب بزرگوں کو اس عقیدہ سے بخشا جاتا ہے کہ وہ خوش ہو کر کچھ سہارا لگا دیں گے۔ یا بجائے امداد کے دعا ہی کا اعتقاد ہوا مگر اس طرح سے کہ وہ دعا ان کی رد ہو ہی نہیں سکتی۔ جس کے متعلق احقر نے بقدر ضرورت القاسم کی جلد (۳) نمبر ایک[1] کے پرچہ میں صفحہ ۱۴ پر کچھ مفصل بھی لکھ دیا ہے۔

صدقہ کے متعلق کوتاہیاں

صدقہ میں چند کوتاہیاں ہوتی ہیں۔ بعض لوگ یہ کرتے ہیں کہ کسی بزرگ کے نام کا کھانا پکوا کر تقسیم کرتے ہیں کہ کسی بزرگ کے نام کا کھانا پکوا کر تقسیم کرتے ہیں۔ یا کھلاتے ہیں اور مثل ختم مذکور عنقریب کے اس میں بھی اعتقاد امداد روحانی ان بزرگ کے متعلق رکھتے ہیں جس کی نسبت ابھی لکھا گیا ہے بعض لوگ کچھ غلّہ یا بکرا وغیرہ شب بھر مریض کے پاس رکھ کر اور بعض لوگ اس کا ہاتھ لگوا کر خیرات کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس تلبس سے یا اس لمس سے مریض کی تمام بلائیں گویا اس صدقہ کی طرف منتقل ہو جاتی ہیں پھر اس کے دینے کے ساتھ وہ بھی چلی جاتی ہیں۔ سو یہ اعتقاد محض خلاف شرع ہے۔

صدقہ دینا جو ایک فعل ہے اس کا اثر حدیث میں آیا ہے کہ بلا دفع ہو جاتی ہے۔ اس فعل کے قبل خود جرم صدقہ میں لپٹ کر مریض سے دور ہو جانے کا اعتقاد یہ مزاحمت ہے منصوص کی

منصوص تو اس کا اندفاع ہے اس فعل سے اور معتقد عوام کا اس کا ایک گونہ اندفاع ہے۔ قبل اس فعل کے، اور مزاحمت نص کی دلیل ضعیف سے بھی جائز نہیں نہ کہ بلا دلیل۔ بعض لوگ مریض کی طرف سے بکرا ذبح کرتے ہیں اور خصوصیت ذبح کو دافع بلا میں موثر سمجھتے ہیں۔ جس کی حقیقت افتداء ہے جس کا ادراک مشاہدہ یا رائے سے تو نہیں ہو سکتا بلکہ ضرورت ہے نقل کی، اور نقل مفقود ہے۔ اس لئے یہ اعتقاد تقول علی اللہ ہونے کے سبب ناجائز ہے۔ اور اگر کوئی عقیقہ پر قیاس کرے۔ تو وہ خود غیر مدرک بالقیاس ہے۔ اور حکم غیر قیاسی مقتصر رہتا ہے مورد نص پر اس میں قیاس جائز نہیں۔ اور اگر کوئی کہے کہ میں صدقہ کو مقصود سمجھتا ہوں تو اس کی تکذیب کے لئے یہ امتحان کافی ہے کہ اگر اس سے کہا جاوے کہ تم اس بکرے کو خریدنے کے عوض اسی کی قیمت میں گوشت خرید کر کہ وہ یقیناً اس بکرے کے گوشت سے زیادہ آوے گا مساکین کو تصدق کر دو تو ہرگز اس عمل کا التزام کرنے والے اس پر راضی نہ ہوں گے اور یہ سمجھیں گے کہ اس میں وہ اثر نہ ہوگا۔ سو اگر محض تصدق ہی مقصود ہے تب تو بدیں وجہ کہ یہاں تصدق زیادہ گوشت کا ہوا۔ اس میں زیادہ اثر سمجھنا چاہیئے تھا۔ مگر جب اس پر بھی ایسا نہیں سمجھتا

تو پھر اس میں بجز فعل ذبح کے کیا چیز کم ہے۔ جس کی کمی سے اثر کم ہو گیا۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ عوام الناس اس طریق میں ذبح کو ہی مقصود سمجھتے ہیں۔ پس دعویٰ قصد تصدق کا غلط ٹھہرا۔ بعض لوگ ذبح کا اہتمام نہیں کرتے بلکہ گوشت خریدتے ہیں۔ لیکن بجائے آدمیوں کے چیلوں کو کھلاتے ہیں سو اس میں دو بدعت ہیں۔ گوشت کے خصوص کا موثر سمجھنا پھر چیلوں کے کھانے کی خصوصیت میں اثر جاننا ایسی تخصیصات پر ابھی گفتگو آتی ہے۔ بعض لوگوں نے صدقہ کے لئے خاص خاص چیزیں تجویز کر رکھی ہیں جیسے ماش اور تیل اور پیسے جن میں امر مشترک سیاہ رنگ کی چیز معلوم ہوتی ہے جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہیں کہ بلا کو ایک کالی چیز سمجھ کر اس کے جلب للسلب کے لئے بھی کالی چیزوں کو تجویز کیا۔ سو اوّل تو بلا کوئی جسم نہیں جو سواد کے ساتھ موصوف ہو اور اگر کوئی توجیہ اس کی صورت مثالیہ کے اعتبار سے اس کی کر بھی لی جاوے تب بھی خود یہ ایک خلاف شرع دعویٰ ہے کہ اس کا دافع بھی تصدّق بالاسود ہی ہوگا۔ نص میں مطلق تصدق کو دافع بتلایا ہے۔ خواہ

بالا سود ہو یا بالا بیض ہو۔ پھر تصدق کا محل سب سے اچھا مسلمان مساکین ہے۔ بعضے بھنگیوں کو اور بعضے چیلوں کو اس کا مصرف متعین قرار دیتے ہیں۔ خود اس مصرف کے مساوی ہونے یا راجح ہونے کا دعویٰ مزاحمت ہے نص کی نہ کہ متعین ہونا۔ اس میں تو نص کا بالکل ابطال ہی ہے۔

وصیت کے متعلق کوتاہی

ایک کوتاہی وصیت کے متعلق ہے وہ یہ کہ بعض اوقات مریض اپنے بعد کے لئے خلاف شرع وصیت کرتا ہے اور کوئی اس کو تنبیہ بھی نہیں کرتا تاکہ اس کی اصلاح دیجاوے اور بعض اوقات دوسرے لوگ مریض کو ایسی وصیتوں کی رائے اور ترغیب دیتے ہیں مثلاً ثلث سے زیادہ کی وصیت یا کسی وارث کیلئے وصیت یا کسی وارث جائز کے محروم کرنے کی وصیت یا کسی معصیت کی وصیت کہ میرے مرنے کے متعلق فلاں کام بدعت کا ایفا خر کا کیجیو۔ مثلاً تیجہ، دسواں وغیرہ کیجیو یا قبر میں عہد نامہ وغیرہ رکھیو یا ایسا ایسا کھانا کیجیو یا میرا عرس کیا کیجیو و مثل ذالک اسی طرح ان کاموں کیلئے کچھ وقف کر جانا اس کا بھی یہی حکم ہے۔ اگر مریض اسمیں غلطی کرے تو دوسروں کو اصلاح کر دینا چاہیئے اور اگر وہ اصلاح قبول نہ کرے تو وہ وصیت لازم نہیں ہوتی بلکہ بعض پر تو عمل جائز نہیں ہوتا جیسے وصیت بالمعاصی۔ ان احکام میں فقہاء و علماء سے وقت پر تحقیق کرکے عمل کرنا چاہیئے یہ چند کوتاہیاں ہیں حالت مرض میں جو اس وقت خیال میں آئیں۔ تتبع یا تامل سے اور بھی کوتاہیاں نکلیں گی جن کے لئے مذکورہ کوتاہیوں کے ضمن میں جو اصول شرعیہ بیان کئے گئے ہیں یا تو وہی یا بعض کوتاہیوں کے لئے علماء سے رجوع کرنا کافی ہوگا۔ اب دوسری حالت کے متعلق کچھ ضروری امور عرض کرتا ہوں۔

"حالت وقت الموت"

حالت نزع میں رونے پیٹنے کی بجائے اس کو کلمہ کی تلقین اور اس کے خاتمہ بالخیر کی دعا کرنی چاہیئے۔

اس وقت کی کوتاہیوں میں عورتیں زیادہ مبتلا ہیں۔ مثلاً اس وقت بجائے اس کے کہ کچھ کلمہ پڑھیں حق تعالیٰ سے میت کی سہولت نزع و ختم بالخیر کی دعا کریں رونا پیٹنا پھیلاتی ہیں۔ کلمات جزع و فزع کے کہتی ہیں کہ اگر مریض کو کچھ ہوش ہوا تو وہ پریشان ہوتا ہے اور اس پریشانی سے دو

خرابیاں ہیں ۔ کبھی تو ناامیدی و ہراس سے دل شکستہ ہوتا ہے اگر اس وقت تک ناامیدی نہ ہوئی ہو اور مریض کے دل شکنی اور اتنا طاخود مذموم ہے حدیث میں نص ہے کہ مریض کو امید دلایا کرو ۔ اس سے وقت تو نہیں ملتا ۔ لیکن اس کا دل خوش ہو جاتا ہے تو یہ حرکت اس حکم کے کس قدر خلاف ہے اور کبھی اس سے وہ خلق کی طرف مشغول ہوتا ہے حالانکہ وہ وقت خالص توجہ الی اللہ کا ہے ۔ چاہئے تو یہ تھا کہ اگر وہ خود بھی اس عالم کی طرف بلا ضرورت شرعیہ (مثل وصیت وغیرہ) متوجہ ہوتا تو اس کی توجہ کو حق تعالیٰ کی طرف منعطف و منصرف کیا جاتا ۔ نہ کہ خود ہی اس ظلمت کدہ کی طرف اس کو متوجہ کرنے کا سبب بن جاویں ۔ اور اگر ان کلمات میں کچھ الفاظ اس میت کے غلو فی المدح کی ہوئی کہ تو ایسا تھا اور ایسا تھا تو ایک ضرر میت کا (جیسا کہ حدیث میں ہے) یہ ہے کہ فرشتہ اس کو ڈھکیلتے ہیں ۔ اور یہ کہتے ہیں کہ کیا ایسا ہی تھا ۔

غرض اس نامعقول حرکت سے پریشانی در پریشانی ہوتی ہے ۔ اور مثلاً بعضی عورتیں اس وقت اس کی بی بی کو سامنے لاکر کھڑا کرتی ہیں ۔ یا کبھی بی بی صاحبہ خود ہی تشریف لاکر کھڑی ہوتی ہیں ۔ اور پوچھا جاتا ہے کہ اس کو یا مجھ کو کس پر چھوڑے جاتے ہیں اور اس غریب کو جواب پر مجبور کرتے ہیں اسی طرح بعض اوقات اس کے بچوں کو سامنے لاتی ہیں کہ ان کا کون ہوگا ، یا یہ کہ ان کو پیار تو کرلو ، ان کے سر پر ہاتھ تو رکھدے ۔ جس سے وہ غریب تو پریشان ہوتا ہی ہے اور توجہ علی المخلوق کا ضرر الگ پہنچتا ہے لیکن بچے کس قدر دل شکستہ اور ناامید ہو جاتے ہیں یہ حماقت شعار اتنا نہیں سمجھتیں کہ اس وقت کا تو مقتضا یہ تھا کہ اگر خود بھی بچوں کو یاد کرتا تو اس کو کہا جاتا کہ تم حق تعالیٰ کی طرف خیال رکھو البتہ اگر بہت ہی یاد کرے تو سرسری طور پر سامنے کردیں تاکہ اس کا دل ان میں اٹکا نہ رہے لیکن اگر خود یاد نہ کرے تو ہرگز اس کو یاد نہ دلاوے اور یہ بھی مقتضا تھا کہ بچوں کو وہاں سے ہٹا دیا جاتا ۔ تاکہ وہ پریشان نہ ہوں اور اگر وہ گھبراتے تو اپنے آنسو پونچھ کر ان کو دلاسا دیا جاتا کہ تم کیوں گھبراتے ہو اس سے زیادہ ہم تمہارے شفیق اور خدمت کرنے والے موجود ہیں ۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ تطییب قلب مسلم اور تسلیہ محزون عبادۃ عظمیٰ ہے ۔ اسی طرح بیوی کی تسلی کرتے کہ بھائی لاعلاج کا علاج ہمارے قبضہ سے باہر ہے ۔ اور اس کا علاج تمہاری پریشانی سے بھی نہیں ہو سکتا ۔ باقی تمہاری راحت رسانی اور دلجوئی کے لئے ہم حاضر ہیں ۔ تم اس قدر پریشان نہ ہو ۔

غرض اس میں ایک تو یہ پریشانی ہے دوسرے وہی مخلوق کی طرف اس کو متوجہ کرنا جس کا

اوپر ذکر ہوا ہے۔ اسی طرح بعض مرد بھی جو زنانہ مزاج کے ہیں وہ بھی یہی ناشائستہ حرکت کرتے ہیں۔ اسی واسطے سخت ضرورت اس امر کی ہے کہ قرب موت کے وقت میت کے پاس عاقل دیندار لوگ ہوں۔ اگر گھر کی عورتیں اتفاق سے ایسی ہوں تو ان کے رہنے کا مضائقہ نہیں ورنہ مردوں میں جو ایسے لوگ ہوں ان کو پاس رہنا چاہیئے۔ اور وہ ان سب امور کی احتیاط اور انتظام رکھیں۔

بعضے لوگ یہ کرتے ہیں کہ بدفالی کے خیال سے یا قلت مبالات بالدین کی وجہ سے نہ اس وقت یٰسین پڑھیں اور نہ پڑھنا گوارا کریں۔ یا اس طرف التفات نہ کریں۔ اور نہ کلمہ کا اہتمام کریں۔ نہ اس کو متوجہ کریں جب کہ اس کو ہوش ہو اور نہ خود اس میں مشغول ہوں۔ جبکہ اس کو ہوش نہ ہو بلکہ دنیا کے فضول قصوں میں خصوص ان بکھیڑوں میں جن کی ضرورت بعد میں ہوگی مگر ابھی سے مشغول ہوجاتے ہیں۔ بعض جگہ تو کوئی اس کے پاس بھی نہیں رہتا اور وہ تنہا ہی ختم ہوجاتا ہے۔ سب ادہر ادہر مال و متاع پر قبضہ کرنے کی فکر میں بھاگتے بھاگتے پھرتے ہیں اور بعض جگہ اس لئے اس کے پاس نہیں پھٹکتے کہ اس کی بیماری لگ جانے کا خوف ہوتا ہے۔ اول تو بعض محققین کے نزدیک نفس تعدیہ ہی غلط ہے دوسرے بعض قول پر کہیں ہوا بھی تو بلا اذن خالق نہیں ہوتا اور نہ اذن دائم ہوتا ہے چنانچہ مشاہدہ شاہد ہے کہ اکثر جگہ کچھ بھی نہیں ہوتا پھر کتنی سنگدلی کی بات ہے کہ اپنے کو تو ضرر متحمل سے بھی بچایا۔ اور اپنے ایک بھائی مسلمان (یعنی اس مریض کو) ضرر متیقن میں مبتلا کیا۔ کیونکہ اس طرح تنہا رہ جانے سے اس کی بعض ضروریات میں فروگذاشت ہونے سے اس کو تکلیف بھی ہوگی اور اس کی دل شکنی بھی ہوگی۔ اور ان کے طرز عمل سے یہ معلوم کرکے کہ میں مرض متعدی مہلک میں گرفتار ہوں مایوس بھی ہوجاویگا۔ تو کتنی کلفتیں اس پر جمع ہوئیں اور ان محتاط صاحب کی ایک وہمی احتیاط ہوئی تو ایسی احتیاط خاک ڈالنے کے قابل ہے۔ اور افسوس تو یہ ہے کہ جو طبقہ ادعاء ہمدردی کے نعرے لگاتا ہے وہی اس لغو احتیاط میں زیادہ حصہ لیتا ہے۔

یہ تو ان کی شکایت تھی جو کہ مریض کے لئے مخواہ پاس رہ کر یا اس کو تنہا چھوڑ کر اس کے متوجہ الی اللہ کرنے کا اہتمام نہیں کرتے۔

بعض لوگ ان کے مقابلہ میں دوسری طرف غلو کرتے ہیں یعنی بزعم خود اس کو متوجہ الی اللہ کرنے میں اس قدر متشددانہ برتاؤ کرتے ہیں کہ اس کے پیچھے ہی پڑجاتے ہیں کہ وہ ذرا غافل ہوا اور اس پر تقاضا

شروع ہوا کہ کلمہ پڑھنا استغفار پڑھنا اور اگر اس کو ہوش نہ ہو تو برابر اس کے سر رہتے ہیں جب تک کہ وہ ان کا حکم نہ مانے۔ اور اگر ہوش آگیا اور اس نے پڑھ بھی لیا تو اس پر کفایت نہیں کرتے، پھر پڑھواتے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ اموختہ کی طرح پڑھتا ہی رہے۔ دم نہ لے۔ اللہ بچاوے۔ اس جاہلانہ زہد خشک سے۔

اس بات میں علمار کا ارشاد یہ ہے کہ اگر وہ ہوش میں ہو تو اس کو بسہولت کلمہ و استغفار کی طرف متوجہ کریں۔ اور جب وہ ایک بار پڑھ لے توبہ کرے پھر چھوڑ دیں۔ پھر جب تک وہ کوئی دنیا کا کلام نہ کرے دوبارہ پڑھنے کو نہ کہیں وہ مرض میں اور نزع میں پریشان ہوتا ہے اگر اس کے قلب میں تنگی پیدا ہو کر کلمہ و استغفار سے (نعوذ باللہ) کراہت و ناگواری ہوئی یا خدانخواستہ منہ سے انکار نکل گیا تو کس درجہ امر منکر ہے گو اس وقت کا ایسا فعل بھی قواعد شرع سے قابل اعتراض نہیں کیوں کہ وہ وقت پورے شعور اور پورے اختیار کا نہیں ہے لیکن تاہم عام دیکھنے سننے والوں کی نظر میں اس میت کی کتنی رسوائی ہے جس کا سبب یہ زاہد خشک بنا ہے۔ اور اگر وہ بالکل بے ہوش ہے تو اس کو کچھ پڑھنے وڑھنے کے لئے نہ کہیں۔ اس کے قریب پکار پکار کر سورہ یٰسین شریف اور کلمہ کلام وغیرہ پڑھتے رہیں تاکہ اگر قدرے ادراک ہو یا ہو جاوے تو قلب سے تو ادھر متوجہ رہے اور اسی توجہ میں خاتمہ ہو۔

بعضے آدمی اس سے بڑھ کر یہ کرتے ہیں کہ اخیر وقت تک اس سے باتیں کرانا چاہتے ہیں۔ اور بڑھ کر اس لئے کہا کہ ان زاہدان خشک نے تو اس سے کلمہ ہی پڑھوانا چاہا تھا جو کہ دین کا کام ہے انہوں نے دنیا کی باتیں کرانا چاہا یعنی جہاں وہ ذرا بے ہوش ہوا اس کو پکارتے ہیں کہ میاں فلانے ذرا آنکھ تو کھولو مجھ کو تو دیکھو میں کون ہوں تم کیسے ہو کچھ کہو گے کسی بات کو دل چاہتا ہے اور اسی طرح خرافات لغویات میں اس کو دق کرتے ہیں ان عقل کے پتلوں سے کوئی پوچھے کہ یہ ان باتوں کا وقت ہے اگر اس کا مرض مرض موت نہیں ہے اور اچھا ہو جاوے گا تو اچھا ہونے کے بعد جتنی چاہے باتیں کر لیجئو۔ اس وقت اس کو کیوں تکلیف دیتے ہو مرض میں ایسا تعجب ہوتا ہے کہ بات کرنا تو بڑی بات ہے بات سننا بلکہ کسی طرف دیکھنا خیال کرنا گراں گزرتا ہے اور یہ بزرگ اس سے مجلس آرائی کی توقع رکھتے ہیں اور اگر اس کا مرض مرض موت ہے تو ایسی باتیں کرنا اور بھی برا ہے۔

کیوں کہ قطع نظر تکلیف سے یہ سمجھنا چاہیئے کہ اب اس کو دنیا میں بہت تھوڑا وقت ملے گا سو اس کو تو اچھے مصرف میں صرف کرنا چاہیئے۔

البتہ اگر کوئی ایسی بات ہو جو شرعًا ضروری ہے مثلًا کسی امانت کو پوچھا جاوے کہ تم نے کہاں رکھدی ہے یا قرضہ اور لین دین کے بارہ میں پوچھا جاوے جس کا حال بدون اس کے دوسرے ذریعہ سے معلوم نہیں ہو سکتا یا کافی نہیں ہو سکتا یا اور اسی قسم کا کوئی حق واجب ہو اس کے متعلق پوچھ پاچھ کرنے کا مضائقہ نہیں بلکہ ضروری ہے بشرطیکہ اس کو زیادہ تنگی اور تکلیف نہ ہو جو تحمل سے زائد ہو سو ایسی بات درحقیقت دنیا کی بات نہیں ادائے واجب ہے جو طاعت کی فرد اعظم ہے اور چونکہ صورتًا دنیا ہی کی بات ہے اس لئے بہتر ہے کہ ایسی بات کا جواب لینے کے بعد پھر تہلیل و استغفار وغیرہ پڑھوا دیں۔ بشرائط مذکور سابقًا بعض لوگ قریب مرگ کو رو بقبلہ کرنے کا مسئلہ سن کر یہ کرتے ہیں کہ اس کا تمام بدن اور منھ پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں اور اگر وہ نزع روح میں بدن یا گردن کو حرکت دے جو حرکت اضطراریہ ہوتی ہے تو پھر مروڑ تروڑ کر رخ بدل دیتے ہیں۔

سو خوب سمجھ لینا چاہیئے اس مسئلے کا یہ مطلب نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب اس پر شاق نہ ہو یا وہ بالکل بے حس و حرکت ہو جاوے اس وقت رو بقبلہ کر دیں نہ یہ کہ اس سے کشتا کشتی کر کے اس کو تکلیف پہنچا دیں (درمختار)

نامحرم مرد کو مرنے کے بھی دیکھنا جائز نہیں

ایک بے احتیاطی ہوتی ہے کہ اس وقت اکثر نامحرم عورتیں بھی اس کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہیں گویا پردہ ضروری نہیں رہتا سو اگر اس کو اتنا ہوش ہے کہ وہ دیکھتا سمجھتا ہے تب تو اس کے سامنے آنا ایسا ہے جیسا تندرست کے سامنے آنا۔ مرض سے احکام معاف نہیں ہو گئے اور اگر اس کو اتنا ہوش نہیں ہے تو بہت سے بہت اس نے نہ دیکھا مگر ان عورتوں نے اس نامحرم مرد کو بلا ضرورت دیکھا جس کی ممانعت حدیث افعمیاوان انتما الستما تبصرانہ، کیا تم دونوں بھی اندھی ہو کیا تم دونوں اسے نہیں دیکھ رہی۔

مصرح ہے اور اگر کہا جاوے کہ اس وقت تو کسی مفسدہ کا احتمال نہیں ہے سو جواب یہ

ہے کہ اول تو حکم عام ہے مفسدہ کی قید نہیں ہے دوسرے ہم نے مفسدہ بھی دیکھا بعض عورتیں اس وقت دیکھ کر عاشق ہو گئی ہیں اور عمر بھر خیالات نجس میں مبتلا رہی ہیں گو ان کے ایقاع کی گنجائش نہیں رہی۔ لو العینان تزنیان، (آنکھیں بھی زنا کرتی ہیں) اور والقلب یزنی تو صادق آگیا۔

اگر عورت مرتے وقت شوہر کو مہر معاف کر دے تو اس کا اعتبار نہیں ہوتا

ایک کوتاہی جو نہایت عام ہے کہ جب کوئی عورت مرنے لگتی ہے کہتے ہیں کہ شوہر کو معاف کر دے اور وہ معاف کر دیتی ہے اور شوہر اس معافی کو کافی سمجھ کر اپنے کو دین مہر سے سبکدوش سمجھتا ہے اور اگر کوئی وارث مانگے بھی تو نہیں دیتا اور نہ اس کا دینا ضروری سمجھتا ہے۔

سو خوب سمجھ لیا جاوے کہ اس وقت کی معافی وصیت ہے اور وصیت وارث کے حق میں نافذ نہیں ہوتی جب تک کہ سب ورثہ بلوغ بشرط بلوغ اس کو منظور نہ کریں۔

اور اگر بعض جائز رکھیں بعض نہ رکھیں تو صرف جائز رکھنے والوں کے حصہ کے قدر نافذ ہو گی۔ باقی باطل ہوگی اور نا بالغ تو اگر جائز بھی رکھیں تو صحیح نہیں، پس اس صورت میں جو وارث نا بالغ ہیں ان کے حصہ کا مہر اور اسی طرح جو بالغ وارث جائز نہ رکھیں ان کے حصے کا مہر بھی واجب الادا ہو گا۔ اور وہ معافی ان کے حق میں محض باطل ہے مثلاً اس عورت کے وارث علاوہ شوہر کے تین بھائی ہیں ایک نا بالغ اور دو بالغ جن میں سے ایک نے اس معافی کو منظور کیا اور دوسرے نے نا منظور کیا اور مہر چھ سو روپے تھا تو اس صورت میں یہ حکم ہو گا کہ تین سو تو حصہ شوہری میں اگر معاف ہو گئے اور سو روپے بالغ منظور کرنے والے کے حصے میں آکر معاف ہو گئے۔ آگے دو سو روپے رہے سو تو نا منظور کرنے والے کا حق اس شوہر کے ذمہ ہے اور سو اس نا بالغ کا حق اس کے ذمہ ہے یہ دو سو روپے ادا کرنا ہوں گے۔ یہ مختصر تذکرہ ہوا حالت موت کے وقت کی بعض کوتاہیوں کا اب حالت بعد الموت کے متعلق لکھا جاتا ہے۔

حالت بعد الموت

اس میں اس قدر امور غیر مشروعہ شائع ہیں جن کا احصار مشکل ہے ان میں سے اکثر کو میں نے اصلاح الرسوم فصل چہارم میں مفصل و مدلل لکھا ہے یہاں صرف ان کی فہرست لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

(۱) دفن میں اعزا وغیرہ کے انتظار میں دیر کرنا۔

(۲) قبر پر اناج لے جانا۔

(۳) جانماز اور اوپر کی چادر ترکہ میں سے خریدنا۔

(۴) میت کے کپڑے بلاتقسیم ورثا کے مساکین کو دے دینا۔

(۵) تیجہ دسواں وغیرہ کرنا۔

(۶) برادری کو یا مساکین کو تفاخراً کھانا دینا۔

(۷) کئی بار عورتوں کا جمع ہونا جس میں ایک اجتماع انقضار عدت کے دن ہوتا ہے۔

(۸) بلاضرورت دور دور سے مدتوں تک مہمانوں کا آنا اور میت والوں پر بار ڈالنا۔

(۹) خاص قواعد کے ساتھ میت کے گھر اوّل روز کسی عزیز کے یہاں سے کھانا آنا۔

(۱۰) حفاظ وغیرہ کو کچھ دیکر قرآن پڑھوانا۔

(۱۱) مدت تک سوگ کرنا یہ تو عام اموات کے ساتھ معاملہ ہوتا ہے اور بعض معاملہ خاص بزرگوں کے ساتھ ہوتے ہیں جس کو رسالہ مذکور کے باب مذکور کی فصل دوم وسوم میں ذکر کیا گیا ہے۔ جیسے

(۱۲) عرس وفاتحہ مروّجہ کے منکرات اور

(۱۳) شب برات کا حلوہ اور عاشورہ کا کھچڑا اور شربت کہ ان کی بحث بھی بہت مبسوط لکھدی ہے اگر شوق ہو اس میں ملاحظہ فرمالیا جاوے۔ اب بعض وہ معاملات اس تیسری حالت کے متعلق مختصراً لکھتا ہوں جو اس میں نہیں لکھے گئے۔

میت اگر وصیت نہ کرے تو اس کی نماز وروزہ کا فدیہ ترکہ مشترکہ سے نہ دیں

پس ان میں سے ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے تقویٰ کے جوش میں آکر ترکہ مشترکہ میں بلا وصیت میت نماز روزہ کا فدیہ دلواتے ہیں سو اس میں حکم یہ ہے کہ اگر وہ وصیت کرے تو ثلث میں سے دینا حق ورثار پر مقدم ہے اور اگر وہ وصیت نہ کرے جس کو دینا ہو خاص اپنے حصے ترکہ یا اپنے پہلے مال سے دے۔

حیلہ اسقاط مروجہ کی تردید

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض لوگوں نے بجائے فدیہ کے ایک حیلہ اختراع کیا ہے کہ ایک قرآن مجید لاتے ہیں اور تمام عمر کی نماز و روزہ بلکہ کہیں کہیں کے معاصی کا حساب لگا کر اس قرآن کی اتنی بڑی قیمت تجویز کر کے کسی مسکین کو دیدیتے ہیں اور اس کا نام اسقاط رکھا ہے چونکہ وہ رسم کسی قاعدہ فقیہہ پر منطبق نہیں اس لئے محض باطل ہے۔

مُردہ دفن کر کے اذان دینے کا ثبوت نہیں

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض لوگ مردہ دفن کر کے قبر پر اذان کہتے ہیں۔ چونکہ شریعت میں کہیں وارد نہیں اس لئے واجب الترک ہے۔

اگر کہیں کوئی نماز جنازہ جاننے والا نہ ہو تو کیا کرے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض دیہات میں جہاں کوئی نماز پڑھنے والا میسر نہیں میت کو بدون نماز جنازہ کے دفن کر دیتے ہیں۔ میں نے ایک خطبہ میں جبکہ بہت دیہاتی جمع تھے اس کی تدبیر بتلادی تھی کہ اگر ایک آدمی بھی وضو کر کے جنازہ سامنے رکھ کر کھڑا ہو کر صرف چار بار اللہ اکبر کہدے تو نماز فرض جنازہ کی ادا ہو جائے گی۔ کیونکہ رکن اس نماز کا یہی چار تکبیریں ہیں۔ باقی دعائیں وغیرہ سنت ہیں۔ سو جہاں ایسا موقع ہو اتنا ہی کر لیں۔ ترک فرض کی معصیت سے تو محفوظ رہیں گے۔

قبر میں رکھ کر میت کے بدن کو رو بقبلہ اچھی طرح کروٹ دیدینا چاہیئے

ایک کوتاہی یہ کرتے ہیں کہ مردہ کو قبر میں رکھ کر صرف منہ تو قبلہ کی طرف متوجہ کر دیتے ہیں۔ باقی سارے بدن کو کروٹ نہیں دیتے۔ سو کتب فقہ میں مصرح ہے کہ تمام بدن کو اچھی طرح کروٹ دے دینا چاہیئے۔

میت کا منہ کھول کر قبر کو دکھانے کی کوئی اصل نہیں

ایک کوتاہی یہ کرتے ہیں کہ قبر میں رکھنے کے بعد اس کا منہ کھول کر قبر کو دکھانا ضروری سمجھتے ہیں۔ سو شریعت میں اس کی کچھ اصل نہیں۔

قبر میں عہدنامہ یا شجرہ وغیرہ نہ رکھنا چاہیئے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ قبر میں عہدنامہ یا شجرہ وغیرہ رکھتے ہیں اور میت کے گلنے سڑنے سے اس کی بے ادبی ہوتی ہے سو اس کو بھی ترک کرنا چاہیئے۔ البتہ جس چیز کا ادب شریعت میں اس درجہ کا نہیں اس کا قبر میں رکھ دینا درست ہے جیسے کسی بزرگ کا کپڑا وغیرہ۔

قبر پختہ کرنا ممنوع ہے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے قبر پختہ بناتے ہیں جس کی نصًا حدیث میں ممانعت آئی ہے۔

لڑکیوں کو میراث نہ دینا ظلم ہے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے لوگ لڑکیوں کو میراث نہیں دیتے جو نص قرآن حرام اور ظلم ہے۔

بیوہ کو تمام منقولات کا مالک سمجھنا بھی ظلم ہے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے بیوہ عورتیں اپنے کو تمام منقولات کا مالک سمجھتی ہیں۔ یہ بھی ظلم ہے جو چیز شوہر نے اس کو ہبہ کردی ہو وہ بیشک اس کی ہے۔ ورنہ اور سب ترکہ مشترکہ ہے۔ حسب فرائض سب کو دینا چاہیئے۔

ایک کوتاہی یہ ہے کہ جو چیز جس وارث کے قبضہ میں آجاتی ہے وہ اس کو چھپا ڈالتا ہے مگر یاد رہے کہ قیامت کو سب اگلنا پڑے گا۔

اگر دلہن میکے میں یا سسرال میں مرجاوے تو اس کا مال سب ورثہ کو ملے گا

ایک کوتاہی یہی کا شعبہ یہ ہے کہ اگر دلہن اپنے میکے میں مرجاوے تو اس کے تمام سامان پر وہ لوگ قبضہ کرلیتے ہیں اور اگر سسرال میں مرجاوے تو وہ قابض ہو جاتے ہیں ہم نے کہیں تقسیم شرعی ہوتے سنا ہی نہیں اس میں بھی اوپر کی وعید کو یاد رکھنا چاہیئے۔

میت پر کسی قسم کا قرض اگر دلیل سے ثابت ہو تو انکار نہ کرنا چاہیئے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بجز قرضۂ تمسک کے دست گردان قرض جو میت کے ذمہ ہو اور دلیل شرعی سے ثابت ہو اس کو کوئی شاذ و نادر ترکہ سے ادا کرتا ہے۔ صاف انکار کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ میت کا جو ایسا ہی قرضہ اوروں کے ذمہ ہے اور لوگ اس کو بھی مکر جاتے ہیں۔ دونوں امر صریح ظلم ہیں۔ خصوصاً میت پر اگر قرضہ ہو تو ورثہ کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ بروئے حدیث اس کی روح جنت میں جانے سے معلق رہے گی جب تک قرض نہ ادا ہو تو کیا اپنے عزیز کے لئے اتنا بڑا حرمان گوارا ہوگا۔

اگر میت کا کوئی وارث بطن مادر میں ہو تو اس کے تولد تک میراث تقسیم نہیں ہوگی

ایک کوتاہی یہ ہے کہ کبھی میت کے وارثوں میں وہ بچہ بھی ہوتا ہے جو ابھی بطن مادر میں ہے۔ ہم کو یاد نہیں کہ کسی مستفتی نے سوال میں کبھی اس کو ظاہر کیا ہو۔ اور ہم جواب دینے والے لوگوں کی بھی کوتاہی ہے اس کا احتمال ہی نہیں ہوتا اور سائل سے اس کی تحقیق ہی نہیں کرتے۔ مذہب کا ضروری مسئلہ ہے۔ بہت زیادہ قابل اعتناء کے ہے۔ بدون اس کے تولد کے تقسیم ترکہ کی صورت معلق رہے گی۔ بعد تولد کے صحیح سوال قائم ہوگا۔

کفن میں میت کی لنگی باندھ دینا بدعت ہے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض جگہ کفن میں میت کی لنگی باندھی جاتی ہے۔ جو بالکل بدعت ہے۔ بعض اردو خوانوں کو ازار یا اس کا ترجمہ لنگی دیکھ کر دھوکہ ہوا ہے سو سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ بھی پورا چادر ہوتا ہے۔

چونکہ لنگی کے حصہ کا وہ چادر امشروع ہوا ہے اس لئے اس کا نام یہی ہوگیا۔

شوہر اپنی مُردہ بیوی کا منہ دیکھ سکتا ہے اور اس کے جنازہ کا پایہ بھی پکڑ سکتا ہے۔

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے لوگ شوہر کو اس کی مردہ بیوی کا منہ نہیں دیکھنے دیتے نہ اس کے جنازہ کا پایہ پکڑنے دیتے ہیں یہ محض لغو ہے۔ میت کو ہاتھ لگانا تو بلاضرورت جائز نہیں لیکن منہ دیکھنا درست ہے اور پایہ پکڑنا مستحب ہے۔ بلکہ اگر کوئی محرم قبر میں اتارنے والا نہ ہو تو اور اجنبیوں سے شوہر احق ہے اور عورت کے لئے تو مردہ شوہر کو دیکھنا اور ہاتھ لگانا بھی درست ہے۔

کثرت آدمی کیلئے جنازہ کو دیر کرنا جائز نہیں

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض جگہ نماز جمعہ کے انتظار میں جنازہ کو رکھے رکھتے ہیں کہ زیادہ نمازی نماز پڑھیں گے۔ سو یہ بالکل جائز نہیں۔ جس قدر جلد ممکن ہو نماز اور دفن سے فراغت کرنا واجب ہے

اگر میت نے کسی خاص شخص سے نماز پڑھوانے یا کسی خاص جگہ دفن کرنے کی وصیت کی تو شرعًا ایسی وصیتیں لازم نہیں ہوتیں

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض اموات کسی خاص شخص سے نماز پڑھوانے یا کسی خاص مقام پر دفن ہونے کی وصیت کر جاتے ہیں تو احبار اس کا اس قدر اہتمام کرتے ہیں کہ بعض اوقات بعضے واجبات شرعیہ بھی ضائع ہوجاتے ہیں۔ سو جان لینا چاہیئے کہ ایسی وصیتیں شرعًا لازم نہیں ہوتیں اگر کوئی امر خلاف شرع لازم آوے تو اس پر عمل جائز بھی نہیں۔

الحمد للہ قسم سوم سے بھی فراغت ہوئی اس وقت ذہن میں یہی امور ظاہر ہوئے جو انشاء اللہ تعالیٰ قریب قریب کافی ہیں باقی اگر کوئی اور بات قابل تحقیق خیال میں آوے تو علماء سے رجوع کر لیا جاوے۔ جیسا حالت قبل موت کے بیان کے ختم پر بھی عرض کیا ہے۔

سفر کے معاملے میں کوتاہیاں

(اصلاح معاملہ بسفر)

منجملہ ان امور کے جن میں انقلاب واجب الاصلاح واقع ہوا ہے۔ سفر بھی ہے جو ایک معمولی روزانہ کی حالت ہے۔ جس کی وجہ سے اس کے انقلاب کی طرف ذہن بھی نہیں جاتا مگر ہماری بے علمی اور بدعملی سے اتنا بڑا خفیف امر بھی اس انقلاب سے محفوظ نہیں رہا۔ چنانچہ مختصراس کو بھی لکھا جاتا ہے۔

بلاضرورت سفر نہیں کرنا چاہیئے

سو منجملہ ان کوتاہیوں کے جو سفر کے متعلق ہیں۔ ایک یہ ہے کہ بکثرت سفر بلاضرورت کیا جاتا ہے جس کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس ارشاد میں ناپسند فرمایا ہے کہ جب سفر میں تمہاری حاجت پوری ہوجاوے تو اپنے گھر جلدی لوٹ آؤ۔ اس واسطے کہ سفر سے کھانے پینے سونے میں خلل پڑتا ہے۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جب بلاضرورت البقاء سفر پسند نہیں تو اس کا احداث تو بدرجۂ اولیٰ ناپسند ہوگا۔ کیونکہ احداث سے البقاء اہون اور اسہل ہے اور واقعی جیسا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔ سفر میں تمام سامان ضروری آسائش کا مختل ہوجاتا ہے۔

اور جس طرح طبعی آسائش میں خلل پڑتا ہے۔ اسی طرح شرعی زندگی میں یعنی دینی معمولات میں بھی اختلال واقع ہوتا ہے۔ جو مبتدی کے لئے خصوصیت کے ساتھ اور منتہی کے لئے بھی ایک درجہ میں مضر ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ

اور یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ ایک حدیث میں نص ہے کہ اگر مرض یا سفر کے سبب معمولات میں خلل پڑتا ہے تو حق تعالیٰ فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ میرے بندے کے لئے اتنا ہی ثواب لکھنا جتنا حالت صحت و حضر میں لکھتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ اختلال معمولات اوراد کا مضر نہیں۔

جواب یہ ہے کہ یہ اس سفر کیلئے ہے جو بضرورت ہو۔ اس لئے کہ اوپر غیر ضروری سفر کا ناپسندیدہ ہونا ثابت ہو چکا ہے تو اس کو اجر کے باب میں عذر کیسے کیا جاوے گا۔ اور اجر کی قید اس لئے لگائی کہ ایسے سفر میں قصر صلوٰۃ کی مشروعیت پر شبہ نہ ہو۔ حتیٰ کہ حضرت امام ابو حنیفہ؆ کے نزدیک تو سفر معصیت میں بھی قصر مشروع ہے تو اس قید سے یہ شبہ جاتا رہا۔ حاصل یہ ہے کہ قصر تو احکام دنیویہ سے ہے۔ اس کے سفر کا مرضی یا نامرضی ہونا منع نہیں بخلاف اجر کے کہ احکام اخرویہ میں سے ہے۔ اس کا مدار رضا پر ہے جیسے ایک شخص کسی دنیوی غرض سے قتال کر کے شہید ہو جاوے تو اس کے متعلق جو احکام دنیویہ ہیں مثلاً غسل نہ دینا وغیرہ۔ وہ تو اس صورت میں بھی مرتب ہو جاویں گے باقی جو احکام اخرویہ ہیں مثلاً اجر و ثواب و درجات وہ مرتب نہ ہوں گے جب تک وہ قتال عند اللہ مرضی و پسندیدہ نہ ہو کہ نیت خالص اعلاء کلمۃ اللہ کی ہو۔

ایک اور شبہ کا ازالہ

اور یہ بھی شبہ نہ کیا جاوے کہ کھانے سونے میں خلل پڑنا تو مجاہدہ ہے۔ اور مجاہدہ بھی اصل طریق ہے تو اس کا سبب کہ سفر ہے کسی حال میں ناپسندیدہ نہ ہونا چاہئے کیونکہ اول تو ہر اختلال فی الطعام والمنام مجاہدہ نہیں۔ مجاہدہ وہی ہے جو بغرض اصلاح نفس کیا جاوے تو اگر ایسا ہے تو اس میں کلام نہیں چنانچہ عنقریب اس کے جواز کی تحقیق آتی ہے کلام تو اس سفر میں ہے جو محض بلا مصلحت معتد بہا کیا جاوے مثلاً صرف تعطیل پوری کرنے کو، یا محض شہروں کی سیر کرنے کو، یا نمائش دیکھنے کو، ونحو ذلک یا اس سے بڑھ کر کسی معصیت کی تحصیل و تکمیل کو اس میں

کون سی اصلاح نفس ہے پس اس میں جو اختلال ہوگا وہ مجاہدہ کس طرح ہوگا۔

ایک تیسرے شبہ کا ازالہ اور یہ بھی شبہ نہ کیا جاوے کہ بہت سے بزرگوں سے منقول ہے کہ انہوں نے اپنی تمام عمر ہی سیر سیاحت میں گذار دی۔ ایک جگہ قرار ہی نہیں لیا۔ اور ظاہر ہے کہ تمام عمر کسی کو حاجت نہیں رہتی تو انہوں نے کیا حدیث کے خلاف کیا؟

جواب یہ ہے کہ حاجت منحصر دنیوی اور نفسانی ہی حاجت میں نہیں ہے۔ اس سے زیادہ اپنی اصلاح اور حفظ دین کی حاجت ہے۔ سو بعضے بزرگوں کو اپنے تجربے سے یا کسی شیخ کامل کی تشخیص سے قیام میں مضرتیں محسوس ہوئیں مثلاً مخلوق سے زیادہ تعلق ہو جانا، لوگوں کا معتقد ہو جانا۔ جبکہ اس سے عجب وغیرہ کا اندیشہ ہو یا بد اندیشیوں سے اندیشہ ضرر لاحق ہونا ومثل ذالک۔ اور سفر میں ان آفات سے نجات دیکھی اور غوائل سفر سے محفوظ رہنے کی امید دیکھی۔ اس لئے سفر اختیار کر لیا سو وہ سفر بلا ضرورت نہ ہوا۔ جیسا کہ سیر میں مذکور ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اکثر سفر میں رہتے تھے سو اختلاف مذاق سے مصلحتیں بدل جاتی ہیں مگر اس کا تشخیص کرنا کہ ہمارے لئے سفر نافع ہے یا مضر موقوف ہے۔ بڑی بصیرت پر ہر شخص کو اپنی رائے پر وثوق نہ کر لینا چاہیئے۔ کسی شیخ کامل سے ضرور مشورہ کر لے کہ اس کی اور اس کے متعلقین اہل حقوق کے مصالح پر عمیق نظر کر لے۔ اور جس طرح دینی مصلحت مبیح سفر ہے۔ اسی طرح دنیاوی مصلحت بھی جو حسب قواعد شرع بھی مصلحت ہو مجیز سفر ہے۔ جیسا تلاش معاش حلال کے لئے سفر کرنا، یا تعدیل مزاج کے لئے سفر کرنا جبکہ طبیب نے تجویز کیا ہو یا کسی دوست یا قریب سے ازدیاد محبت و سرور کے لئے سفر کرنا، یا کسی نافع تحقیق کے لئے سفر کرنا بشرطیکہ اس میں غلو نہ ہو جیسا کہ بعض شائقان تحقیقات جدیدہ کو غلو ہو گیا ہے۔ کہ ان کی مساعی شاقہ اس مثل کا مصداق ہو جاتی ہیں۔ کوہ کندن و کاہ برآوردن جن کی مذمت اس آیت میں بھی ہے وکم اھلکنا قبلھم من قرن ھم اشد منھم بطشا فنقبوا فی البلاد الآیۃ

اور جب بلا ضرورت سفر مذموم ہے تو معصیت کے لئے سفر کرنا تو بہت ہی قبیح ہوگا۔ پھر بعض امور تو صورۃً بھی معصیت ہیں۔ جیسے کسی نامحرم عورت سے نفسانی خواہش پورا کرنے کو سفر کرنا، یا ناچ رنگ دیکھنے کے لئے سفر کرنا، یا نامشروع رسم شادی میں شریک ہونے کے لئے سفر کرنا۔ ومثل ذالک۔

اور بعض امور عوام کے نزدیک طاعات و قرب ہے مگر اہل علم کے نزدیک معصیت ہے۔ جیسے آج کل کے اعراس میں جانا مزارات پر نذر و نیاز کے لئے حاضر ہونا۔ یا عوام کے نزدیک مباح ہے اور اہل علم کے نزدیک قبیح ہے۔ جیسے ان شادیوں میں یا براتوں میں شریک ہونا جن میں ناچ رنگ وغیرہ نہ ہو۔ لیکن تفاخر و ناموری کے سارے کام ہوں عوام تو یہ سمجھکر تسلی کر لیتے ہیں کہ اس میں ڈومنی نہیں، ناچ نہیں گناہ کی کیا بات ہے۔ لیکن اہل علم کے نزدیک جس طرح یہ امور معصیت ہیں اسی طرح کبر و فخر و ریا و جاہ کا سامان سب معصیت ہے۔ ان دونوں میں فرق کرنا اہل علم کی نظر میں محل تعجب ہے۔ ولنعم ما قیل ؎

ریا حلال شمارند و جام بادہ حرام
زہے شریعت و ملت زہے طریقت و کیش

اور بعض امور ایسے دقیق ہیں کہ بعض اہل علم بھی ان کو مباح یا قربت سمجھتے ہیں۔ مگر محققین راسخین فی العلم ہی اس کی تہ تک پہنچ کر اس کو روکتے ہیں مثلاً شیخ کامل کی زیارت کے لئے سفر کرنا، جبکہ والدین مانع ہوں۔ ظاہرین اہل علم بھی اس خیال میں مبتلا ہیں کہ پیر کا حق والدین سے زیادہ ہے کیونکہ وہ مربی روح ہے اور والدین مربی جسم ہے۔

سو حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ مقدمہ علی الاطلاق بھی ہو تو دوسرا مقدمہ ہنوز محتاج اثبات ہے۔ یعنی ہر مربی روح کا حق ہر مربی جسم سے زیادہ ہے۔ بات یہ ہے کہ تربیت روح کے مراتب مختلف ہیں ایک مرتبہ تو تربیت فی الفرائض والواجبات کا ہے اس میں تو واقعی شیخ کا حکم مقدم ہے حکم والدین پر۔ اور وہ بھی نہ اس وجہ سے کہ وہ شیخ ہے۔

بلکہ اس وجہ سے کہ وہ واجبات شرعیہ کی طرف رہبری کر رہا ہے اور اگر والدین اس سے روکتے ہیں تو معصیت کی طرف بلا رہے ہیں اور لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق (ترجمہ) اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں) قانون شرعی ہے پس واقع میں یہاں خالق کی اطاعت مقدم ہوئی مخلوق کی اطاعت پر نہ کہ شیخ کی اطاعت مقدم ہوئی اطاعت والدین پر۔

اور ایک مرتبہ تربیت فی التطوعات کا ہے سو اس میں والدین کا حکم مقدم ہے تطوعات پر نہ اس وجہ سے کہ یہاں والدین کی اطاعت مقدم ہو گئی ہے خالق کی اطاعت پر بلکہ اس وجہ سے کہ یہاں خالق کا امر ہی نہیں۔ ان تطوعات کے لئے بلکہ خالق نہ مخلوق کی احتیاج کی رعایت

فرما کر خود یہ حکم فرما دیا کہ اسی کی مصلحت کی رعایت کرو سو فی الواقع یہاں بھی خالق ہی کی اطاعت ہوئی۔

دوسری مثال جس کی قعر تک راسخین فی العلم ہی پہنچتے ہیں۔ سفر کرنا طلب علم دین کے لئے جبکہ والدین مانع ہوں کہ یہاں بھی ظاہراً تحصیل علم دین مقدم ہے۔ مگر غور طلب بات یہ ہے کہ آیا ہر درجہ تحصیل علم کا واجب و فرض ہے کہ وہ اطاعت والدین پر مقدم ہو۔ سو اس میں مثل بکی امر بالا دہی تفصیل ہے۔ کہ ایک درجہ واجب کا ہے وہ مقدم ہے حقوق والدین پر مگر وہ اردو میں بھی حاصل ہو سکتا ہے اور وہ عربی کے ملخص نصاب سے بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے تبحر فی العلوم النقلیۃ کی کون سی ضرورت ہے۔ کہ خواہ والدین کو کیسی ہی جسمانی یا روحانی کلفت ہو گر یہ بدون زواہد ثلثہ کے ایک ایک حرف کے دھوئے ہوئے ادھر رخ نہ کریں گے۔ اور ایسے مضیعین حقوق تو عاصی ہوتے ہی ہیں۔ میرے نزدیک تو جو لوگ ان کے طبق و سبق کا انتظام کرتے ہیں وہ بھی ملامت سے نہ بچیں گے کہ اعانت کرتے ہیں امر غیر مشروع پر۔

اور ایک مضمون اس باب میں اس سے زیادہ نازک ہے وہ یہ کہ بعض ظاہر بین یہاں تک تو پہنچ جاتے ہیں کہ صورت مذکورہ میں شیخ کی یا استاد کی خدمت و صحبت میں رہنا نہ چاہیئے بلکہ والدین کی خدمت و اطاعت کرے مگر ان کو اس میں اس قدر غلو ہو جاتا ہے کہ اس سے نیچے کی تہ کو نہیں دیکھتے صرف یہ دیکھتے ہیں کہ یہ طالب جس کام میں مشغول ہے وہ مندوب ہے اور اطاعت والدین کی واجب ہے اور واجب مقدم ہے مندوب پر پس اس شخص کو مجبور کرتے ہیں کہ اپنے شغل کو چھوڑ کر والدین کے پاس جاوے۔ سو اس نے اتنا تو صحیح سمجھا کہ واجب مقدم ہے۔ مندوب پر۔ مگر غلطی یہ ہوئی کہ اس کو مندوب سمجھ لیا اور غلطی کی وجہ یہ ہوئی کہ اس کے جزو حالی کو دیکھا جزو مالی کو نہیں دیکھا بعض امر ایسا ہوتا ہے کہ باعتبار حال کے وہ غیر ضروری نظر آتا ہے لیکن باعتبار مآل کے مقدمہ ہوتا ہے کسی امر واجب کا اور ظاہر ہے کہ مقدمہ واجب کا واجب ہے۔

پس اس بناء پر وہ واقع میں واجب ہی ہوتا ہے اور واجب کا تقدم حق والدین پر ہوتا ہے اس لئے ان ظاہر بینوں کا حکم اس میں غلط ہو جاوے گا۔ اور یہ امر اس قدر دقیق ہے کہ بعض دفعہ اہل ظاہر اس کو قبول کرنے میں بھی تامل کرتے ہیں۔ محققین نے یہاں تک کہا ہے کہ اگر خلوت و ریاضت سے طبیعت ملول ہو جاوے اور قرائن سے معلوم ہو کہ اگر اس حالت کو امتداد ہوگا تو طبیعت

بے کار ہو جاوے گی تو اس شخص پر واجب ہے کہ خلوت چھوڑ کر تفریح مباح میں مشغول ہو۔ باہر نکلے، دوستوں سے ہنسے بولے۔ جب طبیعت میں تازگی و نشاط پیدا ہو جاوے۔ تب پھر خلوت میں بیٹھ جاوے۔

ان محققین پر بڑی ملامت کی گئی ہے۔ کہ اوراد کو جو طاعات ہیں منہی عنہ اور مزاح کو جو کہ دین کا کام بھی نہیں واجب کہتے ہیں مگر جو شخص علوم شرعیہ میں اتقان و امعان کا درجہ رکھتا ہے اس کو اس حکم میں کچھ بھی تعجب نہ ہو گا۔ حدیث تو اس سے زیادہ کی تصریح کر رہی ہے وہ حدیث یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشاب و پاخانہ کے دباؤ کے وقت نماز پڑھنے کو منع فرمایا ہے۔ سو دیکھئے کہ پیشاب و پاخانہ تو مزاح سے بھی ادون ہے۔ اور فرض نماز اوراد سے بھی اعلیٰ ہے۔ جب اس شخص پر خاص حالت میں نماز کو تو حرام اور تغوط کو تو واجب فرمایا۔ تو ان بعض محققین پر ملامت کی کیا گنجائش ہے تو اس مزح کے وجوب کا سبب یہی ہے کہ تعطل و بطالت و کسل کا علاج واجب ہے تاکہ اس کا اثر فرائض و واجبات تک نہ پہنچ جاوے۔ اور اس واجب کا طریق عادۃً اس شخص کے لئے یہی مزاح ہو گیا تھا اس لئے یہ مزاح بھی واجب ہو جاوے گا۔

اسی طرح بعض حالات میں مبصر کو کسی خاص شخص کی استعداد دیکھ کر ادراک ہوتا ہے کہ اگر اس کو تبحر فی العلوم و احاطہ نقلیات و عقلیات کا نہ ہوا یا یہ شخص کسی شیخ کامل کے پاس چندے نہ رہا تو آئندہ کسی وقت اس کے کسی ضروری جزو دین میں خلل واقع ہونا غالب ہے اور اس کی حفاظت ہے واجب۔ اور اس کا طریقہ یہی تبحر و تفرغ للعبادۃ الی مدۃ معدودۃ ہے اس لئے یہ مبصر اس شخص کے لئے اس مندوب ظاہری کو واجب کہے گا اور اس ظاہر بین کے حکم و تجویز کو غلط سمجھے گا۔ چنانچہ محققین کے کلام میں ایسی تصریحات موجود ہیں۔ پس اس ظاہر بین کو چاہیئے کہ وہ حدیث الشاھد یری مالا یراہ الغائب پر عمل کر کے اپنی رائے پر وثوق نہ کرے اور اس طالب کو تقدیم حق والدین کی رائے نہ دے۔

حضر علیہ السلام کے تصرفات کا مبنی یہی مآل بینی تھی گو وہ کمال موسوی سے اس لئے بڑھا ہوا نہ تھا کہ منشا اس مال بینی کا کشف تھا اور ان واقعات کو فراست اور بصیرت سے کوئی تعلق نہ تھا اور موسیٰ علیہ السلام کا کلام یہی تھا۔ اس لئے ان کی نظر سے یہ امور غائب رہے اور ادراک بصیرت

ادراک کشف سے افضل واکمل ہے اس لئے افضل موسیٰؑ ہی تھے۔

بعض جگہ اس مبصر کے نزدیک خود اس طالب پر اندیشہ اس کا نہیں ہوتا کہ بدون تبحر فی العلوم کے اس کا کوئی ضروری دینی جزو مختل ہو جاوے گا۔

مگر یہ طالب ہے ایسے مقام کا رہنے والا جہاں جہل وفساد غالب ہے اور اس کے ساتھ ہی کسی کو تحصیل علم دین کی طرف توجہ نہیں جس سے ان کی اصلاح ہو پس گو اس نواح والوں پر بطریق فرض کفایہ ہی تبحر واجب ہے مگر کوئی اس میں مشغول نہیں تو سب ہی گنہگار ہوں گے اور ان سب میں یہ طالب بھی گنہگار ہوگا اور گناہ سے بچنا واجب ہے اس لئے اس واجب پر نظر کرکے یہ مبصر اس طالب کو رائے دے گا کہ تم والدین کے امر کو چھوڑ کر تبحر علوم میں حاصل کرو۔ اور اپنی قوم کی اصلاح کرو۔ اس لئے ایسے مشتبہ مواقع میں اپنی یا محض ظاہر پرست کی رائے پر وثوق نہ کرے کسی محقق حکیم مبصر جامع ظاہر و باطن سے فتویٰ لے کر اس کا اتباع کرے۔

تیسری مثال ایسے امور دقیقہ کی جن کو بعض اہل علم بھی مباح یا قربت سمجھتے ہیں مگر محققین راسخین اس کو روکتے ہیں۔ سفر کرنا حج نفل کے لئے ظاہراً قربت معلوم ہوتا ہے مگر بعض اشخاص کے خاص حالات سے محقق کو اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا حج کرنا اس لئے مضر ہوگا کہ یا تو اس سے فرض نماز کی پابندی نہ ہوگی یا اہل وعیال کے حقوق واجبہ ضائع ہوں گے۔ یا قلت زادراہ کے سبب تکلیفیں اٹھاوے گا اور اس کے قلب میں بیت اللہ یا صاحب البیت سے تنگی وشکوہ پیدا ہوگا جیسا بعض لوگوں کو دیکھا جاتا ہے یا یہ کہ سوال حرام میں مبتلا ہوگا ونحو ذلک۔ اور یہ سب معاصی ہیں اور معصیت کا سبب بھی معصیت ہے اس لئے وہ محقق اس شخص کو حج سے منع کرتا ہے اس لئے کہ جس طرح مقدمۃ الواجب واجب قاعدہ ہے۔ اسی طرح مقدمۃ الحرام حرام بھی ایک قاعدہ ہے جس میں بعض اوقات مثل قاعدہ بالا ظاہر بینوں سے غلطی بھی اور ان کو اہل بصیرت کے بعض احکام پر استعجاب بھی ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ ایک محقق کا یہاں تک قول ہے کہ اگر کسی شخص کو شریعت سفر حج کی اجازت نہ دے اور قرائن قویہ سے یہ معلوم ہو کہ اگر وہاں کے حالات اس شخص کے سامنے بیان کئے جائیں گے تو اس کو اس قدر شوق ہوگا کہ بہ اضطراراً سفر میں چل کھڑا ہوگا۔ تو ایسے شخص کے سامنے ایسے شوق انگیز حالات بیان کرنا تک جائز نہیں۔ ان محقق پر اس حکم میں بے حد ملامت ہوتی

کر توبہ توبہ وہاں کے حالات بیان کرنے کو منع کر دیا۔ مگر ان بزرگ معترضوں نے یہ نہ دیکھا کہ جس دلیل سے یہ منع کر رہے ہیں آیا اس کے کسی مقدمہ میں کوئی خدشہ ہے اگر ہے تو اس کو صاف کرنا چاہیئے اگر نہیں ہے تو ماننا چاہیئے مقدمات کو تسلیم کر کے نتیجہ میں کلام کرنا محض تحکم و اعتساف و کج روی و بے راہی ہے۔ یہی ہے وہ قاعدہ جس کی بنا پر محققین اکثر بدعات کو منع کرتے ہیں اور عامی نظر کے لوگ، یا اہل تعنت اُن سے اُلجھتے ہیں اسی کو کہا ہے:

وکم من عائب قولا صحیحا

وآفته من الفهم السقیم

سفر شروع کرنے کے بعد کی کوتاہیاں

یہاں تک ذکر تھا اس کوتاہی کا جو سفر شروع کرنے سے متعلق واقع ہوتی ہے۔ بعض کوتاہیاں بعد سفر شروع کرنے کے ہوتی ہیں مثلاً بعضے آدمی رفیقان سفر سے ذرا ذرا بات پر اُلجھتے ہیں کہیں اس پر کہ تم اپنی باری میں جاگے کیوں نہیں؟ کہیں اس پر کہ اسباب ہم اٹھاتے ہیں تم کیوں نہیں اٹھاتے اس پر کہ تم نے گاڑی کا کرایہ زیادہ دیا یا کہیں اور زیادہ خرچ کر دیا خصوص سفر حج میں کہ گنوار بھی نوابی مزاج کا ہو جاتا ہے سو یہ بات سخت بدخلقی میں داخل ہے اول تو یہ امور قابل خیال و مطالبہ کے نہیں دوسرے اگر ان کا مطالبہ ہی رفیق سے مطلوب ہے تو اس کا یہ طریق نہیں کہ یہ اس کے عیب چھانٹے اور وہ اس کے عیب نکالے۔ بلکہ طریقہ سہل اور مجرب النفع یہ ہے کہ تم اس سے کچھ مت کہو خود برابر کام کیئے جاؤ اس سے خود وہ شرماوے گا۔ اور خود بھی کام کرے گا۔ اور اگر وہ اس سے بھی متاثر نہ ہو اور تم میں صبر و تحمل نہ ہو تو بہتر ہے کہ اس سے عقد رفاقت قطع کر دو اور جواب دے دو کہ اب سے ہم تم رفیق نہیں بس مثل دیگر مسافروں کے اس سے معاملہ رکھو کہ نہ دوستی و شرکت اور نہ دشمنی و مزاحمت۔

بعض لوگ رفیقوں سے تو اچھا معاملہ رکھتے ہیں لیکن دوسرے مسافروں سے بدخلقی کرتے ہیں کبھی اپنے نفس کے لئے اور کبھی اپنے رفیق کے لئے۔ خصوص ریل میں کہ اکیلا آدمی یا دو آدمی کئی کئی آدمیوں کی جگہ گھیر کر کچھ خود پھیل کر کچھ اسباب و بستر پھیلا کر بیٹھتے ہیں اور نئے آنے والوں کو تو اکثر آنے ہی نہیں دیتے۔ طرح طرح کے حیلے کرتے ہیں۔ کبھی زور و ظلم سے بھی کام لیتے ہیں اور اگر وہ چلے

ہی آئے تو ان کو بیٹھنے کی جگہ نہیں دیتے کئی کئی اسٹیشن وہ لوگ کھڑے ہو کر قطع کرتے ہیں اور ان کو ذرا مروت وترحم نہیں آتا۔ یہ نہیں سوچتے کہ اگر ہم ان کی جگہ ہوتے اور یہ ہماری جگہ تو ہم اس وقت ان سے کس معاملہ کے متمنی ہوتے۔ پس وہی معاملہ ہم کو ان سے کرنا چاہئیے اور نہ یہ سوچتے ہیں کہ یہ شرعاً بھی جائز نہیں۔ جیسے کہ اور بھی بعض ناجائز امور کا ریل میں ارتکاب کیا جاتا ہے جس کی جزئیات کو بقدر ضرورت ہمارے محب و مکرم مولانا سید اصغر حسین صاحب دیوبندی نے ایک رسالے کی شکل میں جمع فرمایا ہے جس کا نام رفیق سفر یا زاد المسافرین ہے اور انشاء اللہ عنقریب طبع ہو جائے گا۔ اس لئے ہم ایسے جزئیات کے ذکر کا اس جگہ اہتمام نہیں کرتے اور یوں بلا قصد کوئی جزئیہ قلم میں آجاوے وہ اور بات ہے۔

بعضے آدمی مشترک سواری میں (جیسے گھوڑا گاڑی یا اونٹ گاڑی یا موٹر ریل) ایسی حرکتیں کرتے ہیں کہ جس سے دوسروں کو اذیت ہوتی ہے۔ خاص کر ایسے غربا کو اذیت جو ان کی وجاہت کے سبب ان کے سامنے ...... دم بھی نہ مار سکیں۔ مثلاً سگریٹ پینا اور دھواں باہر چھوڑنے کا کوئی خاص اہتمام نہ کرنا۔ یا شب کے وقت غل مچا کر باتیں کرنا یا گانا بجانا اور کوئی بیہودہ ہنسی مذاق کرنا یا قول یا فعل فحش اختیار کرنا اور اس کو مشغلہ سفر سمجھنا چاہئے۔ تو یہ کہ دوسروں کو راحت پہنچاوے اور اگر اس کی توفیق نہ ہو تو کم از کم اس پر تو عمل رکھیں۔ مصرعہ

مرا بخیر تو امید نیست بد مرسان

بعضے آدمی مالک سواری سے بدعہدی کرتے ہیں مثلاً معاہدہ ہوا ہے چار آدمی کے بٹھلانے کا اور بٹھا دئیے پانچ چھ۔ اگر وہ نزاع بھی نکریں۔ تب بھی اس کو جائز نہ سمجھنا چاہیئے اور یہ خیال نہ کرنا چاہئیے کہ جب خاموش ہو گیا تو راضی ہی ہے۔ کیونکہ بعض اوقات خاموشی بوجہ مروت و لحاظ کے ہوتی ہے مگر دل سے رضا نہیں ہوتی۔ تو ایسی خاموشی کافی نہیں۔ اور بعض دفعہ وہ نزاع بھی کرتا ہے مگر خواہ مخواہ اس کو دباتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں میاں ایسی کیا بے مروتی ہے؟ کبھی کہتے ہیں کہ میاں سواریان ہی کیا ہیں دو تو بچے ہی ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ ارے بھائی دو پیسے زیادہ لے لینا۔ کبھی کہتے ہیں کہ کسی دوسرے وقت سمجھ لینا اور واہی تباہی عذروں سے کام لیتے ہیں۔ اور اس سے بحث نہیں کہ یہ جائز ہے یا ناجائز ہے۔ سیدھی بات تو یہ ہے کہ جب معاہدہ بدلے تو مالک سے صاف اطلاع کرے اور اس کے متعلق مستقل گفتگو کر کے جس طرح باہم طے ہو جائے اس کے موافق عمل کرے محض اپنے جی کو سمجھا لینا کافی نہیں۔

مزدوری کے متعلق کوتاہی

بعضے آدمی مزدور کی مزدوری نہیں ٹھہراتے، پھر بعضے تو بلا کسی ضابطہ کے جو جی میں آیا دے دیا۔ خواہ دوسرا راضی ہو یا نہ ہو اس کا ظلم ہونا تو ظاہر ہی ہے اور بعضے اپنے زعم میں بے راہی سے بچتے ہیں اور ضابطہ کی پابندی کرتے ہیں یعنی اس محکمہ کے قواعد کے موافق کہ فی عدد اس قدر دیا جاوے کہ دیدیتے ہیں اسی طرح گاڑی وغیرہ کا کرایہ گھنٹوں کے حساب سے دینے کو کافی سمجھتے ہیں ہم نے خود دیکھا ہے کہ بعض اوقات دوسرا آدمی یعنی مزدور اور گاڑی والا اپنی نارضامندی تصریحاً ظاہر کرتا ہے کہ صاحب ایک پیسہ تو فلانا ہی لے لیگا۔ دیکھئے! کیا وزنی اسباب ہے ؟ اس کا تو زیادہ دینا چاہیے۔ فی عدد کا حساب تو مختلف مقدار کی گٹھریوں میں ہے۔ دیکھئے! چاروں گٹھریاں بڑی ہی بڑی ہیں۔ مشکل سے اٹھائی ہیں ایک ایک عدد دو آدمیوں کے اٹھانے کا ہے۔ آپ اس کا بھی اسی حساب سے دیتے ہیں ؟

غرض اس طرح سے وہ اپنی نارضامندی کا اظہار کرتا ہے۔ مگر یہ حضرات ان سب معروضات کو یہ کہہ کر ٹال دیتے ہیں کہ صاحب ان لوگوں کی یہ عادت ہی ہوتی ہے۔ غرض التفات ہی نہیں کرتے اگر وہ زیادہ بولا دھمکاتے ہیں۔ حملہ بھی کرتے ہیں وہ غریب خاموش ہو کر رہ جاتا ہے۔

عقد اجارہ میں مزدور یا مالک کی رضامندی شرط ہے

سو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ عقد اجارہ میں مزدور یا مالک کی رضامندی شرط ہے کوئی ضابطہ مقرر ہو جانا شرعاً کافی نہیں یہ مسئلہ تسعیر کا ہے جس کو فقہاء نے ناکافی لکھا ہے۔ البتہ اس سے منتفع ہونے کی ایک صورت ہے جو شرع کے موافق ہے وہ یہ کہ پہلے سے یہی کہہ دیا جاوے کہ دیکھو! ہم اس ضابطہ کے موافق دیں گے اس کے بعد جب اس نے کام شروع کر دیا یا سواری میں بٹھلا لیا اب وہ اس کے حق میں حجۃ اور لازم ہو گیا۔ خوب سمجھ لینا چاہیے۔

بعضے آدمی اسباب شرط سے زیادہ لاد لیتے ہیں بلکہ بعضے کچھ شرط ہی نہیں کرتے اور سواری والا یہ سمجھ کر خاموش ہو جاتا ہے کہ معمول کے موافق ہو گا۔ مگر عین وقت پر اس کے زعم میں ثابت ہوتا ہے زیادہ تو وہ تکرار کرتا ہے۔ اور باہم اختلاف اور نزاع ہوتا ہے پھر جو بھی غالب آ گیا سو اس میں شرعی حکم یہ ہے کہ جہاں سواری کا مالک خود کہدے کہ اس سے زیادہ اسباب نہ رکھا

جاوے اور پھر اس سواری کو یہ کرایہ کرے تو اس شرط کو اس نے منظور کر لیا پھر اس سے زیادہ لے جانا کسی طرح جائز نہیں جب تک وہی راضی نہ ہو۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ مالک کا راضی ہونا شرط ہے جس نے شرط ٹھہرائی ہے کسی دوسرے ملازم وغیرہ کا راضی ہونا کافی نہیں۔ البتہ اگر ملازم کو اختیارات شرط ٹھہرانے کے بھی دیئے گئے ہوں تو پھر اس کی رضا بھی کافی ہے۔

ریل وغیرہ میں قانون سے زائد اسباب لے جانا جائز نہیں

یہاں سے ریل میں قانون سے زائد اسباب لے جانے کا حکم اور یہ بھی کہ اگر ریلوے سے ملازم چھوٹے بڑے زیادہ کی اجازت دیدیں تو اس کا ناجائز ہونا بھی معلوم ہو جاوے گا خواہ وہ کچھ لے کر اجازت دیں یا ویسے ہی رعایت کریں۔ کیونکہ وہ ریل کے مالک نہیں اور اگر مالک کی طرف سے کوئی شرط وقانون وغیرہ نہیں ہے تو پھر اس سے کرایہ کرتے وقت دکھلاوے کہ یہ اسباب ہے یا وزن تبلادے کہ اتنا ہوگا اس سے زیادہ ناجائز ہوگا۔

میں نے اپنے بعض اساتذۂ کتب ابتدائیہ سے رئیس الاتقیاء حضرت مولانا مظفر حسین صاحب قدس سرہ کی حکایت سنی ہے کہ اسباب دکھلانے کے بعد اگر کوئی شخص ایک خط بھی دیتا تھا کہ فلاں شخص کو دیدیجئے تو فرمادیتے تھے یہ گھوڑے والے سے اجازت لے لو کیونکہ یہ مشروط سے زیادہ ہے۔

میرا اس حکایت کے نقل کرنے سے یہ مقصود نہیں کہ یہاں تک رعایت واجب ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ دیکھئے! احتیاط والے امر غیر واجب تک کی رعایت واہتمام کرتے ہیں۔ جس سے غرض یہی ہوتی ہے کہ دوسرے دیکھنے والے واجب کا تو خیال کریں گے تو مطمح نظران کا تعلیم ہی ہے۔ اب اس کے بعد شبہ غلو یا تقشف کا بھی زائل ہو گیا سو اس حالت میں ہم کو امور واجبہ کی تو رعایت واہتمام کرنا چاہیے یہ غلطیاں تو معاملات کے متعلق تھیں جو سفر میں ہوتی ہیں۔

سفر میں نماز چھوڑنا دیانات کے خلاف ہے

بعض غلطیاں دیانات کے متعلق ہوتی ہیں۔ مثلاً بعض آدمی سفر میں نماز چھوڑ دیتے ہیں۔ اور جی کو سمجھا لیتے ہیں کہ وضو اور نماز میں بڑی مشکلیں پڑتی ہیں اس لئے قضا کر لیں گے مگر کوئی ان سے پوچھے کہ وہ مشکلیں قابل برداشت ہیں یا ناقابل برداشت ہیں۔ اگر قابل برداشت ہیں تو فرض کے لئے برداشت کرو اور ناقابل برداشت ہیں تو جو لوگ سفر میں نماز کے پابند ہیں وہ کیسے برداشت

کرتے ہیں ؟ واللہ اگر کسی خفیف سی دنیوی غرض کی تکمیل میں اس سے بدرجہا زائد اہتمام کرنا پڑے تو خوشی خوشی سب گوارا کریں مگر وہ تو دین ہی کے نام سے ذرح قبض ہوتی ہے ۔ بعض نماز تو پڑھتے ہیں لیکن اس کے شرائط و ارکان کی کچھ پروا نہیں کرتے ۔ کوئی تیمم ہی کر رہا ہے اور پانی اسٹیشن پر یا نل کے اندر موجود مگر طبیعت قبول نہیں کرتی کہ وہ پانی پاخانہ کا ہے گو اس میں پاخانہ ملا ہوا نہیں مگر منسوب پاخانہ کی طرف ہے ۔

غضب کی بات ہے کہ شریعت کے ہوتے ہوئے دینیات میں طبیعت کو ترجیح دی جاوے ۔ پھر تیمم بھی کپڑے پر جس پر غبار بھی ندارد جو اجازت تیمم کی صورت میں بھی جائز نہیں ۔ اور تختہ پر گرد موجود ہے مگر اس کو یہ کہہ کر اڑا دیا کہ اس کا کیا اعتبار ۔ کاش اگر مسائل شرعیہ کی تحقیق کرتے تو یہ مسئلہ بھی ان کو معلوم ہوتا کہ ایسی صورت میں ان کے اس وہم ہی کا کچھ اعتبار نہیں ۔ اصل اشیاء میں طہارت ہے جب تک تختہ کا نجس ہونا یقینی نہ ہو اس وقت تک طاہر ہی ہے ۔

بعضے استقبال قبلہ ہی کی ضرورت نہیں سمجھتے محض اس لئے کہ رخ سیدھا کرنے میں قدرے تکلیف کرنا پڑتا ہے ۔ سو اگر دیکھا جاتا کہ یہ لوگ دنیا کے کسی کام کے لئے خفیف مشقت بھی گوارا نہیں کرتے تو ان کے اس عذر کو سنا جاتا ۔ گو سننے کے بعد اس کا غلط ہونا سمجھا دیا جاتا کہ دینی احکام کو دنیاوی مصالح پر قیاس نہیں کر سکتے کہ یہ تمہارے اختیاری امور ہیں اور وہ بوجہ ایجاب الٰہی کے غیر اختیاری تو ایک کا قیاس دوسرے پر چہ معنی ؟ لیکن جب دنیوی مقاصد کے لئے بڑی بڑی مصیبتیں جھیلی جاتی ہیں اس حالت میں تو نماز کے باب میں ان کا یہ عذر قابل سماعت بھی نہیں تا بقبول چہ رسد

بعضے آدمی کھڑے ہو کر نہیں پڑھتے باوجودیکہ کھڑے ہو سکتے ہیں ۔ سو ان کی نماز بھی نہیں ہوتی ۔ البتہ اگر قیام پر قدرت نہ ہو یعنی کسی سہارے سے بھی کھڑے نہ ہو سکیں ۔ تب البتہ بیٹھ کر پڑھنا درست ہے اس مسئلہ میں لوگ بحالت مرض بھی سخت غلطی کرتے ہیں یعنی ذرا مشقت ہو گئی اور بیٹھ کر نماز پڑھنے لگے در مختار و رد المحتار میں تصریح ہے کہ اگر کسی سہارے سے کھڑا ہو سکے تب بھی کھڑا ہونا فرض ہے ۔ اسی طرح اگر آدھی قرأۃ میں کھڑا ہو سکتا ہے یا بقدر تکبیر تحریمہ کھڑا ہو سکتا ہے تو اتنا ہی کھڑا ہونا فرض ہے ۔

بعضے آدمی باوجودیکہ جماعت کر سکتے ہیں مگر پھر تنہا تنہا پڑھ لیتے ہیں بعضے آدمی سمجھتے ہیں کہ جماعت کے لئے اتحاد مکان شرط ہے اور ہر درجہ جدا مکان ہے ایک درجہ میں اتنی جگہ نہیں اس لئے جماعت

نہیں کرتے۔ سو ہمارے نزدیک تو دوسری گاڑی تو بیشک دوسرا مکان ہے لیکن ایک گاڑی کے متعدد درجے سب ایک ہی مکان ہیں۔ ان میں جماعت ہوسکتی ہے اور اگر کسی صاحب علم کی یہی تحقیق ہو یا کسی عالم کی اس تحقیق میں کوئی تقلید کرتا ہو کہ ہر درجہ جدا مکان ہے خیر لیں کریں کہ ایک ایک درجے میں دو دو آدمی جماعت کرلیں اگر اصوات کا تزاحم نہ ہو تو ایک ہی وقت میں ورنہ آگے پیچھے اور چونکہ یہ مسجد محلہ نہیں اس لئے اس میں تکرار جماعت کا اختلاف بھی نہ ہوگا۔

حد سے زیادہ تشدد بھی نہیں کرنا چاہیئے

بعضے آدمی ان بے احتیاطیوں کے مقابلہ میں اس قدر محتاط بنتے ہیں کہ ان کی احتیاط درجۂ تشدد تک پہنچ جاتی ہے مثلاً ریل کے اندر ہرگز نماز نہ پڑھیں گے۔ اسٹیشن ہی پر اترنا فرض سمجھیں گے جس میں بعض اوقات طرح طرح کی پریشانیوں کا سامنا ہوتا ہے مثلاً اسباب ریل ہی میں رکھا ہے اور کچھ جاتا رہا یا کم از کم طبیعت ادھر مشغول رہی یا دوسرے مسافروں نے ان کی جگہ پر قبضہ کرلیا یا نہیں کیا لیکن ان کو اس احتمال پر پریشانی رہی اور مثلاً گاڑی نے سیٹی دیدی اور ان کو نیت توڑنا پڑی یا ایسا نہیں کیا لیکن مضطرب ہو گئے اور بعض اوقات گاڑی چھوٹ گئی۔ اور ان کے اسباب کا نقصان یا سفر کا حرج ہوا اس وقت خود نماز سے قلب میں خدانخواستہ تنگی پیدا ہوگئی یا خود ان کو تنگی نہیں ہوئی لیکن جو لوگ ہمیشہ دین کو مخل دنیا کہا کرتے ہیں اور اس وجہ سے ان کو دین سے توحش ہے ان کا تنفر اور توحش اور بڑھ گیا۔ اور ان کی فہرست میں ایک عدد اور بڑھ گیا کہ دیکھئے دین پر عمل کرنے سے یہ پریشانی اور مضرت ہوتی ہے اور اس جاہل کو کون سمجھائے کہ اس کی پریشانی کا سبب خود اس کا تشدد ہے نہ کہ دین سو حدیث "یسروا ولا تعسروا وبشروا ولا تنفروا" ترجمہ (تم دونوں کو چاہیئے کہ آسان طریقہ اختیار کرو اور لوگوں کو تنگی میں نہ ڈالو اور لوگوں کو بشارت سناؤ ان کو نفرت نہ دلاؤ) ظاہراً قول اور فعل دونوں کو عام ہے۔

اور اس پر بعض اوقات ایک طرہ اور ہوتا ہے کہ اسٹیشن پر اتر کر جماعت کرانے کے لئے امام صاحب ایسے تجویز ہوتے ہیں کہ وہ فرصت کا وقت پاکر قرأت میں تطویل اور رکوع اور سجود میں اطمینان سے تعدیل شروع کر دیتے ہیں اگر گاڑی نہ بھی نکلے تب بھی مقتدیوں کو خصوص اس لئے کہ مجمع میں مختلف طبائع کے لوگ ہوتے ہیں کیسی بیتابی ہوتی ہے۔ گویا ان بزرگ کو عمر بھر میں آج ہی موقع امامت

کا ملاہے۔ نہ تو اس سے پہلے کبھی میسر ہوا اور نہ آئندہ کو امید ہے اس لئے اس وقت کو غنیمت سمجھا اور عمر بھر کا ارمان آج ہی نکالنا ضروری ہو گیا۔

دو جاہل صوفیوں کی حکایت

اسی طرح دو بزرگواروں کی حکایت ہے کہ بہلی میں اپنے رفقاء کے ساتھ سوار تھے ایک صاحب نے تو یہ کیا کہ نماز ظہر کے لئے اترے اور پڑھکر مصلے ہی پر وظیفہ شروع کر دیا کہ میں تو عصر پڑھ کر اٹھوں گا۔ بے چارے رفیق مصیبت میں آگئے کہ منزل دور اور عصر تک کا حبس۔ اور ایک صاحب مغرب کے وقت اترے اور نماز کے بعد صلوٰۃ الاوابین شروع کر دی اور تاریکی بڑھنا شروع ہوئی۔ اور منزل کسی قدر فاصلے پر اور مقام خطرناک سو شریعت ایسے تشددات کو پسند نہیں کرتی۔ جس سے خود کو یا اس سے بڑھ کر دوسروں کو کلفت وضیق ہو۔ یہاں راز معلوم ہوا ہو گا اس ارشاد کا۔ ان اللہ یحب ان یوتی رخصہ کما یحب ان یوتی عزائمہ " یعنی رخصت پر عمل کرنے میں بہت سی مصلحتیں ہیں کہ وہ سبب ہو جاتا ہے دین کے ساتھ انس اور بشاشت اور انشراح اور انبساط اور دلچسپی کا اور یہ مقصد عظیم ہے۔ مقاصد نوامیس الیہ سے یہ کوتاہیاں قطع مسافت کے متعلق تھیں۔

عارضی قیام کے متعلق کوتاہیاں

بعض کوتاہیاں عارضی قیام کے متعلق ہیں، یعنی کسی مقام پر ایک دو شب مثلاً قیام کیا خواہ سرائے میں یا کسی خاص میزبان کے پاس اگر سرائے میں قیام کیا ہے تو وہاں بھی ان امور کا لحاظ ضروری ہے کہ دوسرے مسافروں کو اس سے کلفت نہ ہو اور سرائے کے ٹھیکہ دار کو بھی تکلیف نہ دی جاوے مثلاً بعضے لوگ بلا ضرورت شور و غل مچاتے ہیں بلا ضرورت جاگتے ہیں اور رفقہ کے ساتھ قصہ کہانیاں ہانکتے ہیں۔ بعضے آدمی گاتے بجاتے ہیں جس سے دوسرے مسافروں کے آرام و نوم میں خلل پڑتا ہے۔ بعضے ایسا کرتے ہیں کہ دوسرے مسافر کے کمرہ میں سے جبکہ وہ کہیں چلا گیا ہو چارپائی اٹھا لاتے ہیں وہ غریب آکر پریشان ہوتا ہے اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ بھٹیارہ سے مانگ لیں اور اگر نہ ملے مجبوری ہے۔ ان کو کیا حق ہے کہ دوسرے کی سابق قبضہ کی ہوئی لے لیں کہ شریعت کے بھی خلاف ہے اور مروت سے بھی بعید ہے اگر یہی معاملہ ان کے ساتھ ہو تو کیسی دل پر گذرے تو انصاف کا مقتضا یہ ہے کہ "آنچہ بخود نہ پسندی بر دیگراں مپسند " اور مثلاً بعضے لوگ باوجودیکہ پیشاب پاخانہ کے لئے خاص مواقع ہیں مگر کوٹھری ہی میں موت لیتے ہیں۔ یا کہیں گذرگاہ مسافران پر ایسا کرتے

ہیں جس سے بعض اوقات ٹھیکہ دار کو صاف کرانا پڑتا ہے اور بعض اوقات دوسرے مسافر کو تکلیف ہوتی ہے مثلاً بعض لوگ چلتے وقت ٹھیکہ دار کا حساب صاف کر کے نہیں جاتے یا تو چپکے نکل گئے یا نزاع واختلاف کر کے گئے۔ اس میں علاوہ گناہ کے جس میں حق اللہ وحق العبد دونوں ضائع کئے جاتے ہیں - ایک خرابی یہ ہوتی ہے کہ دوسرے مسافروں کا بھی اعتبار جاتا ہے اور ان کے لئے ضوابط سخت تجویز کئے جاتے ہیں اور اس کے سبب یہ شخص بنتا ہے - ایسے ہی لوگوں کی نسبت حدیث میں " مفتاح الشر و مغلاق الخیر " آیا ہے۔

اگر کسی کے پاس جانا ہو تو اسے پہلے سے اطلاع دینی چاہیئے

اور اگر کسی میزبان کے پاس ٹھہرے ہیں۔ تو اس میں بعضے یہ کوتاہی کرتے ہیں کہ بدون اس کے کہ اس کو اپنی آمدنی کی اطلاع دیں اس کے پاس بدون کھانا کھائے بے وقت جا پہنچتے ہیں کہ اس وقت اس کو کھانا تیار کرانے میں کلفت ہوتی ہے - اگر حساب سے پہنچنے کا وقت ناوقت ہو تو چاہیئے کہ کھانے کا انتظام پہنچنے کے وقت بطور خود کر لیں - اور فارغ ہو کر وہاں جاویں اور جاتے ہی اطلاع کر دیں۔

بعضے یہ کوتاہی کرتے ہیں کہ اول اس کو اپنی آمد کے وقت سے اطلاع تو دیدی ہے مگر اس وقت پہنچے نہیں وہ بے چارہ اسٹیشن پر آیا سواری کا کرایہ دیا وقت صرف کیا کھانا پکوایا اور یہ نواب صاحب ذرا رائے بدلنے سے یا کسی دوسرے میزبان کے اصرار کرنے سے پھسک گئے۔ بعض اوقات وہ کئی کئی وقت اسی طرح تکلیف اٹھاتا ہے اور ان کو یہ توفیق بھی نہیں ہوتی کہ وقت موعود آنے کے قبل اس کو مکرر اس ارادہ کے فسخ یا تبدیل کی اطلاع کر دیں۔

خوب یاد رکھو کہ یہ سب اسلام کے خلاف ہے گو لوگ اس کو سرسری سمجھتے ہیں - حدیث میں نص ہے " المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ " ترجمہ: مسلمان وہ ہے کہ جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں)

پھر جب اس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرا سالم نہ رہا تو مسلم بدرجۂ مقصودہ فی الحدیث کہاں رہ گیا - مشکل یہ ہے کہ آج کل بزرگی تسبیح پڑھنے کا نام رہ گیا کسی کی راحت و کلفت کی پرواہ ہی نہیں - یہی وجہ ہے کہ اس خاص کوتاہی میں بہت سے ثقات و منسوبین الی العلم والدین بھی مبتلا ہیں - اور اس

کا قبح ذرا ان کے قلب میں نہیں۔

بعضے ایسا کرتے ہیں کہ کھانا کھا کر پہنچے مگر جاتے ہی اس کو یہ اطلاع نہیں کی کہ میں کھانا کھا چکا ہوں اس وقت اہتمام نہ کیا جاوے۔ وہ بے چارہ نہ تو علم غیب پڑھا ہوا ہے اور نہ لحاظ سے یہ پوچھ سکتا ہے کہ آپ کھانا تو نہیں کھا چکے۔ غرض اس نے احتمال پر کھانا تیار کیا جب ان کے سامنے کھانا آیا۔ تو آپ نے نہایت بیرحمی سے ایک جملہ میں اس کے تمام انتظام کا خون کر دیا کہ میں تو کھا چکا تھا۔ بندۂ خدا پہلے کس نے منہ بند کر لیا تھا۔ کہہ دینا تھا۔

بعضے ایسا کرتے ہیں کہ کھانا کھانے بیٹھے اس وقت فرماتے ہیں کہ میں تو گوشت نہیں کھاتا میں تو مرچیں نہیں کھاتا۔ ظالم اگر پہلے ہی اس کو اطلاع دے دی جاتی تو کیا مشکل تھا۔ اب وہ مظلوم فکر میں پڑ گیا۔ کہیں پڑوس سے بھیک مانگتا پھرتا ہے۔ کہیں گھر میں گھی شکر تلاش کرتا ہے۔ غرض "زر دادن و درد سر خریدن کا مصداق بن گیا"

بعضے ایسا کرتے ہیں کہ بے اطلاع میزبان کے کہیں چلدیئے۔ اب وہ تلاش کرتا پھرتا ہے اور گھر بھر بھوکا بیٹھا ہے یا تو وقت گذر کر آئے۔ تب سب کا روزہ کھولا، یا آکر کہدیا کہ مجھ کو فلاں شخص نے اصرار کر کے کھلا دیا تھا۔ میں نے انکار بھی کیا مگر اس نے مانا ہی نہیں۔ اس بیڈھنگے کو یہ خبر نہیں کہ کسی کی ایسی دلجوئی کب جائز ہے کہ دوسرے کی دل شکنی ہو۔ اور وہ بھی ایسے شخص کی جس کا حق مقدم اور سابق ہو۔

بعض آدمی ایسا کرتے ہیں کہ دوسرے کی دعوت قبول کر لی اور میزبان سے اجازت لینا تو کجا اس کو اطلاع بھی نہیں کی۔ بعض ایسا کرتے ہیں کہ رخصت ہونے کا قصد دل میں کر لیا۔ مگر میزبان کو نہیں بتلایا۔ اب عین وقت پر آرڈر سنا دیا کہ میں اس گاڑی میں جاؤں گا۔ سواری کا انتظام کر دو۔ اس کا سامان ضیافت بھی ضائع گیا اور بعض اوقات خصوص قصبات عین وقت پر سواری کے انتظام میں دشواری ہوتی ہے۔ غرض یہ سب پریشان کرنے کی باتیں ہیں۔ جن سے احتیاط و احتراز واجب ہے۔

مسافر کی گھر کے متعلق کوتاہیاں اب بعض کوتاہیاں اپنے گھر والوں کے متعلق رہ گئیں۔ ان کے ذکر پر مضمون کو ختم کرتا ہوں مثلاً سفر میں جا کر گھر والوں کو ایسے

بھولے کہ ان کو اپنی خیریت تک کی اطلاع نہیں دی۔ ان سے اپنا اطمینان کرلیا کہ سب کو بعافیت چھوڑ کر آیا تھا۔ اب بھی بعافیت ہوں گے۔ مگر وہ تو پریشان ہیں کہ سفر میں ہزاروں حوادث محتمل ہوتے ہیں۔ ان کو بھی مطمئن کرنا چاہیئے تھا۔ اور مثلاً ان کو اپنی واپسی کے وقت کی اطلاع دی۔ مگر اس وقت نہیں پہنچے وہ بے چارے اس اجنبی میزبان سے بھی زیادہ پریشان ہوتے ہیں۔ اس کو صرف اپنی تکلیف سے پریشانی ہوئی اور گھر والوں کو تو تعلق محبت کے سبب یہ بھی پریشانی ہوتی ہے کہ خدا جانے خیریت بھی ہوگی اور مثلاً باوجود اطلاع کرسکنے کے بلا کسی مصلحت کے دفعتہً گھر آجانا احادیث میں اس کی بھی ممانعت ہے جس کی حکمتوں میں سے ایک حکمت یہ بھی ہے کہ شریف عورتیں شوہر کے گھر پر نہ ہونے کی وجہ سے زیب وزینت چھوڑ دیتی ہیں۔ سو ایسا نہ ہو کہ اس مبتذل حالت میں دیکھ کر اس کو نفرت ہو جاوے جو بنیاد ہو جاوے مصالح خانہ داری کے انہدام کی اگر پہلے سے اطلاع ہو تو وہ آراستہ و پیراستہ تو ہو جاوے۔

ممکن ہے کہ سفر کی کوتاہیاں کی فہرست اور بھی طویل ہوسکے مگر فی البدیہہ جو خیال میں آئیں۔ وہ لکھدیں فہیم آدمی ان ہی کے اصول سے دوسری کوتاہیوں کی بھی اصلاح کرسکتا ہے فقط

واللہ الموفق لسبیل لا وکس فیہ ولا شطط

تعلیم نسواں کے متعلق کوتاہیاں

اصلاح معاملہ بہ تعلیم نسواں

ہر چند کہ بعد ورود حدیث " طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم و مسلمۃ " ترجمہ (علم طلب کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے) وغیر ذالک من النصوص الموجبۃ لتحصیل العلم علی الرجال والنساء " اس مبحث پر مستقل کلام کرنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ خصوص جبکہ اس کے بہت قبل اس میں مجملاً اس سے تعارض بھی ہو چکا ہے لیکن بعض واقعات و خصوصیات کے (کہ زیادہ ان میں ہندوستانی مستورات کے حالات ہیں جن کا مشاہدہ اکثر ہوتا رہتا ہے) اس باب میں مستقل اور کسی قدر مفصل گفتگو کئے جانے کو مقتضی ہونے کے سبب اس کا بقدر ضرورت مکرر ذکر کیا جاتا ہے

تعلیم نسواں کے متعلق لوگوں کی تین قسمیں

سو جاننا چاہیئے کہ اس مقدمہ میں جہاں تک تتبع کیا گیا۔ تین خیال کے لوگ ہیں۔ ایک وہ کہ تعلیم نسواں کے نہ مخالف ہیں۔ نہ حامی مگر تعلیم کا اہتمام نہیں۔

دوسرے وہ کہ اس کے مخالف ہیں۔

تیسرے وہ کہ اس کے حامی ہیں اور ان سب سے مختلف کوتاہیاں واقع ہوتی ہیں۔

پہلی قسم کے لوگوں کی غلطی اور ان کے شبہات کا جواب

چنانچہ اوّل طبقہ کی کوتاہی جو سب کوتاہیوں سے اشد و اعظم ہے یہ ہے کہ سرے سے مستورات کو تعلیم دینے ہی کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ نہ مردوں کے نزدیک اور نہ خود ان مستورات کے نزدیک اور دلیل ان لوگوں کی جو ان کے اشتباہ کا منشاء ہوگیا ہے یہ ہے کہ کیا عورتوں کو کوئی نوکری کرنا رہ گیا ہے جو ان کے پڑھانے کا اہتمام کیا جاوے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے نہ تعلیم کی غرض سمجھی اور نہ ان نصوص و روایات میں غور کیا۔ جو مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے ایک درجہ میں تحصیل علم کو فرض و واجب قرار دے رہے ہیں اور نہ اس تعلیم کو سمجھا جو کہ فرض ہے۔

علوم سے غرض نوکری نہیں ہے

سو سمجھ لینا چاہیئے کہ علوم سے غرض نوکری نہیں ہے کیونکہ جو علم علی العین واجب التحصیل ہے وہ علم معاش نہیں ہے بلکہ وہ علم دین ہے جس سے انسان کے عقائد و اعمال و معاملات و معاشرت و اخلاق درست ہوں۔ جس کا ثمرہ دنیا میں اولٰئک علیٰ ھدی من ربھم، ترجمہ (یہ لوگ ہدایت پر ہیں اپنے رب کی طرف سے) کی دولت اور آخرت میں۔ اولٰئک ھم المفلحون (یہی لوگ ہی کامیاب ہیں) کی بشارت ہے۔ سو اس کا وجوب ظاہر ہے۔ سمعاً بھی عقلاً بھی۔

دلائل سمعیہ یہ ہیں۔

(۱) طلب العلم واجب علی کل مسلم (ھب عن انس)

(۲) طلب العلم فریضۃٌ علیٰ کل مسلم (الدیلمی عن علی)

(۳) طلب الفقہ حتم واجب علیٰ کل مسلم (ک فی تاریخہ عن انس)

(۴) تعلموا العلم وعلموہ الناس (قط عن ابی سعید وھب عن ابی بکر)

(۵) تعلموا العلم قبل ان یرفع (الدیلمی عن ابن مسعود وعن ابی ھریرۃ)

(۶) یاایھا الناس علیکم بالعلم قبل ان یقبض (طب والخطیب عن ابی امامۃ)

(۷) یاایھا الناس خذوا من العلم قبل ان یقبض العلم (حم والدارمی طب وابو الشیخ

فی تفسیرہ وابن مردویہ عن ابی امامۃ)

(۸) ویل لمن لا یعلم رحل عن حذیفۃ) کذا فی کنز العمال وغیر ذلک من النصوص العامۃ للرجل والمرأۃ۔

دلیل عقلی اور دلیل عقلی یہ ہے کہ اصلاح عقائد واعمال کی فرض ہے اور وہ موقوف ہے۔ ان کی تحصیل پر، چنانچہ ظاہر ہے۔ اور فرض کا موقوف علیہ فرض ہے۔ پس تحصیل علم فرض ہوا۔ اور ہر چند کہ موقوف ہونا عمل کا علم پر بالکل بدیہی ہے۔ مگر اس سے ترقی کرکے کہا جاتا ہے کہ حسی بھی ہے۔ چنانچہ بے علم عورتیں جس حالت میں ہیں سب دیکھتے ہیں کہ نہ ان کو شرک کفر کی کچھ تمیز ہے؟ نہ ایمان اور اسلام کی کچھ محبت ہے۔ جو چاہیں خدا تعالیٰ کی شان میں بک دیتی ہیں۔ جو چاہیں احکام شرعیہ کے مقابلہ میں زبان درازی کر بیٹھتی ہیں۔ اولاد کے لئے یا شوہر کو مسخر کرنے کے لئے ٹونے ٹوٹکے، جادو منتر، جو کچھ کوئی بتلا دیتا ہے بلا امتیاز مشروع نامشروع کے سب ہی کچھ کر گذرتی ہیں۔

جب عقائد ہی میں یہ حالت ہے تو نماز روزہ کا کیا ذکر ہے۔ حتیٰ کے بعض کی نوبت ترک سے گذر کر استخفاف بلکہ تشائم وتطیر (بدفالی) تک پہونچ جاتی ہے یعنی بعض تو باوجود فرض سمجھنے کے اس کو ترک ہی کر دیتی ہیں۔ اور بعض اس کی وقعت بھی نہیں کرتیں۔ کوئی ضروری امر نہیں سمجھتیں اور بعض اس کو منحوس وموجب مضرت اعتقاد کرتی ہیں۔ اور یہ دو درجہ کفر صریح ہیں۔ اور اوّل فسق وکبیرہ ہے۔

جب نماز روزہ میں یہ کیفیت ہے جس میں ایک پیسہ بھی خرچ نہیں ہوتا تو زکوٰۃ وحج، جس میں پیسہ کا بھی خرچ ہے اس کو تو پوچھو ہی مت .....! اور جب عقاید واعمال دیانت کا یہ حال ہے۔ تو معاملات کا درستی کا تو احتمال ہی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ نماز روزہ کی صورت تو دین کی ہے۔ اور معاملات تو عوام کی نظر میں بالکل دنیا ہی کی شکل رکھتے ہیں۔ اس لئے ان کی درستی کا اہتمام تو خاص لوگ کرتے ہیں۔ جاہل مستورات کیا درستی کریں گی۔

پھر جب معاملات کے ساتھ یہ طرز عمل ہے تو معاشرت کی اصلاح تک تو کہاں ذہن جائے گا کیوں کہ معاملات کو حقوق العباد تو سمجھا جاتا ہے۔ بخلاف معاشرت کے کہ اس میں یہ پہلو بھی ظاہر نہیں ہے اس لئے اس کا بالکل ہی اہتمام کم ہے۔ پھر جب معاملات ومعاشرت سے اتنی بے پروائی

ہے تو اخلاق باطنی مثل تواضع و اخلاص و خوف و محبت و صبر و شکر و نحو ذلک، کی طرف تو کیا توجہ ہوگی۔ کیوں کہ معاملات کا زیادہ اور معاشرت کا اس سے کم دوسروں تک تو اثر پہنچنا معلوم ہے۔ نیز ان پر بعض اوقات نیک نامی و بدنامی کا ترتب بھی ہو جاتا ہے۔ بخلاف اخلاق باطنی کے کہ اس کا غالب اثر بھی اپنی ہی ذات تک محدود ہے۔ اور بوجہ خفا کے دوسروں کو ان کا علم بھی کم ہوتا ہے جس سے نیک نام یا بدنام کر سکیں۔ اس لئے اس کا اہتمام تو بالکل ہی ندارد ہے حتیٰ کہ بہت سے خواص میں بھی تا بہ عوام چہ رسد (

بہرحال ان سب امور دینیہ میں قلت مبالات کا اصل منشار و سبب قلت علم دین ہے۔ پھر جہاں بالکل ہی علم نہ ہو (اور اس سے بڑھ کر یہ فطرۃً عقل بھی کم ہو۔ کیوں کہ طبقہ اناث قدرتی طور پر ناقص العقل ہیں۔ غرض جہاں نہ عقل ہو نہ علم ہو) تو وہاں امور مذکورہ میں کوتاہی کی کیا حد ہوگی؟
غرض عقل اور مشاہدہ دونوں شاہد کہ بدون علم کے عمل کی تصحیح ممکن نہیں اور عمل کی تصحیح واجب اور فرض .... پس تحصیل علم دین کا فرض ہونا جیسا اوپر دعویٰ کیا گیا ہے۔ عقلاً بھی ثابت ہو گیا اور سمعاً فرض ہونا اس سے اوپر بیان کیا گیا ہے تو دونوں طرح تحصیل علم دین فرض ہوا۔

پس ان لوگوں کا یہ خیال کہ جب عورتوں کو نوکری کرنا نہیں ہے۔ تو ان کی تعلیم کیا ضرور ہے؟۔ محض غلط ٹھہرا۔ یہ جواب ہوا۔ ان کی مذکورہ کوتاہی کا۔

تعلیم نسواں کی فرضیت پر ایک شبہ اور اس کا جواب

البتہ اس پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ علم دین کی فرضیت سے تعلیم بطرق متعارف کا واجب ہونا لازم نہیں آتا کہ مستورات کو کتابیں بھی پڑھائی جائیں۔ بلکہ یہ فرض اہل علم سے پوچھ پاچھ رکھنے سے ادا ہو سکتا ہے۔

سو اس کی تحقیق یہ ہے کہ واقعی یہ بات صحیح اور ہم تعلیم متعارف کو فی نفسہٖ واجب بھی نہیں کہتے۔ لیکن یہاں تین مقدمے قابل غور ہیں۔

اوّل یہ کہ مقدمہ واجب کا واجب ہوتا ہے گو بالغیر سہی۔ جیسے جو شخص پیادہ سفر حج قطع کرنے پر قادر نہ ہو۔ اور اس شخص کے زمانہ میں ریل اور آگبوٹ (اسٹیمر) ہی ذریعہ قطع سفر کا متعین ہو۔ اور اس کے پاس اس قدر وسعت و استطاعت بھی ہو۔ تو اس شخص پر واجب ہوگا کہ سفر کا عزم کرے

اور ریل اور آگبوٹ کا ٹکٹ خرید کر اس میں سوار ہو۔ سو ریل اور آگبوٹ کا ٹکٹ خریدنا اور اس پر سوار ہونا فی نفسہٖ شرعاً فرض نہیں۔ لیکن چونکہ ایک فرض کا ذریعہ ہے اس لئے یہ بھی فرض ہوگا۔ مگر بالغیر پس یہ مقدمہ تو ثابت ہو چکا۔

دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ تجربہ سے معلوم ہوگیا ہے کہ علم کا اذہان میں قابل اطمینان درجہ میں محفوظ رہنا موقوف ہے۔ کتب کے پڑھنے پر جو کہ تعلیم کا متعارف طریق ہے اور محفوظ رکھنا علم دین کا واجب ہے۔ پس بناء بر مقدمہ اولیٰ بطریق متعارف تعلیم کا جاری رکھنا بھی واجب ہے۔ البتہ یہ واجب علی الکفایہ ہے۔ یعنی ہر مقام پر اتنے آدمی دینیات پڑھے ہوئے ہونے چاہئیں کہ اہل حاجت کے سوالوں کا جواب دے سکیں۔

تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ یہ بھی تجربے سے ثابت ہوا ہے کہ مردوں میں علماء کا پایا جانا مستورات کی ضروریات دینیہ کے لئے کافی وافی نہیں۔ دو وجہ سے اولاً پردہ کے سبب (کہ وہ بھی اہم الواجبات ہے) سب عورتوں کا علماء کے پاس جانا قریباً ناممکن ہے اور گھر کے مردوں کو اگر واسطہ بنایا جاوے تو بعض مستورات کو تو گھر کے ایسے مرد بھی میسر نہیں ہوتے اور بعض جگہ خود مردوں ہی کو اپنے دین کا بھی اہتمام نہیں ہوتا تو وہ دوسروں کے لئے سوال کرنے کا کیا اہتمام کریں گے۔

پس ایسی عورتوں کو دین کی تحقیق از بس دشوار ہے اور اگر اتفاق سے کسی کی رسائی بھی ہوگئی یا کسی کے گھر میں باپ بیٹا، بھائی وغیرہ عالم ہیں تب بھی بعض مسائل عورتیں ان مردوں سے نہیں پوچھ سکتیں۔ ایسی بے تکلفی شوہر سے ہوتی ہے تو سب شوہروں کا ایسا ہونا خود عادتاً ناممکن ہے۔ تو ان کی عام احتیاج رفع ہونے کی بجز اس کے کوئی صورت نہیں کہ کچھ عورتیں پڑھی ہوئی ہوں۔ اور عام مستورات ان سے اپنے دین کی ہر قسم کی تحقیقات کیا کریں پس کچھ عورتوں کو بطریق متعارف تعلیم دین دینا واجب ہوا۔

پس اس شبہ کا بھی جواب ہوگیا اور ثابت ہوگیا کہ لکھے پڑھے مردوں کی طرح عورتوں میں ایسی تعلیم ہونا ضروری ہے اور اس غلط خیال عدم ضرورۃ تعلیم نسواں کا بالکلیہ استیصال ہوگیا۔

دوسرے طبقہ والوں کے شبہات اور ان کا جواب

اب دوسرے طبقہ کے متعلق کچھ لکھا جاتا ہے جو تعلیم نسواں کے مخالف

ہیں اور اس کو سخت ضرر رساں سمجھتے ہیں۔ دعویٰ ان کا یہ ہے کہ ہم نے لکھی پڑھی عورتوں کو اکثر آزاد اور بے باک اور قلیل الحیا اور مکار اور عفت سوز دیکھا ہے۔ خاص کر اگر لکھنا بھی جانتی ہوں تو اور بھی شوخ چشم ہو جاتی ہیں جس کو چاہا خط لکھ بھیجا۔ جس کو چاہا پیام و سلام پہنچا دیا۔ اسی طرح دوسروں کو بھی طمع ہوتی ہے کہ اپنے نفسانی جذبات کو ان تک بذریعہ تحریر پہنچا دیتے ہیں۔ اور ان کے پاس پہنچتی ہیں کبھی تو وہ بھی متاثر ہو کر نرم جواب دیتی ہیں اور سلسلہ بڑھتا ہے یہاں تک کہ جو کچھ واقع ہونا ہے. واقع ہوتا ہے۔ اور کبھی جواب نہیں دیتیں اور سکوت کرتی ہیں تو مریض القلب لوگ اس سے بھی استدلال کرتے ہیں۔ ان کے نیم راضی ہونے پر۔ پھر وہ لوگ آئندہ کے پیام و سلام و تحریر سے اس کمی کو پورا کرنا چاہتے ہیں۔ چونکہ گوش زدہ اثرے دارد، قاعدہ اکثریہ ہے پھر بعض کا طرز بیان جادو نشان ہوتا ہے پھر نسوانی طبائع معمولی طور پر نرم بھی ہوتی ہیں تو شیطان کا جال پھیل جانا زیادہ عجیب نہیں ہوتا اور اگر کسی مکتوب الیہا نے ناراضی بھی ظاہر کی اور اس ناراضی کا جواب کاتب تک بھی پہنچا دیا ہے مگر اپنے شوہر یا خاندان کے خوف سے کہ خدا جانے کیا گمان کریں گے۔ اور کیا معاملہ کریں گے اپنے گھر والوں سے اس کا اخفاء کرتی ہیں اور اسطور پر وہ کاتبین ہر طرح کی مضرت سے محفوظ رہتے ہیں اس لئے ان کی جسارت بڑھتی ہے۔ اور پھر دوسرے موقع پر اس کی سلسلہ جنبانی کرتے ہیں۔

اور ان سب واقعات کا مبنیٰ ان مستورات کا تعلیم یافتہ ہونا ہے اگر وہ ناخواندہ ہوں تو ان کے پاس مضمون بھیجنے سے اندیشہ ہوگا۔ دوسرے کہ مطلع ہونے کا یہ سبب ہو جاوے گا اس باب کے مسدود ہو جانے کا۔

اور یہ مفسدہ اس صورت میں زیادہ متحمل ہے جبکہ کسی عورت کے مضامین اخباروں میں بھی چھپنے لگیں اور ان مضامین کو دیکھ کر سخن شناس شیاطین انداز کرتے ہیں۔ کاتبہ کے رنگ طبیعت اور جذبات اور خیالات کا تو اس شرارت کے شرارے وہاں زیادہ پھیلتے ہیں بالخصوص اگر وہ کلام نظم بھی ہو تو اور بھی آفت اور اس زمانے میں تو ایک اور غضب ہے کہ افتخار کے لئے صاحب مضامین کا نام اور پتہ تک صاف لکھ دیا جاتا ہے کہ فلانے کی بیوی فلانے کی بیٹی، فلاں جگہ کی رہنے والی اور یہ تمام ترخرابیاں ان کے لکھے پڑھے ہونے سے پیدا ہوتی ہیں اور اگر ان خفیہ ریشہ دوانیوں کی کسی طور پر شوہر یا اہل خاندان کو اطلاع ہی ہو گئی تو چونکہ لکھا پڑھا آدمی ہوشیار اور سخن سازی پر زیادہ قادر ہوتا ہے وہ ایسی تاویلیں کرینگی

کہ کبھی ان پر حرف ہی نہ آوے گا اور الٹا منہ ناک بنا دیں گی۔ مکاری سے رو دیں گی کہ ہم کو یوں کہا کہیں
خودکشی اور کنویں میں ڈوبنے کی دھمکی دیں گی۔ حتیٰ کہ اس غریب بازپرس کرنے والی کو خوشامد کرنا پڑیگی
اور ڈر کے مارے پھر کبھی زبان تک نہ ہلاوے گا۔

ایک خرابی اس تعلیم یافتہ طبقہ اناث میں یہ ہوتی ہے کہ ہر طرح کی کتابیں منگاکر پڑھتی ہیں۔ عشق بازی کے
قصے سازش اور لگاوٹ کے ناول شوق انگیز غزلیں پھر ان سے طبیعت بگڑتی ہے۔ کبھی ایسی غزلیں ذرا
کھل کر پڑھتی ہیں کہ دروازہ میں یا پڑوس اور محلہ میں یا سڑک پر آواز جاتی ہے۔ اور آواز پر کوئی فریفتہ
ہو کر درپے ہو جاتا ہے۔ اور اگر وہ ناکام بھی رہا تاہم رسوائی اور پریشانی کا سبب تو بن ہی جاتا ہے۔

یہ خلاصہ ہے ان صاحبوں کے خیالات کا اور میں ان واقعات کی تکذیب نہیں کرتا لیکن یہ ضرور
کہوں گا کہ ان صاحبوں نے کوتاہ نظری سے کام لیا۔ واقعات کے حقائق میں غور نہیں کیا اصل یہ ہے کہ ان
سب خرابیوں کا ذمہ دار تعلیم نہیں ہے بلکہ طرز تعلیم ہے یا نصابِ تعلیم ہے یا طرز عمل ہے یا سوء تدبیر ہے
یعنی یا تو یہ ہوا کہ ایسی کتابیں نہیں پڑھائی گئیں جن سے احکام حرام و حلال اور تفصیل ثواب و عقاب اور طریقہ
تہذیب اخلاق معلوم ہو اور جس سے خوف و خشیت و معرفت و عظمت حق حاصل ہو ان کو صرف حرف
شناس بنا کر چھوڑ دیا ہے انہوں نے اپنی رائے سے اردو کے مختلف رسالوں کا مطالعہ کرکے لکھنے پڑھنے
کی مہارت بڑھائی ہے اور تعلیم یافتہ کا لقب پاکر اس طرح تعلیم کو بدنام کیا ہے۔

تو ظاہر ہے کہ محض حرف شناس کو نہ تعلیم کہہ سکتے ہیں اور نہ حرف شناسی اصلاح اعمال و احوال
کی کفالت کر سکتی ہے۔

اور یا یہ ہوا ہے کہ باوجود نصاب تعلیم کے مفید و کافی ہونے کے اس نصاب کے مضامین
کو قلب میں جمانے کی کوشش نہیں کی گئی اور عمل کی نگرانی نہیں کی گئی۔ مثلاً اس کی ضرورت ہے کہ جس
روز کسی لڑکی نے یہ مسئلہ پڑھا کہ غیبت گناہ ہے اس کے بعد اگر وہ غیبت کرے تو فوراً اس کو یاد دلاوے
کہ دیکھو تم نے کیا پڑھا تھا۔ اس کے خلاف کرتی ہو اور مثلاً ان کو پردہ کی ضرورت یا پست آواز بولنے
کی تاکید پڑھائی گئی اور پھر اس میں کوتاہی یا غفلت کا مشاہدہ ہوا۔ فوراً اس کو روکنا چاہیئے یا ان کو حرص مال
و زیور کی مذمت پڑھائی تھی۔ پھر انہوں نے کسی تکلف کے کپڑے یا غیر ضروری زیور کی ہوس کی تو فوراً ان
کو متنبہ کیا جاوے۔ اسی طرح امید ہے کہ اخلاق فاضلہ و اعمال صالحہ کا ملکہ ان میں پیدا ہو جاوے گا۔

اور یا یہ ہوا ہے کہ ان کی خود طبیعت اور طینت ہی میں صلاحیت اور قابلیت نہیں ہے تو اس صورت میں تربیت نااہل را چوں گردگان بر گنبد ست کا اور شعر ہے ؎

شمشیر نیک ز آہن بد چون کند کسے
ناکس بہ تربیت نشود اے حکیم کس

کا مضمون ہے۔

یہ گفتگو تو خود ان کے احوال و اعمال کے متعلق تھی اور جو افعال دوسرے شریر لوگوں کے شمار کرائے ہیں ان کا امتداد سو، تدبیر سے ہوتا ہے اس کے انسداد کی اچھی تدبیر یہ ہے کہ واسطے کے ساتھ نہایت سختی کی جاوے اور اپنے مردوں کو بالکل صاف اطلاع دیدی جاوے۔

غرض مفاسد کے اسباب یہ ہیں جب یہ ہے تو اس میں عورتوں کی کیا تخصیص ہے۔ یہی اسباب فساد اگر مردوں کو پیش آویں۔ وہ بھی ایسے ہی ہوں گے۔ پھر کیا وجہ کہ عورتوں کو تعلیم سے روکا جاوے۔ اور مردوں کو تعلیم میں ہر طرح کی آزادی دی جاوے بلکہ اہتمام کیا جاوے۔

اس فرق کی وجہ بعد تأمل بجز اس کے کچھ نہیں معلوم ہوئی کہ عورت سے صدور قبائح یا اس کی طرف نسبت قبائح عرفاً موجب ذلت اور رسوائی ہے اور وہی امور اگر مرد سے صادر ہوں، یا اس کی طرف منسوب ہوں تو وہ عرفاً موجب ذلت اور رسوائی نہیں ہے اس لئے عورت کے لئے ان مفاسد کے احتمال کو موانع تعلیم سے قرار دیا ہے۔ اور مردوں کے لئے نہیں۔ باقی شرعاً ظاہر ہے کہ اس باب میں مرد و عورت یکساں ہیں۔ اگر عورت کے لئے معصیت مذموم و قابل لوم ہے تو اسی درجہ میں مرد کے لئے بھی۔ اور اگر مرد کے لئے موجب طہارت و نزاہت ہے تو اسی درجہ میں عورت کے لئے بھی۔ پس جب شرعاً دونوں برابر ہیں اور عرفاً متفاوت۔ پس اس تفاوت سے عملاً متاثر ہونا یعنی ایک کے لئے ان احتمالات کا اعتبار کرنا دوسرے کے لئے نہ کرنا صاف عرف کو شرع پر ترجیح دینا ہے۔ جو بہت بڑا شعبہ ہے جاہلیت کا جس کا منشا کبر اور ترفع ہے۔ و بس اور یہ صرف میرا ہی دعویٰ نہیں بلکہ مدعا علیہم کا اقرار بھی ہے چنانچہ بکثرت ان لوگوں کی زبان سے سنا گیا ہے کہ میاں مرد کا کیا ہے۔ اس کی مثال تو برتن کی سی ہے کہ دس دفعہ سن گیا اور جب دھویا صاف ہو گیا اور عورت کی مثال موتی کی آب کی سی ہے کہ اگر ایک دفعہ اتر گئی تو پھر چڑھ نہیں سکتی۔ اس کے معنے دوسرے لفظوں میں صاف یہ بھی ہیں کہ مردوں کے لئے معصیت کو خفیف سمجھتے ہیں۔ اور عورتوں کے لئے شدید

تو علاوہ کبر کے اس میں تو فتویٰ استخفاف کے جاری ہونے کا بھی اندیشہ اور سخت اندیشہ ہے۔

تیسرے طبقہ والوں کی غلطیوں کی نشاندہی

اب صرف تیسرے طبقہ کے متعلق کلام باقی رہ گیا جو تعلیم کے حامی تو ہیں لیکن اس تعلیم کے تعین میں یا اس کے طریقہ کی تجویز میں ان سے غلطی ہوئی چنانچہ ان میں سے بعض کا بیان بضمن اصلاح خیال طبقہ ثانیہ کے اوپر ہو چکا ہے مثلاً ان کو صرف حرف شناس بنا کر چھوڑ دینا۔ پھر ان کا اپنی رائے سے مختلف رسالوں کا مطالعہ کرنا۔ اور مثلاً بعد تعلیم کے عمل کی نگرانی نہ کرنا جس کی متعدد مثالیں بھی ساتھ ساتھ مذکور ہوئی ہیں۔

عورتوں کو دنیوی علوم بغیر ضرورت کے نہیں پڑھانے چاہئیں

اور بعض کا بیان اب کیا جاتا ہے مثلاً بعض مستورات کو بجائے علوم دینیہ پڑھانے کے ان کو تاریخ و جغرافیہ یا اس سے بڑھ کر انگریزی پڑھاتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انجیل پڑھاتے ہیں جس کی وجہ صرف تقلید اہل یورپ کی ہے یعنی ان کے نصاب تعلیم میں شائستگی کو منحصر سمجھنا اس کی بنا ہے مگر یہ خیال نہیں کرتے کہ ہم میں اور ان میں اگر رسوم وعادات وطبائع وخواص کا بھی فرق نہ ہوتا، تاہم سب سے بڑا فرق مذہب ہی کا ہے کہ ہم مذہب اسلام کا التزام کئے ہوئے ہیں اور وہ یا تو کوئی مذہب نہیں رکھتے اور زیادہ ان میں ایسے ہی ہیں اور یا ہمارے مذہب کے مغائر دوسرا مذہب رکھتے ہیں۔

اس لئے ان کے یہاں یا تعلیم مذہبی بالکل نہ ہوگی صرف زبان کی تعلیم ہوگی یا دنیوی معلومات کی تعلیم ہوگی اور یا دوسرے مذہب کی تعلیم ہوگی۔

بہرحال ان لوگوں کی اس تعلیم کا تو ایک خاص مبنی ہے۔ لیکن ہم لوگ اگر ان کی تعلیم کو اختیار کریں تو اس کا کیا مبنی ہے جب غرض تعلیم سے ان کی اور ہے جس کا ابھی ذکر ہوا۔ اور ہماری غرض اور ہے جس کا مختصر بیان طبقہ اولیٰ کی اصلاح خیال کے ذکر میں ہوا ہے، یعنی اصلاح عقائد واعمال و معاملات ومعاشرت واخلاق اور یہ غرض منحصر ہے علم دین میں تو ظاہر ہے کہ ہم ان کی تعلیم کا اختیار کرنا ہر طرح بے ربط ہے البتہ اگر کسی کو تحصیل معاش کی بھی حاجت واقع ہونے والی ہو تو بعد علوم دینیہ کے اس کو ان علوم کا حاصل کر لینا بھی مضائقہ نہیں۔ جو اس زمانہ میں معاش کا موقوف علیہ ہو۔ جیسے اس وقت انگریزی و تاریخ جغرافیہ وغیرہ باقی انجیل کی اس شخص کو بھی ضرورت نہ ہوگی اور ظاہر ہے کہ

کسب معاش کی حاجت صرف مردوں کو ہوتی ہے اور عورتیں اول اس وجہ سے کہ ان کا نان و نفقہ مردوں کے ذمہ ہے۔ دوسرے اس وجہ سے کہ اسلام میں پردہ کی تاکید ہے اور وہ ابواب خاصہ معاش کے جو خاص علوم پر موقوف ہیں۔ پردہ کے ساتھ حاصل نہیں کئے جا سکتے اس لئے عورتوں کے لئے یہ تعلیم بالکل فضول اور ان کے وقت کی اضاعت ہوگی بلکہ فضول سے متجاوز ہو کر ہر طرح مضر ہوگی جیسا کہ عنقریب ان مضار کا بیان بھی آوے گا۔

بہر حال یہ علوم جن کا لقب تعلیم جدید ہے عورتوں کے لئے ہرگز زیبا نہیں۔ البتہ فنون دنیا میں سے بقدر ضرورت لکھنا اور حساب اور کسی قسم کی دستکاری کہ اگر کسی وقت کوئی سرپرست نہ رہے تو عفت کے ساتھ چار پیسے کما سکے یہ مناسب ہے۔ رہا قصہ شائستگی کا جس کا دل چاہے تجربہ کر کے دیکھ لے۔ کہ علم دین کی برابر دنیا بھر میں کوئی دستور العمل اور کوئی تعلیم شائستگی اور تہذیب نہیں سکھلاتا۔ چنانچہ ایک وہ شخص لیجئے جس پر علم دین نے پورا اثر کیا اور ایک وہ شخص لیجئے جس پر تہذیب جدید نے پورا اثر کیا ہے۔ پھر دونوں کے اخلاق اور معاشرت و معاملہ کا موازنہ کیجئے تو آسمان و زمین کا تفاوت پائیے گا البتہ اگر تصنع و تکلف کا نام کسی نے تہذیب رکھ لیا ہو تو اس کی یہی غلطی ہوگی کہ ایک مفہوم کا مصداق اس نے غلط ٹھہرا لیا اور اگر کسی کے ذہن میں اس وقت کوئی دیندار ایسا آیا جس میں تہذیب حقیقی کی کمی ہو اس کی وجہ یہ ہوگی کہ اس نے علوم دینیہ کا پورا اثر نہیں لیا۔

دین صرف نماز روزہ ہی کا نام نہیں ہے

یعنی دین کے اجزاء متعدد ہیں۔ عقائد و اعمال و معاملات و معاشرت و اخلاق باطنہ بعضے لوگ صرف نماز و روزہ کے احکام کے جاننے کو علم دین اور احکام کی پابندی کرنے والے کو دیندار لقب دیتے ہیں سو خود یہی غلط ہے سب اجزاء مذکورہ کے احکام ضروریہ کا اچھی طرح جاننا علم دین اور سب کی پابندی دینداری ہے۔ سو جس کو دیندار لقب دے کر قلیل التہذیب قرار دیا گیا ہے وہ واقع میں سب اجزاء دین کا مستوجب نہیں اور کلام اس میں ہے جس نے سب اجزائے کا اثر لیا ہو پس وہ شبہ رفع ہو گیا بندہ نے اس قسم کے شبہات کے جواب کے لئے رسالہ حقوق العلم لکھا ہے (جو قابل ملاحظہ ہے)

غرض تہذیب علم دین کے برابر کسی علم سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہی علم دین تو تھا جس نے سلف میں اپنے اثر سے وہ اخلاق و شائستگی پیدا کی کہ خود یورپ کو بھی اس کا اعتراف بلکہ اس سے اعتراف بھی ہے مگر ہم اپنے گھر کی دولت سے بے خبر ہو کر دوسروں سے اس کی دریوزہ گری کر رہے ہیں۔ واللہ

در العارف الرومی حیث قال ؎

یک سبد پر نان ترا بر فرق سر | تو ہمیں جوئی لبِ نان در بدر
تا بزانوئی میاں قعرِ آب | وز عطش وز جوع گشستی خراب

بعضے آدمی اپنی لڑکیوں کو آزاد بیباک عورتوں سے

لڑکیوں کے لئے آزاد اور بیباک اُستانی مقرر نہیں کرنی چاہئیے

تعلیم دلاتے ہیں یہ تجربہ ہے کہ ہم صحبت کے اخلاق و جذبات کا آدمی میں ضرور اثر ہوتا ہے خاص کر جب وہ شخص ہم صحبت ایسا ہو کہ متبوع اور معظم بھی ہو اور ظاہر ہے کہ استاد سے زیادہ ان خصوصیات کا کون جامع ہوگا تو اس صورت میں وہ آزادی و بیباکی ان لڑکیوں میں بھی آوے گی۔ اور میری رائے میں سب سے بڑھ کر جو عورت کا حیا اور انقباض طبعی ہے اور یہی مفتاح ہے تمام خیر کی۔ جب یہ نہ رہا تو اس سے پھر نہ کوئی خیر متوقع ہے نہ کوئی شر مستبعد ہے ہر چند کہ " اذا فاتک الحیاء فافعل ماشئت " حکم عام ہے لیکن میرے نزدیک ماشئت کا عموم النساء کے لئے بہ نسبت رجال کے زیادہ ہے اس لئے کہ مردوں میں پھر بھی عقل کسی قدر مانع ہے اور عورتوں میں اس کی بھی کمی ہوتی ہے ۔ اس لئے کوئی مانع ہی نہ رہے گا۔

اسی طرح اگر استانی ایسی نہ ہو لیکن ہم سبق اور ہمکتب لڑکیاں ایسی ہوں تب بھی اسی کے قریب مضرتیں واقع ہوں گی۔

اس تقریر سے دو جزئیوں کا حال بھی معلوم ہوگیا ہوگا جن کا اس وقت بے تکلف شیوع ہے ایک لڑکیوں کا عام زنانہ اسکول بنانا اور مدارس عامہ کی طرح اس میں مختلف اقوام اور مختلف طبقات اور مختلف خیالات لڑکیوں کا روزانہ جمع ہونا۔ گو معلّمہ مسلمان ہی ہو اور یہ آنا ڈولیوں ہی میں ہو اور گو یہاں آکر بھی پردہ ہی کے مکان میں رہنا ہو لیکن تاہم واقعات نے دکھلا دیا ہے اور تجربہ کرا دیا ہے کہ یہاں ایسے اسباب جمع ہو جاتے ہیں جن کا ان کے اخلاق پر برا اثر پڑتا ہے اور یہ صحبت اکثر عفت سوز ثابت ہوئی ہے اور اگر استانی بھی کوئی آزاد یا مکار مل گئی تو کریلہ اور نیم چڑھا کی مثال صادق آجاتی ہے۔

اور دوسری جزئی یہ کہ اگر کہیں مشن کی میم سے بھی روزانہ یا ہفتہ وار انگریزی تعلیم یا صنعت سکھلانے

کے بہانہ سے اختلاط ہونے تب تو نہ آبرو کی خیر ہے اور نہ ایمان کی۔ مگر افسوس صد افسوس ہے کہ بعضے لوگ ان آفات کو مایۂ افتخار سمجھکر خود اپنے گھروں میں بلاتے ہیں میرے نزدیک تو ان آفات مجسمہ سے بچی تو بچی اور تابع ہوکر تو کیا ذکر کسی بڑی بڈھی مسلمان عورت کا متبوع ہوکر بھی عمر بھر میں ایک بار ہمکلام ہونا بھی خطرناک ہے جن مضرتوں کے ذکر کا اوپر وعدہ تھا ان میں سے بعض یہی ہیں اور بعض کا ذکر اوپر دوسرے طبقہ کے منشاء خیال کے ضمن میں ہو چکا ہے۔

لڑکیوں کی تعلیم کا اسلم طریقہ

اسلم طریق لڑکیوں کے لئے یہی ہے جو زمانۂ دراز سے چلا آتا ہے کہ دو دو چار چار لڑکیاں اپنے اپنے تعلقات کے مواقع میں آویں اور پڑھیں اور حتی الامکان اگر ایسی استانی مل جاوے جو تنخواہ نہ لے تو تجربہ سے یہ تعلیم زیادہ بابرکت اور باثر ثابت ہوئی ہے اور بدرجہ مجبوری اس کا بھی مضائقہ نہیں اور جہاں کوئی ایسی استانی نہ ملے۔ اپنے گھر کے مرد پڑھا دیا کریں پڑھانے کا تو یہ طرز ہوا۔

نصابِ تعلیم

اور نصاب تعلیم یہ ہو کہ اول قرآن مجید حتی الامکان صحیح پڑھایا جاوے۔ پھر کتب دینیہ سہل زبان کی جن میں تمام اجزائے دین کی مکمل تعلیم ہو (میرے نزدیک بہشتی زیور کے دسوں حصے ضرورت کے لئے کافی ہیں) اور اگر گھر کا مرد تعلیم دے تو جو مسائل شرمناک ہوں ان کو چھوڑ دے اپنی بی بی کے ذریعہ سمجھوا دے اور اگر یہ انتظام بھی نہ ہو سکے تو ان پر نشان کر دے تاکہ ان کو یہ مقامات محفوظ رہیں پھر وہ سیانی ہوکر خود سمجھ لیں گی یا اگر عالم شوہر میسر ہو اس سے پوچھ لیں گی یا شوہر کے ذریعہ سے کسی عالم سے تحقیق کرا لیں گی۔ (چنانچہ بندہ نے بہشتی زیور کے دستور العمل میں جو ٹائیٹل پر مطبوع ہوا ہے۔ اس کا خلاصہ لکھدیا ہے مگر بعضے لوگ اس کو دیکھتے ہی نہیں اور اعتراض کر بیٹھتے ہیں کہ اگر کوئی مرد پڑھانے لگے تو ایسے مسائل کس طرح پڑھاوے۔ اس لئے ان کا لکھنا ہی کتاب میں مناسب نہ تھا کیسی کچی سمجھ ہے) بہشتی زیور کے اخیر میں مفید رسالوں کا نام بھی لکھدیا گیا ہے جن کا پڑھنا اور مطالعہ عورتوں کو مفید ہے اگر سب نہ پڑھے ضروری مقدار پڑھکر باقیوں کو مطالعہ میں ہمیشہ رکھیں۔ اور تعلیم کے ساتھ ان کے عمل کی بھی نگرانی رکھیں اور اس کا بھی انتظام کریں کہ ان کو تدریس کا شوق ہو، تاکہ عمر بھر علمی شغل رہے تو اس سے علم و عمل کی تجدید و تحریز ہوتی رہتی ہے اور اس کی بھی ترغیب دیں کہ مطالعہ کتب مفیدہ سے کبھی

غافل نہ رہیں اور ضروری نصاب کے بعد اگر طبیعت میں قابلیت دیکھیں عربی کی طرف متوجہ کریں۔ تاکہ قرآن وحدیث وفقہ اصلی زبان میں سمجھنے کے قابل ہو جاویں اور قرآن کا خالی ترجمہ جو بعض لڑکیاں پڑھتی ہیں۔ میرے خیال میں سمجھنے میں زیادہ غلطی کرتی ہیں اس لئے اکثر کے لئے مناسب نہیں یہ تو سب پڑھنے کے متعلق بحث تھی۔

عورتوں کو لکھنا سکھلانے کے متعلق حکم

رہا لکھنا تو اگر قرآن سے طبیعت میں بے باکی معلوم نہ ہو تو کچھ مضائقہ نہیں۔ ضروریات خانگی کے لئے اس کی بھی حاجت ہو جاتی ہے اور اگر اندیشہ خرابی کا ہو تو مفاسد سے بچنا جلب مصالح غیر واجب سے اہم ہے۔ ایسی حالت میں لکھنا نہ سکھلاویں اور نہ خود لکھنے دیں اور یہی فیصلہ ہے عقلا کے اس اختلاف کا کہ لکھنا عورت کے لئے کیسا ہے اب مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

"استاذ شاگرد اور ہم جماعت ساتھیوں کے حقوق کے متعلق کوتاہیاں"

(اصلاح معاملہ بہ ادائے حقوق معلم و متعلم و شریک تعلّم)

علوم دینیہ کا جس طرح تعلیم و تعلم ضروری ہے اسی طرح اس تعلیم و تعلم کے سبب جن لوگوں کے ساتھ تعلقات ہوتے ہیں۔ ان تعلقات کے حقوق کا ادا کرنا بھی ضروری ہے اور یہ حقوق جس طرح فی نفسہا دلائل سے ضروری ہیں۔ اسی طرح تجربہ سے ثابت ہوا کہ برکات علمیہ کے موقوف علیہ ہونے کے اعتبار سے بھی ضروری ہے یہیں اور جن سے یہ تعلقات ہوتے ہیں وہ تین جماعتیں ہیں اول معلمین یعنی اساتذہ دوسرے متعلمین، یعنی تلامذہ۔ تیسرے شرکا فی التعلم یعنی ہمدرس و ہم سبق، پس تینوں جماعتوں کے کچھ حقوق و آداب ہیں اور مثل دیگر اعمال کے ان میں بھی کم و بیش کوتاہیاں کی جاتی ہیں۔

متعلمین کی کوتاہیوں کی تفصیل چنانچہ مشاہدہ ہے کہ بعضے تو استاد کے حقوق و آداب بھی ادا نہیں کرتے۔ پھر ان میں بھی دو قسم کے ہیں بعض تو زمانہ تحصیل علوم میں بھی کوتاہیاں کرتے ہیں اور بعض اس زمانہ میں تو کسی قدر رعایت کرتے ہیں مگر بعد

مفارقت پھر مطلق اس کا اہتمام نہیں کرتے اور جو زمانہ تحصیل علوم میں بھی کوتاہیاں کرتے ہیں یہ دو قسم کے ہیں۔ بعضے تو ظاہر ظاہر حقوق میں بھی کوتاہی کرتے ہیں اور بعضے ایسا تو نہیں کرتے مگر جن حقوق و آداب کے سمجھنے میں کسی قدر سلیقہ کی حاجت ہے۔ ان میں کوتاہی کرتے ہیں اور ان سب میں اکثر عدد وہ ہیں جو بعد مفارقت پھر استاد کو یاد نہیں رکھتے اور سب میں بدتر وہ بدنصیب ہیں جو کسی نفسانی مقتضی سے استاد کے مخالف ہو جاتے ہیں۔ یہ سب اقسام ان لوگوں کے ہیں جو استادوں کا حق ادا نہیں کرتے۔ اور ان مضیعین حقوق اساتذہ سے زیادہ عدد میں وہ حضرات ہیں کہ اپنی استادی کے زمانہ میں شاگردوں کا کوئی حق اپنے اوپر نہیں سمجھتے اور اپنے حقوق واجبہ سے گذر کر غیر واجب بلکہ غیر جائز کے ادا کے بھی متوقع و منتظر رہتے ہیں اور قالاً یا حالاً ان کا مطالبہ ان سے کرتے ہیں اور ان سے بھی زیادہ وہ لوگ ہیں بلکہ غالباً قریب قریب کل کے ایسے ہی ہیں کہ ہم سبقوں کے حقوق کا تو ان کے دل میں خطرہ بھی نہ گذرتا ہوگا۔

گو کہیں دوسرے اسباب سے باہم دوستی بھی ہو جاتی ہو لیکن یہ بات کہ محض اس علاقہ سے باہم دوسرے کے کچھ حقوق اپنے ذمہ سمجھتے ہوں یہ بات بہت نادر بلکہ قریب قریب معدوم ہے اور جب سمجھتے ہی نہیں تو سمجھ کر ادا کرنے کے اہتمام کا تو کیا ذکر ہے بلکہ بعض جگہ تو نہایت افسوس کی بات ہے کہ بجائے باہم اخوت و فاق و رعایت حقوق کے ایک طرف سے یا کہیں دونوں طرف سے بغض و حسد و خلاف و عقوق دیکھا جاتا ہے اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ ان سب حقوق کی کچھ کچھ جزئیات بطور نمونہ لکھ دی جاویں۔ خود ان جزئیات کے بیان میں انشاء اللہ تعالیٰ ایسے اصول ہاتھ آجاویں گے کہ ان اصول سے دوسری غیر مذکور جزئیات کا سمجھنا اور رعایت کرنا سہل ہو جائے گا۔ اور ہرچند کہ یہ تینوں قسم کے حقوق اور آداب میرے نزدیک فطری ہیں اور ذرا بھی فطرت میں سلامتی ہو تو ان کے معلوم کرنے اور نیز عمل پر تقاضا کرنے کے لئے صرف وجدان کافی ہے لیکن اس خیال سے شاید کسی احتمال پرست کو گمان ہو کہ مثل دیگر حقوق کے یہ حقوق شریعت میں منقول نہیں۔ قرین مصلحت معلوم ہوا کہ

اولاً نصوص کو نقل کر کے ساتھ ساتھ ان حقوق کی تقریر کرتا جاؤں اور حتی الامکان ترتیب کا بھی لحاظ رکھوں اس طرح کہ اول حقوق استاد کے پھر شاگرد کے، پھر ہمدرس کے۔ بیان کروں اور

حتی الامکان اس لئے کہا کہ ممکن ہے کہ کسی نص سے دو یا تین جماعتوں کے حقوق مفہوم ہوتے ہوں تو خاص اس میں وہ ترتیب ملحوظ نہ رہے گی۔ گو ایسا قلیل ہو گا۔

اور جاننا چاہیئے کہ استاد عام ہے۔ سبق پڑھانے والے اور پوچھنے پر مسئلہ بتلانے والے اور ابتداءً امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنے والے اور اصلاح نفس کے طریقے بتلانے والے یعنی پیر کو، اسی طرح شاگرد عام ہے، تلمیذ متعارف اور سائل عن الدین اور مرید کو، اسی طرح ہمدرس عام ہے متعارف ہم سبق اور کسی عالم کی مجلس میں شرکت کرنے والوں اور پیر بھائیوں کو،

اور ثانیاً بعد سوق نصوص کے بطور تفریع یا توضیح یا تفصیل یا تتمیم کے کچھ جزئیات کی بھی تقریر کر دوں کہ وہ بھی گویا اصل ہی کے ساتھ ملحق ہو گا۔

حقوق و آداب معلم

آیۃ۔ لقد من اللہ علی المومنین (الی قولہ تعالیٰ) یعلمھم الکتاب والحکمۃ الآیۃ

(البتہ احسان کیا اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر (الی قولہ) سکھلاتا ہے ان کو کتاب اور حکمت)

اس آیۃ کریمہ میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعمت بعثت پر منت ہونے کی علت میں تعلیم کتاب و حکمت کو ذکر فرمانا صاف دلیل ہے کہ جو شخص کسی کو دین کی تعلیم کرے وہ اس شخص کے حق میں نعمت الہٰی ہے اور اس کی قدر و تعظیم اس پر لازم ہے اور اس تعلیم میں سبق پڑھانا اور مسئلہ بتلانا وغیرہ سب داخل ہیں کہ یہ سب تعلیم کے طریقے ہیں حتیٰ کہ کسی کی تصنیف سے منتفع ہو جانا اس قاعدہ سے اس کے شاگردوں میں داخل ہو جانا ہے اس کے حقوق بھی مثل استادوں کے ثابت ہو جاویں گے۔

آیۃ۔ قال لہ موسیٰ ھل اتبعک الی آخر القصہ

(حضرت موسیٰؑ نے حضرت خضرؑ سے کہا کہ کیا میں تمہاری پیروی کروں)

ان آیتوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کا قصہ ہے اس سے چند حقوق و آداب ثابت ہوتے ہیں اول استاد کی خدمت میں خود شاگرد جایا کرے ان کو تکلیف نہ دے

کرا کر پڑھا دیا کریں اگر استاد کسی اعتبار سے شاگرد سے رتبے میں کم بھی ہو تب بھی اس کا اتباع کرے۔

سوم:۔ جس بات کے پوچھنے کو وہ منع کریں نہ پوچھا کرے۔ اس کی مخالفت یا اس کو تنگ نہ کرے۔

چہارم:۔ اگر کبھی غلطی سے اس کے مزاج کے خلاف کوئی بات ہو جاوے تو معذرت کرے۔ پنجم اس کے تنگ ہونے یا مرض وغیرہ سے کسل مند ہونے کے وقت سبق بند کر دے

استاد کے ساتھ گفتگو کے آداب ملحوظ رکھنا

آیۃ:۔ یاایہا الذین آمنوا لا تقولوا راعنا وقولوا انظرنا واسمعوا الایۃ

(ترجمہ) اے لوگو جو ایمان لائے ہو مت کہو راعنا اور کہو انتظار کرو ہمارا اور سنو۔ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ استاد کے ساتھ گفتگو میں بھی ادب ملحوظ رکھے۔ تا بمعاملات چہ رسد۔

آیۃ ۔ انما المؤمنون الذین آمنوا باللہ ورسولہ واذا کانوا معہٗ علیٰ امر جامع لم یذھبوا حتی یستاذنوہ ط

(ترجمہ) جز این نیست کہ مومن وہ لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان لائے۔ اور جب ہوتے ہیں ساتھ رسول کے کسی اجتماعی بات پر تو نہیں جاتے جب تک اجازت نہ لے لیں۔

استاد کی خدمت میں بلا اجازت نہ جاوے

اس آیت سے استاد کا یہ حق ثابت ہوا کہ اس کی خدمت سے بلا اذن نہ جاوے خواہ اذن صراحۃً ہو یا دلالۃً

تعلیم دین بھی احسان ہے

حدیث:۔ عن ابن عمر رضی اللہ عنہ من صنع الیکم معروفا فکافئوہ فان لم تجدوا ما تکافئونہ فادعوا لہ حتی تروا انکم قد کافاتموہ (رواہ احمد وابوداؤد والنسائی وابن حبان فی صحیحہ والحاکم فی مستدرکہ کذا فی العزیزی)

(ترجمہ) جو شخص تم پر احسان کرے اگر تم اس کی مکافات کر سکتے ہو تو کر دو ورنہ اس کے لئے دعا کرو۔ یہاں تک کہ تم سمجھ لو کہ تم نے اس کی مکافات کر دی۔

کیا کوئی شخص تعلیم دین کے معروف یعنی احسان ہونے سے انکار کر سکتا ہے۔ جب اس کا احسان ہونا مسلّم ہو گیا تو اس کے مکافات میں اس کی ہر قسم کی خدمت مال سے جان سے داخل ہو گئی جو

حدیث ہذا میں مامور بہ ہے۔

اور جب کسی قسم کی استطاعت نہ رہے تو اس وقت اقل درجہ دعا ہی سے یاد رکھنا فروری ہے

حدیث:۔ عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ رواہ احمد والترمذی۔

ترجمہ:۔ جس نے آدمیوں کا شکر ادا نہ کیا، اس نے اللہ تعالیٰ کا شکر نہ ادا کیا۔

اس حدیث کے عموم میں استاد بدرجہ اولیٰ داخل ہے کہ بہت بڑی نعمت یعنی علم دین کا واسطہ ہے اس کی حق شناسی میں کوتاہی کرنا بنص حدیث حق تعالیٰ کی ناشکری ہے جس کا محل وعید ہونا نص قطعی سے ثابت ہے۔

قال تعالیٰ لئن شکرتم لازیدنکم ولئن کفرتم (مقابل شکرتم) ان عذابی لشدید ہ الآیۃ۔

ترجمہ:۔ اگر تم شکر کرو گے تو ہم اور زیادہ دیں گے اگر تم کفرانِ نعمت کرو گے تو یاد رکھو ہمارا عذاب شدید ہے۔

یہ حدیثیں تو بعموم مدعا پر دال ہیں۔ آگے خصوص کے ساتھ دلالت کرنے والی احادیث منقول ہیں۔

اُستاد اور شاگرد ایک دوسرے کو مغالطہ میں نہ ڈالے

حدیث: عن معاویۃ رضی اللہ عنہ قال ان النبی صلے اللہ علیہ وسلم نہی عن الاغلوطات رواہ ابوداؤد

ترجمہ:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (علوم میں) مغالطہ دینی سے منع فرمایا ہے۔

اس سے ایک ادب استاد کا ثابت ہوا وہ یہ کہ بعض طلبار کی عادت ہے کہ خواہ مخواہ کتاب میں احتمالات نکال کر استاد کے سامنے بطور اعتراض پیش کیا کرتے ہیں اور خود بھی سمجھتے ہیں کہ مہمل اعتراض ہیں مگر اپنی ذہانت جتلانے اور استاد کا امتحان کرنے کے لئے ایسی نامعقول حرکت کرتے ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ یہ مغالطہ ہوا کہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ یہ مقام مشتبہ ہے حالانکہ خود اپنے نزدیک بھی مشتبہ نہیں اور اسی سے شاگرد کا بھی ایک حق ثابت ہوگیا وہ یہ کہ بعض مدرسین کی عادت ہے

کہ کسی مقام پر خود بھی شبہ ہے مگر شاگرد پر ظاہر نہیں کرنا چاہتے کچھ گڑھ مڑھ کر تقریر کر دیتے ہیں۔ گویا اس کو دھوکا دیتے ہیں کہ اس مقام کی یہی تقریر ہے حالانکہ خود بھی یہ اطمینان نہیں۔

علم دین پڑھانے والا سب سے زیادہ سخی ہے۔

حدیث:۔ عن انس بن مالک رضی اللہ عنہٗ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ھل تدرون من اجود جوداً قالوا اللہ ورسولہ اعلم قال اللہ اجود جوداً ثم انا اجود بنی آدم واجودھم من بعدی رجل علم علماً فنشرہ یاتی یوم القیامۃ امیراً وحدہٗ رواہ البیھقی۔

ترجمہ:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم جانتے ہو کہ سب سے زیادہ سخی کون ہے؟۔ انہوں نے (ازراہ ادب) عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ اور اللہ تعالیٰ کا نبی دانائے حال ہے تو آپ نے فرمایا ہے کہ سب سے زیادہ سخی اللہ تعالیٰ ہے پھر تمام بنی آدم میں سب سے زیادہ میں سخی ہوں اور پھر سب سے زیادہ سخی وہ شخص ہے کہ جس نے علم دین سیکھا اور اس کو پھیلایا یہ شخص قیامت میں تنہا بمنزلہ ایک امیر کے آوے گا (بیہقی)

اس حدیث میں بعد اللہ ورسول کے سب سے زیادہ صاحب جود اس عالم کو فرمایا ہے جو علم کو شائع کرے جس طریق سے بھی ہو خواہ تدریس سے یا وعظ وتلقین سے خواہ تصنیف سے، اور ظاہر ہے کہ جو شخص کسی پر جود کرے اس کا کتنا حق ہوتا ہے پس یہ مشیعین للعلم جن لوگوں پر جود خاص کر رہے ہیں اور وہ متعلمین ہیں باقسا ہم ان پر ان کا کیسا کچھ حق ہو جاوے گا۔

اگر استاد کسی کتاب پڑھنے سے منع کرے تو شاگرد کو اس پر عمل کرنا چاہیئے

حدیث:۔ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کتب الامیر السریۃ کتاباً وقال لا تقراہ حتی تبلغ مکان کذا وکذا فلما بلغ ذلک المکان قراہ علی الناس واخبرھم بامر النبی صلی اللہ علیہ وسلم (رواہ البخاری)

ترجمہ: یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک امیر لشکر کو حکم نامہ لکھ کر دیا اور (ایک مصلحت کے سبب) یہ فرمایا کہ جب تک فلاں مقام پر نہ پہنچ جاؤ اس کو مت پڑھنا۔ چنانچہ اسی کے موافق عمل کیا۔ (بخاری)

اس حدیث سے ایک ادب ثابت ہوا جو طالب علموں پر لازم ہے وہ یہ کہ استاد اگر کسی کتاب

پڑھنے سے کسی خاص وقت میں منع کرے مثلاً اس کے نزدیک شاگرد کی استعداد سے زیادہ ہے اس مصلحت سے اس وقت پڑھنے سے منع کرتا ہے تو طالب علم کو چاہیئے اس پر عمل کرے۔ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہر طرح مبارک ہی تھا اور اس کا پڑھنا اور جاننا ہر وقت عبادت تھا مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مصلحت سے ایک وقت معین کے قبل تک اس کے مطالعہ سے منع فرمایا اور ان صحابی نے ویسا ہی کیا۔

شاگرد کے بے ڈھنگے سوال پر اگر اُستاد غصہ کرے تو صبر کرنا چاہیئے

حدیث: عن زید بن خالد الجهنی ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم سألہ رجل عن اللقطۃ فقال اعرف وکاءها او قال وعاءها وعفاصها ثم عرفها سنۃ ثم استمتع بها (ای ان کنت فقیرًا والا تصدق بها) فان جاء ربها فادها الیہ قال فضالۃ الابل فغضب حتی احمرت وجنتاہ او قال احمر وجهہ فقال مالک ولها معها سقاءها وحذاءها ترد الماء وترعی الشجر فذرها حتی یلقٰها ربها الحدیث رواہ البخاری۔

ترجمہ: جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے لقطہ (گری ہوئی چیز کے پانے کا) مسئلہ دریافت کیا۔ تو آپ نے فرمایا۔ اس کا سر بند اور ظرف پہچان لے۔ اور سال بھر تک اس کی تعریف کرا گر کوئی مالک نہ ملے (اور تو محتاج ہو تو اس سے نفع اٹھا ورنہ صدقہ کر دے) پھر اگر اس کا مالک آوے تو اس کو دیدے۔ اس سائل نے کہا کہ گمشدہ اونٹ کا کیا حکم ہے۔ اس سوال سے آپ پر آثار غصہ نمودار ہوئے حتی کہ رخسار ہائے مبارک سُرخ ہو گئے۔ آپ نے فرمایا۔ تجھے اس سے کیا کام ہے اس کے ساتھ اس کی مشک ہے اور اس کے موزے۔ پانی پر جا کر پانی پیتا ہے اور درختوں سے چارہ کھاتا ہے (بخاری)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کسی بیڈھنگے سوال پر استاد غصہ کرے تو شاگرد کو چاہیئے کہ اس کو گوارا کرے مکدر نہ ہو۔ جس طرح یہاں اس صحابی نے برا نہیں مانا۔

جہاں تک ہوسکے استاد کے ساتھ رہنے کی کوشش کریں

حدیث: عن ابی هریرۃ رضی اللہ عنہ فی حدیث طویل

وان ابا هريرة رض كان يلزم رسول الله صلى الله عليه وسلم بشبع لبطنه ويحضر مالا يحضرون ويحفظ مالا يحفظون (البخاري)

ترجمہ:۔ ایک طویل حدیث میں حضرت ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ اپنے پیٹ بھر غذا ملنے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہمیشہ رہتے تھے۔ اس قدر اور لوگ حاضر نہ رہ سکتے تھے اور احادیث اس قدر یاد کرتے تھے کہ اور لوگ نہ یاد کر سکتے تھے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر پیٹ بھرائی کھانا مل جاوے تو حتی الامکان استاد سے جدا نہ ہو کہ اس کی عنایت بھی بڑھ جاتی ہے اور فوائد علمیہ بھی حاصل ہوتے ہیں اور اس کی خدمت کا بھی موقع ملتا ہے۔ چنانچہ حضرت ابوھریرہ رضہ سے موقع پر خدمتیں لینا بھی احادیث میں وارد ہے۔

استاد کی تقریر کے وقت بالکل خاموش رہنا چاہیئے

حدیث:۔ عن جرير رضي الله ان النبي صلى الله عليه وسلم قال له في حجة الوداع استنصت الناس (رواه البخاري)

ترجمہ:۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں خطبہ کے وقت حضرت جریر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ لوگوں کو چپ کرو۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ استاد کی تقریر کے وقت بالکل خاموش اور متوجہ رہنا چاہیئے کسی سے بات نہ کرے کسی کی طرف التفات نہ کرے۔

اگر استاد کسی بات پر ناراض ہو تو ان کو خوش کرنا چاہیئے

حدیث:۔ عن جابر رضي الله عنه ان عمر بن الخطاب رضي الله تعالى عنه اتى رسول الله صلى الله عليه وسلم بنسخة من التوراة فقال يا رسول الله هذه نسخة من التوراة فسكت فجعل يقرء ووجه رسول الله صلى الله عليه وسلم يتغير فقال ابوبكر رضي الله عنه ثكلتك الثواكل ما ترى ما بوجه رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال اعوذ بالله من غضب الله ورسوله (الحديث) (رواه الدارمي)

ترجمہ:۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک نسخہ توراۃ کا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ یہ نسخہ توراۃ

کا ہے۔ آپ سن کر خاموش ہو رہے۔ حضرت عمر نے اس کو پڑھنا شروع کیا اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ متغیر ہوا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اے عمر رووین تجھ کو رونے والیاں۔ رسول اللہ صلی اللہ کے روئے انور کو تو دیکھ کہ خوشی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھتے ہی فرمایا۔ پناہ مانگتا ہوں اللہ تعالیٰ کے غصے سے اور اللہ تعالیٰ کے رسول کے غصہ سے (دارمی)

اس حدیث سے ایک حق استاد کا ثابت ہوا کہ اگر وہ کسی بات پر غصہ کرے تو شاگرد کو معذرت کرنا اور اس کو خوش کرنا ضروری ہے۔ دوسرا حق شاگرد کا ثابت ہوا کہ اگر اس سے کوئی امر نامناسب صادر ہو تو اس کو تنبیہ کرنا ضرور ہے اور اس سے اس کی اصلاح ہوتی ہے تیسرا حق شریک علم کا ثابت ہوا کہ اس کی غلطی پر جس پر وہ خود مطلع نہ ہوا۔ خیر خواہی سے مطلع کر دے کہ وہ اس کا تدارک کرے اور وہ بھی اس کو قبول کرے۔ جیسا حضرات شیخین سے واقع ہوا۔

اہل علم اور استاد کے ساتھ ادب و تواضع سے پیش آنا چاہیئے

(حدیث) فی الترغیب والترہیب للمنذری عن ابی ھریرۃ رض

قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تعلموا العلم وتعلموا للعلم السکینۃ والوقار وتواضعوا لمن تعلمون منہ۔ رواہ الطبرانی فی الاوسط

ترجمہ:۔ حضرت ابوہریرہ رض سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ علم سیکھو اور علم کے لئے سکینہ اور وقار اختیار کرو اور جس سے علم سیکھتے ہو اس کے ساتھ تواضع اور ادب سے پیش آؤ (ترغیب وترہیب)

اس حدیث میں ترغیب علم و اختیار وضع اہل علم کے ساتھ استاد کے ساتھ ادب و تواضع سے پیش آنے کا صریح امر ہے۔

استاد کے حقوق کے متعلق مختلف کوتاہیاں

اب بعد سوق نصوص کے واقعات پر نظر کر کے کچھ کوتاہیاں اس باب کے متعلق عرض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

سو جاننا چاہیئے کہ جو لوگ استاد کے حقوق ضائع کرتے ہیں جیسا کہ تمہید مضمون میں بیان کیا گیا

مختلف اقسام ہیں بعض تو خود زمانہ تحصیل علوم میں بھی کوتاہیاں کرتے ہیں۔ پھر ان میں بعضے تو ظاہر حقوق میں بھی کوتاہی کرتے ہیں جیسے ان کا ادب کرنا مثلاً آنے جانے کے وقت سلام نہ کرنا اس کی طرف پشت کرکے بیٹھنا، یا ادھر پاؤں پھیلا دینا، اور جیسے اطاعت کم کرنا، مثلاً کوئی بات مان لی۔ کسی بات کو ٹال دیا اور جیسے خلوص میں کمی کرنا، مثلاً اس سے فریب کرنا، جھوٹ بولنا، اپنی خطا کی تاویل کرنا اور جیسے خدمت میں کمی کرنا، خواہ بدنی ہو، مثلاً اس کو پنکھا جھلنا، اس کا بدن دابنا۔ ومثل ذالک۔ اور خواہ مالی ہو مثلاً حق تعالیٰ نے اپنے کو وسعت دی ہے اور استاد نادار ہے۔ اس وقت اس کی خدمت میں کچھ نقد یا متاع یا طعام بطور ہدیہ کے پیش کرنا۔ اس میں ایسے متکبر ہیں کہ وہ بدنی خدمت کو عار اور ذلت سمجھتے ہیں۔ اور بعض مال سے دریغ کرتے ہیں۔ خصوصاً اگر استاد ان کا تنخواہ دار ہو تو تنخواہ دے کر سب حقوق سے اپنے کو سبکدوش سمجھ بیٹھتے ہیں۔ واقعی پھر کوئی حق واجب تو نہیں رہتا لیکن کیا واجب کے بعد تطوع کا کوئی درجہ نہیں خصوص جبکہ اس میں اپنا ہی نفع ہو۔ تجربہ سے یہ معلوم ہوا کہ استاد کا دل جس قدر خوش رکھا جاوے گا۔ اس قدر علم میں برکت ہوگی۔

استاد کا حق پورا نہ کرنے کے متعلق ایک عجیب حکایت

میں نے ایک جگہ کسی بہت بڑے عالم کی حکایت لکھی دیکھی ہے کہ ان کے استاد ان کے وطن کی طرف اتفاق سے آئے تھے۔ سو سب شاگردان کی خدمت میں سلام کے لئے حاضر ہوئے اور یہ عالم بوجہ اس عذر کے کہ وہ اپنی والدہ کی خدمت میں مشغول تھے حاضر نہ ہو سکے۔ چونکہ ایسی مشغولی نہ تھی کہ حاضر ہونے سے ضروری خدمت میں کوئی حرج واقع ہوتا۔ کسی قدر سستی سے بھی کام لیا۔ استاد کو یہ کم توجہی ناگوار ہوئی اور یہ فرمایا کہ بہ برکت خدمت والدہ کے ان کی عمر تو طویل ہوگی مگر ہمارے حقوق میں کمی کرنے کے سبب ان کے علم میں برکت نہ ہوگی۔ چنانچہ عمر تو بہت ہوئی لیکن تمام عمر گذر گئی نشر علم کے اسباب ان کے لئے جمع نہ ہوئے۔ کچھ ایسے اتفاقات وقتاً فوقتاً پیش آتے رہے کہ کبھی شہر میں رہنا ہی نصیب نہ ہوا۔ ہمیشہ گاؤں میں رہتے رہے۔ جہاں نہ درس وتدریس کا موقع ملا نہ دوسرے طرق اشاعت علم کا۔

غرض کہ استاد کے تکدر سے علم کی برکت جاتی رہتی ہے اور اس کی خوشی سے برکت ہوتی ہے۔

پس جو حقوق واجب نہیں ہیں۔ ان کی رعایت کرنے سے اپنا یہ نفع ہے۔

اور کہ غور کرنے کے قابل بات ہے کہ اگر استاد بھی اسی قاعدہ پر عمل کرے کہ تعلیم واجب سے زیادہ ایک حرف نہ بتلاوے ایک منٹ زیادہ نہ دے۔ تقریر ایک بار سے زیادہ ہرگز نہ کرے تو کیا اس طرح سے اس کو علم حاصل ہو سکتا ہے وہ بے چارہ اس کی تعلیم و تفہیم میں واقعی خون جگر کھاتا ہے تو اس کو کیا زیبا ہے کہ اس کے حقوق میں ضابطہ سے ایک انگل نہ بڑھے۔ یہ تو نری بے حسی و قساوت ہے۔

کتابوں کا مطالعہ کرنا بھی استاد کے حقوق میں داخل ہے۔

اور بعضے ایسے موٹے موٹے حقوق کی تو رعایت کرتے ہیں لیکن ایسے حقوق میں کوتاہی کرتے ہیں جن کے سمجھنے میں سلیقہ کی ضرورت ہے۔ مثلاً مطالعہ کم دیکھنا جس سے یا عبارت پڑھنے میں غلطیاں ہونے سے یا مقام کے کم سمجھنے کے سبب استاد کو کئی بار تقریر کرنے کی ضرورت واقع ہونے سے یا اسی کم سمجھنے کے سبب فضول سوال کرنے سے استاد کو تنگی و انقباض و پریشانی ہو تو کیا محسن کا یہی حق ہے کہ اس کو بلا ضرورت پریشان کیا جاوے اور یہاں بلا ضرورت ہی ہے کیونکہ مطالعہ کے اہتمام سے یہ سب خلجانات رفع ہو سکتے تھے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مطالعہ دیکھنے سے پھر عبارت میں غلطی یا فہم مطالب میں کمی نہیں ہوتی۔ ضرور پھر بھی ہوتی ہے مگر اللہ تعالیٰ نے استادوں کو ایسی بصیرت عطا فرمائی ہے کہ وہ سمجھ جاتے ہیں کہ اس نے اپنی کوشش صرف کی ہے یا نہیں۔ پس باوجود بذل جہد کے جو کمی رہ جاتی ہے وہ چونکہ اس کی وسعت سے خارج ہے اس سے طبعاً تنگدلی نہیں ہوتی اس میں اس شاگرد کو معذور سمجھا جاتا ہے۔ اور بے پروائی اور سستی معلوم ہونے سے بے حد ناگواری ہوتی ہے۔

استاد کی تقریر کے وقت ادھر ادھر نہیں دیکھنا چاہیئے

اور مثلاً استاد کی تقریر کے وقت دوسری طرف التفات کرنا کہ استاد تو اس کی طرف متوجہ اور یہ دوسری طرف متوجہ اس سے استاد کو بہت کوفت ہوتی ہے خصوص ایسی حالت میں جب کہ کوئی سوال بھی کرے۔ ایسا کہ اگر توجہ سے تقریر سنتا تو پھر یہ سوال ہی نہ کرتا۔ اس وقت استاد کو سخت شکایت ہوتی ہے کہ ناحق ہی مجھ کو پریشان کر رہا ہے۔

مہمل اور لغو اور اپنی ذہانت دکھلانے کیلئے سوال نہیں کرنا چاہیئے

اور مثلاً ایسا سوال کرنا جس کا جواب

یا جس کی لغویت خود بھی معلوم ہے۔ جس طرح بعض طلباء کی عادت ہے کہ محض اپنی ذہانت دکھلانے یا استاد کا امتحان لینے یا محض مشغلہ وتفریح کی غرض سے دور از کار مہمل مہمل سوالات کیا کرتے ہیں۔

ایک حکایت جیسے ایک طالبُ علم کی حکایت سنی ہے کہ انہوں نے حدیث میں پڑھا کہ طلوع شمس کے وقت نماز نہ پڑھو۔ تو آپ کیا فرماتے ہیں کہ لاتصلوا بھی عام اور طلوع شمس بھی عام خواہ کسی مقام کا طلوع شمس ہوا اور یہ مشاہدہ سے ثابت ہے کہ ہر وقت کہیں نہ کہیں طلوع ہوتا ہی رہتا ہے۔ تو اس سے لازم آتا ہے کہ کسی شخص کو کسی وقت بھی نماز پڑھنا جائز نہ ہو۔ ہر چند کہ اس کو سمجھایا گیا کہ بھائی جہاں کا طلوع شمس ہو وہیں کے لوگوں کو اس وقت کے اعتبار سے لاتصلوا کا حکم ہے۔ مگر ان بزرگوار نے مانا ہی نہیں۔ یہی فرماتے رہے کہ نہیں صاحب دونوں ہی میں عموم ہے۔ ان سے کہا گیا کہ بھائی اس سے تو نماز کی فرضیت ہی لغو ہوئی جاتی ہے۔ کہتے ہیں۔ کہ خواہ کچھ ہو جائے انصاف ہے۔ کیا یہ سوال قابل پیش کرنے کے ہے؟ اور کیا سچ مچ اس پاگل کو یہ شبہ تھا۔ محض فضول دق کرنے کے لئے اس نے یہ حرکت کی اور بجائے اس کے کہ اس کے زعم کے موافق اس کی ذہانت ظاہر ہوتی۔ اور الٹا اس کا کوڑھ مغز ہونا ثابت ہو گیا۔ ایسے طالب علموں کو کبھی علم نصیب نہیں ہوتا۔

غرض استاد کو کبھی پریشان نہ کرے۔ بلکہ ادب کی بات تو یہ ہے کہ اگر اور کسی سبب سے یا اور کسی کے سبب سے وہ پریشان ہو تو اس وقت یا تو سبق ملتوی کر دے یا بجز بہت ہی ضروری بات کے زائد باتیں نہ پوچھے۔

اور مثلاً تعیین سبق یا مقدار سبق میں استاد کی رائے نہ ماننا جیسے بعض طلباء کی عادت ہے کہ باوجود استاد کی رائے معلوم ہونے کے پھر اپنی رائے پر اصرار کرتے ہیں کہ ہم تو فلاں ہی کتاب شروع کریں گے۔ یا اتنا ہی سبق پڑھیں گے یا فلاں ہی شخص سے پڑھیں گے۔ ان امور میں تو طالب علم کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ "ھل یستوی الذین یعلمون والذین لایعلمون"۔

ترجمہ: یعنی کہاں تجربہ کار اور کہاں ناتجربہ کار، اس کو تو اس پر عمل کرنا چاہیئے۔

بمے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا

کنایہ است از خلاف نفس کردن نہ کہ خلاف حق کردن یہ وہ حقوق ہیں کہ جن کے سمجھنے کے لئے سلیقہ کی ضرورت ہے۔ یہاں تک یہ سب جزئیات ہوئیں ان اضاعات حقوق کی جو زمانہ تحصیل علوم میں سرزد ہوتی ہیں۔

فراغت کے بعد کی کوتاہی ایک قسم وہ ہے جو بعد مفارقت استاذ کا کوئی حق اپنے اوپر نہیں سمجھتے یا سمجھتے ہوں مگر عمل کا اہتمام نہیں کرتے۔ اور اس بلا میں بہت زیادہ ابتلاء ہے اور تو کیا کرتے کبھی خط بھیجنے کی اور استاد کی خیریت پوچھنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ سمجھتے ہیں کہ اب کیا علاقہ رہا۔ کیا صاحب محسن کا حق صدور احسان ہی کے زمانہ تک ہوتا ہے۔ پھر نہیں رہتا؟ اگر یہ بات ہے۔ پس بعد بالغ ہو جانے کے والدین کے حقوق بھی رخصت ہو جاویں گے۔ ولا قائل بہ۔

پھر یہ ہے کہ گو صدور احسان کا اس وقت استاد سے نہیں ہو رہا ہے لیکن اس احسان کے آثار کا ظہور و ترتب تو اس وقت بھی ہو رہا ہے بلکہ زیادہ اسی وقت ہو رہا ہے کیونکہ جتنا کمال علمی اس وقت تمہارا ظاہر ہو رہا ہے اس کا منشاء و مبداء وہی انعام تعلیمی استاد ہی کا تو ہے ونعم ما قیل فی نحو هذا المعنی

فعادوا فاثنوا بالذی کان اھلہ
ولو سکتوا اثنت علیہ الحقائب

غرض یہ ناسپاسی ہی ہے کہ اپنا کام نکالا اور الگ ہوئے یہ تو پوری خود غرضی ہے سپاس گذاری یہی ہے کہ ہمیشہ جب تک جان میں جان ہے وہ وقت یاد رکھے کہ جب یہ اس کے سامنے کتاب رکھکر بیٹھتا تھا اور یہی سمجھے کہ گویا ابھی اس کے پاس سے پڑھکر اٹھکر آیا ہوں اور پھر پڑھنے کے لئے جاتا ہے تو اس وقت جتنے حقوق کو ضروری سمجھتا تھا جن کی بقدر ضرورت تفصیل بھی ہو چکی ہے وہی حقوق اب بھی باقی ہیں ایسا کرنے سے انشاء اللہ تعالیٰ یوماً فیوماً علوم و برکات میں ترقی ہوگی۔ قال تعالیٰ لئن شکرتم لازیدنکم۔

بلکہ ان حقوق کو ایسا مستمر سمجھے کہ استاد کی وفات کے بعد بھی وہ حقوق ملحوظ رکھے جو اس وقت ادا کئے جا سکتے ہیں اور ان کا خلاصہ دو امر ہیں۔ ایک اس کے لئے ہمیشہ دعائے مغفرت کرنا دوسرا اس کے اہل و اقارب کی تعظیم و خدمت کرنا اسی طرح استاد کے دوستوں اور معاصرین کا احترام کرنا

اور اگر ان کو حاجت ہو تو ان کی خدمت کرنا۔

احادیث میں اس قسم کے حقوق والدین کے لئے آئے ہیں اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کی فضیلت بیان فرمائی ہے جو بعد وفات نبویہ آپ کے اہل کی خدمت کریں گے اور آپ کی عزت سے محبت رکھیں گے اب صرف ان مضیعین حقوق استادیں سے وہ لوگ رہ گئے جن کو میں نے تمہید میں بدنصیب کہا ہے۔ یعنی جو نفسانی اغراض سے استاد کے مخالف ہو جاتے ہیں۔ ان کی شان میں تقریراً یا تحریراً گستاخی کر کے ان اشعار کا مصداق بنتے ہیں۔

از خدا جوئیم توفیق ادب ❊ بے ادب محروم گشت از فضل رب

ہر کہ گستاخی کند اندر طریق ❊ باشد او در لجۂ حیرت غریق

بذر گستاخی کسوف آفتاب ❊ شد عزازیلے زجرأت رد باب

استاد تو وہ چیز ہے کہ اگر بضرورت دینیہ بھی اس کے خلاف کرنا پڑے تب بھی کافر باپ کی طرح دین کے باب میں تو اس کی موافقت نہ کرے لیکن ادب اور احترام اس کا ترک نہ کرے۔ کیونکہ وہ بھی ایک قسم کا یعنی روحانی باپ ہے۔ گو تعارض حقوق کے وقت باپ سے یہ مرجوح ہو مگر حقوق غیر متعارضہ میں تو اس کا بھی وہی حکم ہے۔ آخر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں اسی تربیت روحانیت و تعلیم دینی ہی کے سبب تو یہ ارشاد ہوا ہے۔

النبی اولیٰ بالمؤمنین من انفسھم وازواجہ امھاتھم وفی بعض القراءت وھواب لھم۔

پس استاد بھی آپ کا وارث و نائب ہے گو اس درجہ میں نہ سہی۔ چنانچہ آپ کے حقوق، علی الاطلاق آبار نسبیہ پر مقدم ہیں۔ اس وجہ سے کہ آپ کے حقوق حقوق الٰہیہ ہیں جو سب پر مقدم ہیں۔ یہ مختصر بیان ہوا اقسام مضیعین حقوق و آداب اساتذہ کا۔

تنخواہ دینے سے استاد کے حقوق سے سبکدوش نہیں ہوجاتا

ان سب اقسام میں ایک ایک مشترک شکایت ہے وہ یہ کہ جو اساتذہ کسی مدرسہ سے تنخواہ پاتے ہیں۔ ان کے حقوق اور بھی ضعیف سمجھتے ہیں۔ افسوس یہ نہیں سمجھتے کہ جو بناء ہے ان حقوق کی وہ تنخواہ پانے سے منعدم نہیں ہو گئی تو

مبنی کیسے منفقود ہو جاوے گا اول تو تنخواہ کیا اس احسان کا بدل ہو سکتی ہے دوسرے وہ تنخواہ انہوں نے بھی دی ہو اس سے زیادہ اس نے ان کو دیا۔

اور اگر کہا جاوے کہ جب نیت اس کی دینا کی تھی تو احسان کم ہو گیا یہ بھی محض غلط ہے۔ ثواب خواہ کم ہو جاوے مگر احسان تو ویسا ہی ہے اور شاید اس مقام پر بعض کو یہ خیال ہو کہ ہم فلاں استاد کے بہت حقوق ادا کرتے ہیں تو تتبع سے یہ معلوم ہوا ہے کہ نرا استاد سمجھ کر حقوق ادا کم کرتے ہیں۔ جس استاد کے حقوق کچھ ادا ہوتے ہیں ان میں کوئی دوسرا احتمال بزرگی وغیرہ کا سمجھ کر ایسا کرتے ہیں دیکھنا یہ ہے کہ جہاں نری استادی ہو وہاں کیا ہوتا ہے۔ اگر وہاں بھی رعایت حقوق کی ہو تو قابل مدح وتحسین ہے اسی طرح بعض اساتذہ کو جاہ دینوی حاصل ہونے سے اس کی تعظیم وتکریم کی جاتی ہے وہ بھی کوئی دلیل شاگرد کی خوبی کی نہیں۔ وہ اس سے خود اپنی بڑائی کا سامان کرتا ہے۔ چنانچہ اگر استاد جاہ شہرت میں شاگرد سے کم ہوتا ہے۔ بعض ناخلف اپنے کو اس کی طرف منسوب کرتے ہوئے عار کرتے ہیں۔ اگر ایسے استاد کا بھی حق ادا کرے تو مبارک حالت اور قابل قدر ہے

شاگرد کے حقوق

اب بعد بیان حقوق وآداب معلم کے اسی طرز مذکور پر کچھ حقوق متعلم یعنی شاگرد وغیرہ کے بیان کرتا ہوں کہ اولاً بعض نصوص اور ثانیاً بعض جزئیات از قبیل واقعات مذکور ہونگے۔

آیتؑ: ادع الی سبیل ربك بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتی هی احسن۔

ترجمہ: بلا خدا کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ اور مناظرہ کر اچھا اور نرم طریق سے۔

شاگرد کے ساتھ نرمی اور ان کی استعداد کی رعایت کرنی چاہیئے | اس آیت سے نصاً معلوم ہوا کہ مستفیدین کے ساتھ اگرچہ وہ طالب نہ ہوں۔ کیونکہ آیت میں مدعوین ایسے ہی لوگ ہیں۔ رعایت ان کے مذاق و استعداد اور

رفق و ملاطفت کی رکھنا چاہیئے اور اگر طالب ہوں جیسے بالمعنی المتعارف طالب علم وغیرہم تو ان کے ساتھ تو رعایت مذکورہ نہایت درجہ ضروری ہیں ان کے ساتھ ابتدائی خطاب میں بھی مثلاً کتاب کی تقریر میں کما ادع میں بھی ابتدائی خطاب مراد ہے۔ اور ان کے سوالات کے جوابوں میں بھی خواہ تحقیقی جواب ہو یا الزامی کہ جادلہم سے یہی مقاولت مراد ہے۔

آیۃ ۱۱ کنتم خیر امتہ اخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنکر الاٰیتہ مع قولہ تعالیٰ السابق ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر الاٰیتہ۔

ترجمہ تم بہترین امت ہو لوگوں کی ہدایت کے واسطے پیدا کئے گئے ہو اچھی باتوں کا حکم کرتے ہو اور بری باتوں سے منع کرتے ہو۔ تم میں ایک گروہ ایسا ہونا چاہیئے کہ خیر کی طرف لوگوں کو بلائے۔

"لوگوں کو دینی نفع پہنچانا علماء پر واجب ہے" اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے علماء کو لوگوں کے نفع دینی پہنچانے کے لئے (کما یدل علی النفع الام وعلی تفسیرہ بالامر والنہی) پیدا کیا ہے اور یہ نفع پہنچانا ان پر واجب ہے (کما یدل علیہ صیغۃ الامر) پس اس صورت میں مستفیدین پر اپنا احسان سمجھ کر ان کو بے وقعت سمجھنا اور ان پر حکم چلانے میں حد سے تجاوز کرنا ان پر محض براہ کبر سختی کرنا نہایت نازیبا امر ہے وہ اگر اپنی خواہش سے استفادہ کرتے ہیں تو گویا ادائے واجب میں معلّم کے معین ہیں۔ پس ان کے ساتھ اقل درجہ ایسا معاملہ کرنا چاہیئے۔ جیسا اپنے معین فی الدنیا کے ساتھ معاملہ کیا جاتا ہے اور ان کے ساتھ ایسے طریقے سے پیش آنا چاہیئے جس سے ان کو نفع پہنچے (الذی ھو مقتضی الامر) اور ظاہر ہے کہ ایسی سختی یا بے وقعتی یا بے پروائی کی حالت میں ان کا نفع مفقود ہے۔ یا ناقص ہو جاتا ہے خصوص ان کے سوال کے جواب میں جب وہ سوال تعنت و عناد سے نہ ہو زجر میں شدت کرنا عموم ارشاد خداوندی واما السائل فلا تنہر یعنی سائل کو مت جھڑکیئے کے بھی خلاف ہے یا بدون ان کے کسی مصلحت کے محض اپنی بڑائی اور اس کی برائی ظاہر کرنے کو ان پر اس طرح احسان رکھنا اور اپنے احسان کو جتلانا کہ جس سے ان کی تحقیر یا ان کو اذیت ہو۔ آئندہ ارشاد خداوندی کے خلاف ہے۔

آیت ۱۲ ثم لا یتبعون ما انفقوا منا ولا اذی الاٰیۃ بعد تعمیم تفسیر قولہ۔

وممّا رزقناهم ينفقون كما نقله البيضاوي ومما رزقناهم من انوار المعرفة يفيضون۔

(ترجمہ) صدقہ دیکر احسان نہیں جتاتے اور نہ کسی قسم کی تکلیف دیتے ہیں اور جو ہم نے ان کو رزق دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں جیسا کہ نقل کیا اس کو بیضاوی نے یعنی جو ہم نے انوار معرفت ان کو عطا کئے ہیں لوگوں پر ان کا فیضان کرتے ہیں۔ ۱۲

طالب علم کے ساتھ بھلائی کرنے کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت

حدیث ۱؎ عن ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان الناس لکم تبع وان رجالا یأتونکم من اقطار الارض یتفقہون فی الدین فاذا اتوکم فاستوصوا بہم خیرا (رواہ الترمذی)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اور لوگ تمہارے تابع ہیں تمہارے پاس دور دراز ملکوں سے لوگ علم دین سیکھنے اور سمجھنے کو آویں گے ان کے بارے میں میری وصیت کے موافق بھلائی سے پیش آنا۔ (ترمذی)

اس حدیث سے صاف معلوم ہوا کہ جو شخص علم دین طلب کرنے کے لئے آوے اس کے حق میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیر کی اور حسن معاملہ کی وصیت فرماتے ہیں گو ابھی تحصیل بھی شروع نہیں کی اور بعد تحصیل کے تو اور بھی تعلقات وخصوصیات جو کہ مقتضیات زیادت وتاکید حقوق ہیں زائد ہوں گے۔

پس حقوق اور بھی کمًا وکیفًا کثیر اور قوی ہو جائیں گے اور چونکہ دوسرے نصوص سے صاحب افادہ کو تنگ کرنے کی ممانعت ثابت ہے۔ کما قال تعالیٰ ولا یضار کاتب ولا شہید آیۃ: یعنی لکھنے والے اور گواہ کو تکلیف نہ پہنچانا چاہیئے۔

اس سے یہ بھی مفہوم ہو گیا کہ طلباء کو بھی اپنی حوائج علمیہ وما یتعلق بہا کی درخواست معلمین اور مہتممین سے اسی درجہ تک کرنی چاہیئے کہ ان کو کلفت نہ ہو، یہ ان کے ذمہ واجب نہیں کہ جتنے طلباء آویں سب کے لئے طبق اور سبق کا انتظام ضرور ہی کر دیا کریں۔ البتہ بشرط سہولت اس کا انتظام اور پھر بعد کام شروع کر دینے کے ان کے مصالح علمیہ کی رعایت حسب حدیث ضروری ہے۔

کسی مقام کی غلط تقریر کرنا یا کسی سائل کو غلط مسئلہ بتلانا جائز نہیں

حدیث ۲۰ عن سمرۃ بن رضہ جندب و المغیرۃ بن رضہ شعبۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من حدث عنی بحدیث یری انہ کذب فھو احد الکاذبین (رواہ مسلم)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص میری طرف سے کوئی بات بیان کرے اور وہ جانتا ہو کہ وہ تو جھوٹ ہے وہ جھوٹا ہے (مسلم)

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ سبق کی تقریر میں غلط مطلب بتلا دینا یا مستفتی کو غلط مسئلہ بتلا دینا یہ حرام ہے۔ جیسا بعض مدرسین و مفتیین کی عادت ہے کہ طالب علم یا سائل سے اپنا جہل چھپانے کے لئے غلط سلط ہانک دیتے ہیں اور اگر طالب علم قبول نہیں کرتا اور کچھ خدشہ کرتا ہے۔ کبھی مغالطات و تلبیسات سے اور کبھی غضب اور سب و شتم سے اس کو خاموش کر دیتے ہیں۔ اتنا کہنے کی توفیق نہیں ہوتی کہ یہ مقام ہماری سمجھ میں نہیں آیا پھر سوچیں گے۔ یا یہ کہ دوسرے مدرس سے خود پوچھ لیں یا اس طالب علم ہی کو پوچھنے کی اجازت دیدیں اس سے عار آتی ہے حالانکہ یہ کوئی عار کی بات نہیں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون عالم ہوگا۔ آپ نے بہت سے سوالوں پر لاادری فرمادیا اور جب وحی نازل ہوئی اس وقت بتلا دیا اور واقعی جب احاطہ کل علوم کا خاصہ حق تعالیٰ جل شانہ کا ہے تو بعض چیزوں کا نہ جاننا ممکن کے لوازم سے ہے۔ تو اس لازم کا اگر اقرار کر لیا تو کون سی نئی بات ہوئی بلکہ واقع میں تو غیر معلومات عدد میں معلومات سے زیادہ ہی ہیں۔ قال تعالیٰ وما اوتیتم من العلم الا قلیلا۔

اور تم کو تو بہت تھوڑا علم دیا گیا۔

ایک حکایت میرے ایک ابتدائی کتب کے استاد علیہ الرحمۃ نے اپنی ایک حکایت بیان فرمائی تھی کہ انہوں نے کسی معلم سے فارسی پڑھنے کی درخواست کی انہوں نے کہا کہ، بھائی پڑھنے سے پہلے یہ سن لو کہ تم مجھ کو عالم الکل سمجھ کر پڑھنا چاہتے ہو یا عالم البعض اگر شق اول ہے تو بھائی مجھ کو معاف رکھو کیونکہ میں عالم الکل نہیں اور اگر ثانی ہے تو بے شک مجھ میں یہ صفت ہے لیکن اس کے مقتضا سے کبھی یہ بھی ہوگا کہ کسی مضمون کی نسبت یہ کہہ دوں گا کہ مجھ

کو معلوم نہیں تو مجھ کو پریشان مت کرنا اور دوسری جگہ حل کر لینا۔

سبحان اللہ کیسی پاکیزہ بات انہوں نے کہی۔ پس یہی سمجھنا ہر عالم پر ضروری ہے۔

اسی طرح اگر اولاً اپنی غلطی معلوم نہ ہوئی لیکن بعد تقریر کے از خود یا طالب متنبہ کرنے سے اطلاع ہو گئی تو چاہیئے کہ معاً اسی تقریر سے اپنا رجوع ظاہر کر دے ورنہ غلط تقریر کرنے میں یا غلطی پر اڑے رہنے میں چند خرابیاں ہیں۔ ایک تو گناہ جیسے حدیث موصوف سے معلوم ہوا، اور یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ یہ تو تصرف حدیث کے ساتھ خاص ہے۔ بات یہ ہے کہ جتنے علوم دینیہ ہیں۔ سب حکایت عن الرسول ہیں۔ خواہ لفظاً یا معناً (ومن ثم قیل ان القیاس مظہر لا مثبت)

اور جتنے علوم آلیہ ہیں وہ علوم دینیہ کے تابع ہیں۔ والتابع لہ حکم المتبوع

پس اس طرح سے اس حدیث کا مضمون تمام علوم مقصودہ ومبادی للمقصودہ کو عام ہے۔ پس غلط تقریر یا اس پر اصرار کرنے میں گناہ ہونا ان سب میں عام ہے۔ ایک خرابی یہ ہوئی۔

دوسری خرابی یہ ہے کہ اگر طالب علم کو معلوم ہو گیا کہ یہ تقریر غلط ہے تب تو طبعاً استاد سے تنفر اور اس کی تحقیر قلب میں پیدا ہو گئی اور اس کے ہوتے ہوئے پھر حقوق استادی کا ادا کرنا سخت دشوار ہے۔ تو یہ فعل استاد کا اخلال بالواجب کا سبب ہوا اور اعانت معصیت معصیت ہے اور اگر طالب علم کو پتہ نہ لگا تو وہ بے چارہ عمر بھر کے لئے جہل میں مبتلا رہا۔ پھر یہی سلسلہ آگے معلوم نہیں کہاں تک چلے گا۔ پھر اس وبال کی کوئی حد ہے۔ ذرا سی عار پر نار کو اختیار کرنا۔ کون عقل یا دین کی بات ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ استاد کے اخلاق اکثر تلمیذ میں سرایت کرتے ہیں۔ یہی ہٹ دھرمی اور سخن پروری کی صفت ذمیمہ اس میں پیدا ہو جاوے گی۔ اور استاد صاحب اس حدیث کے مصداق بنیں گے۔ من سن سنۃ سیئۃ فعلیہ وزرھا ووزر من عمل بھا من بعدہ الحدیث رواہ مسلم، یعنی جو شخص کوئی برا کام جاری کرتا ہے اس کو اس پر بھی گناہ ہوگا اور اس کے بعد جو بھی یہ کام کرے گا اس کا بھی گناہ ہوگا۔

بہر حال گناہ بھی اور شاگرد کے حقوق کی اضاعت بھی۔ گناہ کی تقریر ہو چکی اور اضاعت حقوق ظاہر ہے کہ اس کی خیر خواہی کے خلاف اس کے واجب کا اتلاف اس کے اخلاق کا افساد اس کو جہل میں مبتلا کرنا کہ ایک قسم کا غش اور خیانت ہے چنانچہ ذیل میں خصوص کے ساتھ اس سے تعرض ہے،

بغیر علم کے مسئلہ بتانا جائز نہیں

حدیث ۳۱ عن ابی هریرۃ رض قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من افتی بغیر علم کان اثمہ علی من افتاہ ومن اشار علی اخیہ بامر یعلم ان الرشد فی غیرہ فقد خانہ (رواہ ابوداؤد)

کسی سائل کو کسی نے بلا علم کے مسئلہ بتلا دیا تو اس کا وبال اس بتانے والے پر ہے۔ اور جس شخص نے اپنے بھائی مسلمان کو مشورہ دیا اور جانتا ہے کہ وہ مشورہ ٹھیک نہیں ہے تو اس نے اس کی خیانت کی۔ (ابوداؤد)

اس حدیث میں غلط مسئلہ بتلانے کا گناہ ہونا اور غلط بات بتلا دینے کا (جس میں دین کی بات بھی آگئی) خیانت ہونا صاف منصوص ہے۔

اگر کوئی بات معلوم نہ ہو تو کہہ دے کہ معلوم نہیں اپنی طرف سے نہ کہے

حدیث ۳۲ عن عبد اللہ رض قال یا ایہا الناس من علم شیئًا فلیقل بہ ومن لم یعلم فلیقل اللہ اعلم فان من العلم ان یقول لما لا یعلم اللہ اعلم قال اللہ تعالیٰ قل ما اسئلکم علیہ من اجر وما انا من المتکلفین متفق علیہ۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رض نے فرمایا کہ اے لوگو جو شخص کسی بات کا علم رکھتا ہو تو اس کو چاہیئے کہ بتادے اور جو نہ جانتا ہو اس کو چاہیئے کہ کہدے کہ اللہ جاننے والا ہے۔ کیونکہ یہ کہدینا بھی علم کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے نبی کہدو کہ میں تم سے کچھ مزدوری نہیں مانگتا اور نہ میں تکلیف کرنے والوں میں سے ہوں (کہ اپنی طرف سے کچھ نہ کچھ کہہ دوں)۔ رواہ البخاری ومسلم۔

اس حدیث میں صریح تاکید ہے کہ جو بات معلوم نہ ہو کہہ دے کہ معلوم نہیں۔ پس تقریر سبق میں بھی اس پر عمل کرنا عالم اور طالب علم دونوں کا حق ہے۔

شاگردوں کے نشاط و شوق باقی رکھنے کی بھی رعایت کرنی چاہئے

حدیث ۵ عن شفیق قال کان عبد اللہ بن مسعود رض یذکر الناس فی کل خمیس فقال لہ رجل یا ابا عبد الرحمٰن لوددت انک ذکرتنا فی کل یوم قال اما انہ یمنعنی من ذالک انی اکرہ ان امکلم وانی اتخولکم بالموعظۃ کما کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یتخولنا بہا مخافۃ السامۃ علینا متفق علیہ۔

حضرت عبداللہ ابن مسعود رض ہر جمعرات کو وعظ سنایا کرتے تھے کسی شخص نے عرض کیا کہ حضرت روز وعظ کیجئے۔ تو آپ نے فرمایا کہ مجھے روز وعظ کہنے سے یہ امر مانع ہے کہ میں تم کو ملول نہیں کرنا چاہتا اور تمہاری خبرگیری اور نگہداشت ایسی ہی کرتا ہوں جیسی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ہماری خبرگیری فرمایا کرتے تھے کہ ہم ملول نہ ہوں (بخاری و مسلم)

اس حدیث سے مستفیدین للعلوم کا ایک حق یہ معلوم ہوا کہ ان کے نشاط و شوق کے باقی رکھنے کو بھی رعایت کرے پس اس میں یہ بھی داخل ہو گیا۔ سبق اتنا نہ پڑھاوے اسی طرح کتابیں اتنی نہ شروع کراوے کہ اکتا جاویں۔ اور اگر وہ اس مقدار کی متحمل بھی نہ ہوں یعنی اس کا مطالعہ اور تکرار و ضبط دشوار ہو تو بدرجہ اولی محل منع ہوگا اسی طرح وقت میں اس کی رعایت کریں کہ ان کی طبیعت تازہ ہو، کھانے کا تقاضا کسل اور اسی طرح نیند کا غلبہ یا اور کسی سبب سے دماغ پریشان نہ ہو جیسے بعض مدرسین طلبہ کو ان امور کے اہمال سے اس قدر زچ کر دیتے ہیں کہ یا تو وہ بھاگ جاتے ہیں یا استعداد حاصل نہیں ہوتی اور وہ اسی میں مست ہیں کہ ہم طلبہ کے ساتھ خوب محنت کرتے ہیں حالانکہ وہ سب محنت اکارت جاتی ہے اسی کی نظیر ہے۔ ارشاد حق تعالیٰ کا یہ مضمون " الذین ضل سعیہم فی الحیٰوۃ الدنیا وہم یحسبون انہم یحسنون صنعا۔ الآیۃ

(ترجمہ) یہ وہ لوگ ہیں جن کی دنیا میں کی کرائی محنت سب گئی گذری ہوئی اور (وہ بوجہ جہل کے) اسی خیال میں ہیں کہ وہ اچھا کام کر رہے ہیں)

اسی طرح ہفتہ میں کم از کم ایک روز کی تعطیل ہونا ضرور ہے۔ بعضے تعطیل میں بھی طالب علموں کی جان مارتے ہیں اور اس کو اپنی بڑی کارگزاری سمجھتے ہیں۔

ع دوستی بے خرد چوں دشمنی است

نااہلوں کا دینی خدمات کا متولی بننا قیامت کی علامت ہے۔

حدیث ۶ عن ابی ہریرہؓ فی حدیث طویل قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا وسد الامر الی غیر اھلہ فانتظر الساعۃ (بخاری)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب دینی خدمات نالائقوں اور نااہلوں کے سپرد ہوجاویں تو قیامت کا انتظار کرنا چاہیئے۔ (بخاری)

اس حدیث کے عموم میں یہ بھی داخل ہوگیا کہ اگر کسی طالب علم کا کوئی سبق کسی دوسرے کے سپرد کرے تو اس کا لحاظ رکھے کہ وہ شخص اس کا اہل ہو اگر ناقابل و بد استعداد یا غیر شفیق کو سپرد کرے گا تو شرعاً مذموم ہوگا یہ بھی شاگرد کا ایک حق ہے۔

شاگرد کے تین حقوق

حدیث ۷ عن عبد اللہ ابن عمرؓ قال تخلف عنا النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی سفرۃ سافرناھا فادرکنا وقد ارھقتنا الصلوۃ ونحن نتوضا فجعلنا نمسح علی ارجلنا فنادی باعلی صوتہ ویل للاعقاب من النار مرتین او ثلاثا (رواہ البخاری)

حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی سفر میں ہم سے پیچھے رہ گئے آپ ہم سے ایسے وقت آکر ملے کہ نماز کا وقت آگیا تھا اور ہم وضو کر رہے تھے۔ جلدی کی وجہ سے ہم نے پاؤں دھونے میں بہت جلدی کی کہ کچھ سوکھا رہ گیا آپ نے دیکھ کر دو تین بار فرمایا خبردار ہو جاؤ عذاب دوزخ ان ایڑیوں کے لئے ہے جو سوکھی رہ جاویں (بخاری)

اس حدیث سے تین حق شاگردوں کے ثابت ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ صرف ان کے تعلیم علوم ہی پر اکتفا نہ کرے بلکہ ان کے اعمال و اخلاق کی بھی حتی الامکان نگرانی رکھے جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض لوگوں کے پاؤں کے خشک رہ جانے پر متنبہ فرمایا۔ اور یہ باب بالکل ہی مسدود ہوگیا ہے۔ اساتذہ صرف سبق پڑھا دینے کو ضروری سمجھتے ہیں۔ تعلیم کے ساتھ تربیت کی طرف توجہ نہیں فرماتے اور عملی غلطی پر متنبہ نہ کرنا تو اور بھی غضب ہے کیونکہ اس کا تو انہوں نے بالتصریح التزام کیا ہے جیسا بعض معلمین قرآن کی عادت دیکھی گئی ہے کہ شاگرد پہلو میں بیٹھا ہوا غلط پڑھ رہا ہے اور یہ بہرے گونگے بنے بیٹھے ہیں۔ اور اس سے بدتر یہ ہے کہ بعضے اساتذہ شاگردوں سے ایسے کام لیتے

ہیں کہ ان کے اخلاق اور تباہ ہوتے ہیں تو اگر اصلاح نہ کرے تو فساد تو نہ کرے۔

دوسرے یہ کہ اگر کسی وجہ سے احتمال ہو کہ بدون آواز بلند کئے ہوئے آواز نہ پہنچے گی مثلاً حلقہ درس بڑا ہے یا اور کوئی عارض ہے تو بلند آواز سے تقریر کرنا حق ہے شاگرد کا۔ ورنہ تقریر ہی بیکار رہے دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح باآواز بلند فرمایا۔

تیسرے اگر احتمال ہو کہ ایک بار تقریر کرنے سے طلبا رنے نہ سمجھا ہوگا تو دوسری تیسری بار بھی تقریر کر دینا مناسب ہے۔ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو تین بار فرمایا۔

اور آئندہ حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی عادت مستمرہ ہونا معلوم ہوتا ہے۔ حدیث

۸ عن انس رض انہ کان اذا تکلم بکلمۃ اعادھا ثلاثۃ حتی تفھم عنہ (رواہ البخاری)

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی بات مہتم بالشان فرماتے تھے تو تین مرتبہ فرماتے تھے کہ لوگ خوب سمجھ لیں (بخاری)

یہ حدیث فائدہ ثالثہ مذکورہ حدیث سابق میں نص ہے۔

کبھی کبھی شاگرد سے امتحان بھی لینا چاہیئے

حدیث ۹ عن عبد اللہ ابن عمر رض قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان من الشجرۃ شجرۃ لا یسقط ورقھا وانھا مثل المسلم فحدثونی ماھی فوقع الناس فی شجر البوادی، قال عبد اللہ رض ووقع فی نفسی انھا النخلۃ فاستحییت ثم قالوا حدثنا ماھی یا رسول اللہ قال ھی النخلۃ (رواہ البخاری)

حضرت عبد اللہ ابن عمر رض فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فرمایا کہ ایک ایسا درخت ہے کہ وہ پت جھڑ نہیں ہوتا اور مثل مسلم کے ہے۔ بتاؤ وہ کیا ہے۔ سب لوگ جنگل کے درختوں کو سوچنے لگے کہ کون سا درخت اس شان کا ہے۔ میرے دل میں آیا کہ یہ کھجور کا درخت ہے مگر چونکہ میں چھوٹا تھا اس لئے میں نے حیا کی اور چپ رہا پھر لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ارشاد فرمایئے کہ کون سا درخت ہے تو آپ نے فرمایا کھجور کا درخت (بخاری)

اس حدیث سے طلبار کے امتحان لینے کی محمودیت نکلتی ہے جس کے فوائد مشاہد ہیں۔ پس ان فوائد کے اہتمام کے لئے امتحان لینا یہ بھی منجملہ حقوق تلامذہ ہے۔

تعلیم میں شاگرد کی استعداد کا لحاظ رکھنا چاہیئے

حدیث: قال علی حدثوا الناس بما یعرفون اتحبون ان یکذب اللہ ورسولہ (رواہ البخاری)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ لوگوں سے ایسی بات کرو جو وہ سمجھیں کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی تکذیب کریں (بخاری)

اس حدیث سے ایک یہ بات معلوم ہوئی کہ طالب علم کی تعلیم میں اس کے فہم و استعداد کا لحاظ رکھے اور اسی کے لحاظ سے ترتیب کتب و مقدار و عدد سبق تجویز کرے جیسا کہ ارشاد حق کونوا ربانیین کی ایک تفسیر امام بخاری نے یہ بھی نقل کی ہے۔ الذی یربی الناس بصغار العلم قبل کبارہ۔ حدیث آئندہ سے بھی مرفوعاً اس کی اصل نکلتی ہے۔

کوئی فن یا کوئی کتاب کسی خاص طالب علم کیلئے مضر ہو تو اس کو اس سے روکنا چاہیئے

حدیث: عن انس رض قال ذکرلی ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لمعاذ رض من لقی اللہ لا یشرک بہ شیئاً دخل الجنۃ قال الا ابشر بہ الناس قال لا انی اخاف ان یتکلوا (رواہ البخاری)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رض سے فرمایا کہ جو شخص مرے اور خدا سے ملے۔ اور وہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ سمجھتا ہو تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔ حضرت معاذ رض نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا لوگوں کو یہ خوشخبری نہ سناؤں۔ فرمایا کہ مت سناؤ۔ کیونکہ میں خوف کرتا ہوں کہ اس پر تکیہ کرلیں گے۔ (بخاری)

یہ حدیث نص ہے اس میں کہ باوجود کہ یہ مضمون من لقی اللہ الخ کا مقاصد عظیمہ شرعیہ سے تھا مگر بعض لوگوں تک اس کا پہنچنا اس لئے پسند نہیں کیا گیا کہ وہ اس سے متضرر ہوتے پس اسی طرح جو کتاب یا کوئی فن کسی خاص طالب علم کے لئے نامناسب ہو اس کو اس سے روکنا بذمہ معلم لازم ہے اور اس طالب علم کو بھی اس میں اطاعت ضروری ہے۔
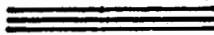
شاگردوں کے ساتھ نرمی اور آسانی کا معاملہ کرنا چاہیئے

حدیث ۱۲۷ عن انس رضہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال یسروا ولا تعسروا وبشروا ولا تنفروا رواہ البخاری

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دینی امور میں لوگوں سے آسانی کرو تکلیف میں مت ڈالو خوش خبری سناؤ۔ دین سے نفرت مت دلاؤ (بخاری)

اس حدیث کے عموم سے معلوم ہوا کہ طالب علم کے ساتھ درس میں بھی تیسیر و عدم تنفیر کی رعایت رکھے۔ تقریر بھی ایسی صاف و سلیس کرے جو ذہن نشین ہو جاوے۔ و مقدار و اعداد سبق میں بھی اس پر زیادہ بار نہ ڈالے اسی طرح ایک حق یہ بھی معلوم ہوا کہ تنبیہ و تادیب میں اتنی سختی نہ کرے کہ شاگرد کو وحشت ہو جاوے اس میں میاں جی لوگ بکثرت مبتلا ہے۔

شاگرد کے لئے اللہ تعالیٰ سے علم نافع کی دعا بھی کرنی چاہیئے

حدیث ۱۲۸ عن ابن عباس رض قال ضمنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اللھم علمہ الکتاب (رواہ البخاری)

حضرت ابن عباس رض فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو سینہ سے لگالیا اور یوں فرمایا کہ یا اللہ اس کو قرآن کا علم عطا فرمادے (بخاری)

اس حدیث سے شاگرد کا حق علاوہ تعلیم کے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کے لئے حق تعالیٰ ایک سے دعا بھی کیا کرے کہ اس کو علم نافع عطا ہو۔

شاگرد کی دلجوئی کے متعلق ایک مثال

حدیث ۱۲۹ عن ابن عمر رض قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ یقول بینما انا نائم اتیت بقدح لبن فشربت حتی انی لاری الری یخرج فی اظفاری ثم اعطیت فضلی عمر بن الخطاب قالوا فما اولت یارسول اللہ قال العلم (رواہ البخاری)

حضرت ابن عمر رض فرماتے ہیں کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرماتے تھے کہ خواب میں مجھے ایک پیالہ دودھ کا دیا گیا میں نے خوب سیر ہو کر پیا کہ ناخن تک سیرابی کا اثر محسوس ہوا پھر میں نے بچا ہوا دودھ عمر رض کو دیدیا۔ لوگوں نے عرض کیا کہ حضور اس کی تعبیر کیا ہوئی

فرمایا دودھ سے مراد علم ہے (بخاری)

اس حدیث سے دو امر معلوم ہوئے ایک باعتبار صورت لبن کے ایک باعتبار معنی لبن کے اول یہ کہ شاگرد کو گاہ گاہ اپنے کھانے پینے میں بھی شریک کرلیا کرے کہ اس کا دل بڑھتا ہے۔ اور محبت زائد ہوتی ہے جس قدر اس کو استاد سے محبت ہوگی اسی قدر علم میں برکت ہوگی۔

دوسرا یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی کو کوئی باطنی برکت عطا فرماوے تو شاگرد سے اس کو دریغ نہ کرے۔ غرض غذا ظاہری و باطنی کا کچھ حصہ اس کو بھی دیدے۔

اگر کوئی بات غصہ کی صورت میں کہنے سے شاگرد کیلئے بہتر ہو تو اس صورت میں کہے

حدیث ۱۵ عن

ابی مسعود الانصاری رض قال قال رجل یا رسول اللہ لا اکاد ادرک الصلوٰۃ مما یطول بنا فلان فما رایت النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی موعظۃ اشد غضبا من یومئذ فقال یا ایہا الناس انکم منفرون فمن صلی بالناس فلیخفف فان فیہم المریض والضعیف وذا الحاجۃ (رواہ البخاری)

حضرت ابو مسعود انصاری رض نے کہا کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ فلاں شخص نماز طول کرنے کی وجہ سے قریب ہے کہ میں نہ پا سکوں (یعنی بددل ہوکر جماعت چھوڑ دوں) تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر برافروختہ ہوئے کہ ایسے کبھی میں نے برافروختہ ہوتے آپ کو نہ دیکھا۔ پھر آپ نے فرمایا کہ تم لوگوں کو نفرت دلاتے ہو۔ جو آدمی نماز میں امامت کرے اس کو چاہیئے کہ (قرأت) تخفیف کرے کیونکہ مریض اور ضعیف اور حاجت مند سب قسم کے لوگ نماز میں ہوتے ہیں (بخاری)

اس حدیث سے دو امر متعلق طالب علموں کے ثابت ہوئے۔ ایک یہ کہ اگر کچھ اسباق کسی اپنے شاگرد یا ماتحت مدرس کے سپرد کئے جاویں اور وہ طالب علم اس کی شکایت کرے تو شکایت سننا چاہیئے اور تحقیق کے بعد اس کا انتظام کرنا چاہیئے یہ نہیں کہ محض اس کے طالب علم ہونے کے سبب اس کو اور اس کی بات کو محض لاشئے سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاوے۔

دوسرے یہ کہ اگر کسی طالب علم سے کوئی امر نامناسب صادر ہو اور کسی طور سے معلوم ہو جاوے

یہ غضبناک ہو کر کہنے سے زیادہ نفع ہوگا۔ تو وہاں اس کی مصلحت کے واسطے غصہ ہی کرنا افضل ہے۔

جس سے اس کی اصلاح کامل ہو جاوے۔

اگر مصلحت ہو تو تقسیم اوقات اور جماعت بندی کی جا سکتی ہے

حدیث ۱۶۔ عن ابی سعید الخدری رض

قال قال النساء للنبی صلی اللہ علیہ وسلم غلبنا... الرجال فاجعل لنا یوماً من نفسک فوعدھن یوماً ولقیھن فیہ فوعظھن وامرھن الحدیث (رواہ البخاری)

حضرت ابوسعید خدری رض سے روایت ہے کہ عورتوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم پر مرد غالب ہو گئے کہ آپ کا وعظ سننے کا موقع ہم کو نہیں ملتا۔ ہمارا بھی ایک دن مقرر کر دیجئے۔ آپ نے ان کے لئے وعظ و نصیحت اور احکام الہیٰ سنانے کا ایک دن مقرر فرمایا (بخاری)

اس حدیث سے تعیین و تقسیم اوقات و جماعت بندی طلباء کا مصلحت ہونا معلوم ہوتا ہے۔ جن میں سے ایک عظیم مصلحت یہی ہے کہ ہر ایک کے لئے جدا سبق مناسب ہے۔ تو سب ایک میں کیسے مجتمع ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ مورد حدیث میں ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ بعض احکام خاص عورتوں ہی کے مناسب ہوتے ہیں۔ وہ مستقل خطاب میں اچھی طرح مفہوم اور اوقع فی النفس ہوتے ہیں

اگر استاد کو کسی ایک بات پر غصہ آجائے تو دوسری بات پر اس کا اثر نہ رہنا چاہیئے۔

حدیث ۱۷۔ عن زید بن خالد الجھنی رض فی حدیث طویل بعد السوال عن لقطۃ الابل وغضبہ صلی اللہ علیہ وسلم قال فضالۃ الغنم قال (صلی اللہ علیہ وسلم) لک ولاخیک او للذئب۔ (رواہ البخاری)

حضرت زید بن خالد جہنی رض سے ایک طویل حدیث میں اونٹ کے لقطہ کے سوال پر آپ غصہ ہونے کے بعد یہ الفاظ بھی مذکور ہیں کہ سائل نے عرض کیا کہ کھوئی ہوئی بکری کا کیا حکم ہے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ بکری تیرے لئے ہے یا تیرے بھائی کے لئے یا بھیڑیا کے لئے (بخاری)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کسی طالب علم پر کسی بیڈھنگے سوال پر غصہ کیا جاوے اور اس

کے بعد پھر وہ کوئی معقول سوال کرے تو اس کے جواب میں پہلے غصّے کا اثر نہ آنا چاہیئے اور اس سے زیادہ اثر نہ رکھنے کا محل وہ ہے کہ جب دوسرا طالب علم کوئی بات پوچھنے لگے۔ وہاں تو بدرجہ اولیٰ پہلا اثر نہ آنے پاوے۔ بعض جھلے مزاج کے استاد ایک پر خفا ہوئے تو بس اب ختم درس تک سب ہی پر برستے رہیں گے۔

حدیث ۱۸، ان عائشۃ رض زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کانت لاتسمع شیئًا لاتعرفہ الا راجعت فیہ حتی تعرفہ وان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال من حوسب عذب قالت عائشۃؓ فقلت اولیس یقول اللہ عزوجل فسوف یحاسب حسابًا یسیرًا قالت فقال انما ذالک العرض ولکن من نوقش الحساب یھلک (رواہ البخاری)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی باتیں سنتی تھیں کہ جو ان کو معلوم نہ ہو تو برابر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ گچھ کرتی تھیں یہاں تک کہ سمجھ لیتی تھیں۔ ایک مرتبہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص حساب میں گرفتار رہا وہ عذاب میں مبتلا ہوا۔ تو حضرت عائشہ رض نے عرض کیا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے یوں نہیں فرمایا کہ حساب آسان کیا جائے گا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ پیشی ہے ورنہ جس سے مناقشہ کیا گیا حساب میں وہ ہلاک ہوگیا (بخاری)

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ اگر استاد کی تقریر میں کوئی شبہ رہے اور طالب علم اس کو پوچھنے لگے تو نازک مزاج سے ناخوش نہ ہو البتہ اگر فضول سوال ہو تو ناخوشی کا اظہار بھی جائز ہے۔ جیسا کہ اوپر حدیث میں لقطہ ابل کے سوال پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا برہم ہونا مذکور ہے۔

اگر طالب علم کے فہم یا حفظ کی کوئی تدبیر معلوم ہو تو کرنی چاہیئے

حدیث ۱۹ عن ابی ھریرۃ رض قال قلت یارسول اللہ انی اسمع منک حدیثًا کثیرًا انساہ قال ابسط ردائک فبسطتہ فغرف بیدیہ ثم قال ضم فضممتہ فما نسیت شیئًا بعد (رواہ البخاری)

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں آپ سے بہت سی حدیثیں سنتا ہوں مگر بھول جاتا ہوں آپ نے فرمایا کہ اپنی چادر پھیلا۔ میں نے چادر پھیلادی تو آپ نے اپنے دونوں ہاتھ

اس پر لگا دیئے اور فرمایا کہ اس چادر کو اپنے سینہ سے لگالے میں نے اس کو اپنے سینہ سے لگا لیا تو اس کی برکت سے پھر کچھ نہ بھولا (بخاری)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ طالب علم کے فہم یا حفظ کی کوئی تدبیر اگر اپنے علم و قدرت میں ہو تو مقتضار شفقت یہ ہے کہ اس کے مشورہ اور سعی کا اہتمام فرماوے۔

حدیث ۲۰ شاگرد کے سوال کے جواب میں اگر ضروری اور مفید باتوں کا اضافہ ہوسکے تو کرے

عن ابن عمرؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان رجلاً سارما یلبس المحرم فقال لا یلبس القمیص والعمامة ولا السراویل ولا البرنس ولا ثوباً مسه الورس او الزعفران فان لم یجد النعلین فیلبس الخفین ولیقطعهما حتی یکون تحت الکعبین (رواہ البخاری)

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ محرم میں کیا کپڑا پہنے، فرمایا کہ کرتہ اور عمامہ اور پاجامہ اور باران کوٹ اور ورس و زعفران کا رنگا ہوا نہ پہنے جوتہ نہ ہو تو موزے پہنے اور ان کو جوتہ کی طرح کاٹ لے کہ ٹخنہ سے نیچے رہیں (بخاری فی باب من اجاب السائل باکثر مما سالہ)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر طالب علم کوئی بات پوچھے مگر کوئی اور ضروری بات پوچھنے سے رہ جاوے تو شفقت کا مقتضا یہ ہے کہ صرف اس کے سوال کے جواب پر اکتفا نہ کرے بلکہ وہ دوسری بات از خود بتلا دے۔

یہاں تک یہ بیس حدیثیں اس باب میں ہوئیں اور اتفاق سے ان حدیثوں کا عدد حقوق معلم متعلقہ حدیثوں سے مضاعف بلا قصد ہو گیا۔ جس میں ایک قدرتی نکتہ خیال میں آیا کہ بندہ نے تمہید میں عرض کیا تھا کہ اضاعت حقوق تلامذہ میں زیادہ ابتلاء ہے تو قدرتی انتظام اس کی اصلاح کا یہ ہوا کہ اس کے دلائل کا عدد بھی مضاعف ہو گیا۔ کیونکہ تکثیر دلائل سے تنبیہ کا زیادہ ہونا امر طبعی ہے اور یہ محض نکتہ ہے پس اس پر شبہ نہ کیا جاوے کہ پھر حقوق مشترکہ تعلم کے دلائل میں اس سے بھی تضاعف ہونا چاہیئے۔ سو اول تو یہ نکتہ ہے اس کا اطراد ضروری نہیں دوسرے جتنے تعلقات استاد و شاگرد کے قوی ہیں اتنی قوت اس حق اخیر کو ہے بھی نہیں۔ تو حق اقوی

زیادہ احق ہے زیادت تنبیہ کا اور ہر چند کہ بعد سوق احادیث مثل باب اول یعنی بیان حقوق معلم یہاں بھی واقعات جزئیہ کے طرز پر کچھ مضمون ہونا چاہیے تھا چنانچہ اس باب ثانی کے اول میں اس کا وعدہ بھی ہے اور اس وقت ارادہ بھی تھا لیکن اتفاق سے جو جو کچھ اس کے ضمن میں لکھتا وہ بذیل احادیث مذکورہ مذکور ہو چکا اس لیے اس باب ثانی کو ختم کر کے اب باب ثالث یعنی حقوق شرکاء فی التعلیم کے متعلق بقدر ضرورت عرض کرتا ہوں اور عجب نہیں کہ اس میں بھی سوق دلائل اور اس کے ضمن میں واقعات کا آجانا کافی ہو جاوے۔ (والدلائل ھذا)

"ساتھیوں کے حقوق"

آیت ۱ ۔ قال اللہ تعالیٰ واعبدوا اللہ (الیٰ قولہ) والصاحب بالجنب الآیۃ

عبادت کرو اللہ کی اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرو اور اپنے قرابتیوں اور یتیموں اور فقیروں اور قرابتی ہمسایہ اور راجنی ہمسایہ اور جو تمہارا ہم صحبت پاس بیٹھنے والا ہو ان سب کے ساتھ احسان کرو۔

اس آیت سے شرکاء تعلم کا حق دو طرح ثابت ہوتا ہے۔ ایک اس لفظ سے والجار الجنب اور دوسرا اس لفظ سے والصاحب بالجنب، کیونکہ اس کا جار ہونا بھی ظاہر ہے اور صاحب بالجنب ہونا بھی ظاہر ہے۔ چنانچہ مفسرین نے شریک فی التعلم کے ساتھ اس کی تفسیر بھی کی ہے

ہمسایہ دینی بھائی ہے لہٰذا اس سے بھائیوں جیسا معاملہ کرنا چاہیے

آیت ۲ ۔ واعتصموا بحبل اللہ جمیعًا ولا تفرقوا واذکروا نعمت اللہ علیکم اذ کنتم اعداءً فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا الآیۃ۔

اللہ تعالیٰ کی رسی کو اکٹھے ہو کر مضبوط پکڑ لو اور متفرق مت ہوا ور یاد کرو اللہ تعالیٰ کی نعمت کو جو تم پر ہے جب تم آپس میں دشمن تھے پھر اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی اور تم اس کی نعمت سے بھائی ہو گئے اور تم دوزخ کے کنارے پر تھے تم کو اللہ تعالیٰ

نے اس سے بچایا۔ الخ

ظاہر ہے کہ تعلم علوم دینیہ اعتصام بحبل اللہ ہے۔ اور یہاں ایسی جماعت صحابہ کو اخوان فرمار ہے ہیں کہ وہ معتصم بحبل اللہ اور تعلم دین میں شریک تھے جب یہ اعتصام اور شرکت مقتضی ہوگئی اخوۃ کو پس جو حقوق اخوان کے ہوں گے وہ اس تعلق میں بھی قابل رعایت ہوں گے۔

ساتھیوں کے ساتھ رعایت کرنے کا حکم

آیت ۲۲ یاایھا الذین آمنوا اذا قیل لکم تفسحوا فی المجالس فافسحوا یفسح اللہ لکم واذا قیل انشزوا۔ الآیتہ

(ترجمہ) جب کہا جاوے تم کو کشادگی کردو مجلس میں تو فوراً کشادگی کردو اللہ تعالیٰ تمہارے لئے کشادگی کردے گا۔ (یعنی دنیا و آخرت میں) اور جب کہا جاوے تم کو اٹھ کھڑے ہو تو اٹھ کھڑے ہو درجے بلند کردے گا۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے جو تم میں سے ایمان لائے اور ان لوگوں کے جن کو علم دیا گیا اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں سے خبردار ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ شرکا رتعلم کو بیٹھنے کی جگہ دینے کے لئے اہتمام کرنا چاہئیے جو امکان میں ہو۔

اگر کسی عذر کی بنا پر کوئی ساتھی سبق میں نہ آسکے تو دوسرے کو چاہیئے کہ ناغہ شدہ سبق اس کو تکرار کرد ے

حدیث ۱۰۔ عن عمر رضہ قال کنت انا وجارلی من الانصار فی بنی امیۃ بن زید وھی من عوالی المدینۃ وکنا نتناوب النزول علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ینزل یوما وانزل یوما فاذا نزلت جئتہ بخبر ذالک الیوم من الوحی وغیرہ واذا نزل فعل مثل ذالک (رواہ البخاری)

حضرت عمر رضہ فرماتے ہیں کہ میں اور ایک شخص میرا پڑوسی انصاری عوالی مدینہ میں کچھ فاصلہ پر رہا کرتے تھے اور باری باری جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے ایک دن میں اور ایک دن وہ جس دن میں جاتا تو جو سن کر آتا اس سے بیان کردیتا۔ اور

جس دن وہ جاتا تو جو سن کر آتا مجھ سے بیان کر دیتا (بخاری)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اپنا شریک فی التعلم اگر کسی سبق میں حاضر نہ ہو تو ناغہ شدہ سبق کا اس کو تکرار کر دیا جاوے اور یہ اس کا حق ہے اور یہاں سے مدارس میں باری باری پڑھنے کی بھی اصل نکلتی ہے۔

حدیث ۲۲۔ عن ابی شریح فی حدیث طویل قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولیبلغ الشاھد الغائب (رواہ البخاری)

حضرت ابو شریح رض سے ایک طویل حدیث میں روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ احکام بیان فرمائے اور بعد میں فرمایا کہ جو لوگ حاضر ہیں اور وعظ سنا ہے وہ غائبوں کو پہنچا دیں (بخاری)

اس حدیث سے بھی مثل حدیث سابق حق بالا ثابت ہوتا ہے۔

مجلس میں بعد میں آنے والوں کے متعلق نصیحت

حدیث ۲۳ عن ابی واقد اللیثی رض ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بینما ھو جالس فی المسجد والناس معہ اذ اقبل ثلثۃ نفر فاقبل اثنان الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وذھب واحد قال فوقفا علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاما احدھما فرای فرجۃ فی الحلقۃ فجلس فیھا واما الآخر فجلس خلفھم واما الثالث فادبر ذاھبا فلما فرغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال الا اخبرکم عن النفر الثلاثۃ اما احدھما فاوی الی اللہ واما الآخر فاستحی فاستحی اللہ منہ واما الآخر فاعرض فاعرض اللہ عنہ (رواہ البخاری)

حضرت ابو واقد لیثی رض سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مع کچھ آدمیوں کے مسجد میں تشریف فرما تھے کہ ناگاہ تین آدمی آئے دو تو مجلس میں بیٹھ گئے۔ ایک کنارہ پر سب کے پیچھے اور ایک مجلس میں کشادگی پاکر اندر بیٹھ گیا اور تیسرا چلا گیا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فارغ ہوئے تو فرمایا کہ کیا ان تین شخصوں کے حال کی اطلاع نہ دوں ایک شخص نے تو اللہ کی طرف ٹھکانہ ڈھونڈا اللہ تعالیٰ نے اس کو ٹھکانہ دیدیا۔ ایک نے شرم کی اور کنارہ پر بیٹھ گیا۔ اللہ نے اس سے شرم کی اور تیسرے نے اللہ سے اعراض کیا تو اللہ نے بھی اس سے اعراض کیا (رواہ البخاری)

اس حدیث سے شرکاء مجلس علم کا یہ حق معلوم ہوا کہ بعد میں آنے والے کو چاہیئے کہ دیکھ لے کہ حلقہ میں گنجائش ہے یا نہیں اگر گنجائش ہو تو برابر میں بیٹھ جانا مضائقہ نہیں ورنہ لوگوں کو پریشان نہ کرے ان کے پیچھے بیٹھ جاوے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ پیچھے بیٹھنے سے عار کرنا سبب ہے اعراض حق تعالیٰ کا۔ (بخاری)

اگر کوئی ساتھی دیر سے آوے تو اس کو جگہ دینا چاہیئے

حدیث ۱۷۔ عن واثلۃ بن الخطاب قال دخل رجل الیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھو فی المسجد قاعد فتزحزح لہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان فقال الرجل یا رسول اللہ ان فی المکان لسعۃ وقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم للمسلم لحقا اذا راٰہ اخوہ ان یتزحزح لہ (رواہ البیھقی فی شعب الایمان)

حضرت واثلہ بن خطاب سے روایت ہے کہ ایک شخص جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا آپ مسجد میں تشریف فرما تھے آپ اس کے لئے ذرا سرکے کہ جگہ فراغ ہو جائے تو اس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ جگہ وسیع ہے تو آپ نے فرمایا کہ مسلمان کا مسلمان پر حق ہے کہ جب اس کو دیکھے تو اس کے لئے کچھ ہلے اور جنبش کرے (شعب الایمان للبیہقی)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ شریک فی التعلم کا بدرجہ اولیٰ یہ حق ہے کہ اس کے آنے کے وقت فوراً اس کو بیٹھنے کی جگہ دے بعض طلباء اس میں بہت مروتی کرتے ہیں۔

حدیث ۱۸۔ عن علی رضؓ بن ابی طالب قال کنت رجلاً مذاءً فامرت المقداد ان یسأل النبی صلی اللہ علیہ وسلم فسألہ فقال فیہ الوضوء (رواہ البخاری)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ مجھ کو مذی بہت آتی تھی (اس کا مسئلہ پوچھنا تھا خود) تو (یہ بسبب شرم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا نہیں) حضرت مقداد رضؓ سے کہا کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھو۔ حضرت مقدادؓ نے پوچھا تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مذی نکلنے سے وضوء آتا ہے (یعنی غسل نہیں آتا) بخاری)

اس حدیث سے یہ حق معلوم ہوا کہ اگر کوئی اپنا ہم سبق استاد سے کوئی بات پوچھتا ہوا شرماوے اور اس سے پوچھنے کی درخواست کرے تو خود غرضی کو چھوڑ کر پوچھ لے البتہ اگر نا معقول سوال ہو تو عذر کر دے یا استاد کسی مصلحت سے کہے کہ جس کا سوال ہے وہ خود کرے تو اس وقت اسی

پر عمل کرے یہ تو چند نصوص قناعت اجمالیہ طالب کے لئے اس باب میں نقل کر دیئے گئے ہیں باقی اس کی تفصیل و تکمیل کے لئے حضرات صحابہ رض کا طرز عمل باب معاشرت میں دیکھ لینا کافی ہے۔ اب تو ادائے حقوق تو در کنار بعضے سلسلوں میں تو مصرع ۔

مرا بخیر تو امید نیست بد مرسان

پر بھی عمل نہیں رہا بلکہ استاد بھائیوں اور پیر بھائیوں میں باہم تحاسد و تباغض اور تنافر و تزاحم اغراض ہیں اور استاد یا پیر سے ایک دوسرے کی چغلی اور غیبت اور دوسروں کے سامنے تحقیر و تنقیص کرتے ہیں الحمد للہ کہ حق تعالیٰ نے ہمارے سلسلہ کو ہمارے بزرگوں کی برکت سے اس بلا سے تو بہت کچھ محفوظ رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ کے لئے محفوظ رکھے۔

اب ان ابواب ثلاثہ کو ختم کرتا ہوں جس میں بفضل اللہ تعالیٰ دس آئتیں اور پینتیس۳۵ حدیثیں یعنی سب پینتالیس۴۵ نصوص ہیں۔ اگرچہ اس سے زیادہ نصوص ذکر نہیں کی گئیں محض نمونہ بتلانا مقصود تھا جو کہ ایک بڑے عدد سے معدود ہونے کے سبب اس غرض کے لئے کافی ہو گیا کہ یہ حقوق بھی منصوص ہیں یہاں ان ابواب کے مناسب ایک باب رابع اور بھی تھا یعنی خود علم کے حقوق جو بذمہ اہل علم ہیں یا بذمہ غیر اہل علم ہیں اور گو یہ مناسبت بدرجہ جزئیت تو نہیں کیوں کہ ان ابواب کے مقسم میں خاص معلم و متعلم و شرکا ر تعلم مضاف الیہ حقوق کے واقع ہوتے ہیں لیکن بدرجۂ تعلق ضرور ہے اور یہ تعلق مقتضی ہو سکتا تھا کہ اس کا بھی یہاں ذکر ہوتا گو تبعاً سہی۔ لیکن اتفاق سے اس کے قبل احقر اس مبحث خاص میں نہایت مفصل مضمون بشکل ایک رسالہ جس کا نام حقوق العلم ہے۔ لکھ چکا ہے۔ اور وہ چھپ بھی گیا ہے اس لئے وہ مستغنی عنہ ہو گیا۔ اب آخیر میں بطور تذنیب کے بعض جزئیات متعلقہ مقام کی تنبیہ میں لکھ کر فارغ ہوتا ہوں۔

تذنیب = (تنبیہ اول) ہر چند کہ مفہوم معلم کا استاد بالمعنی متعارف اور پیر اور واعظ اور مصنف یعنی ہر صاحب افادہ دینیہ کو جب کہ کسی کو استفادہ ہو سب کو عام ہے لیکن قواعد سے معلوم ہوتا ہے کہ سب حقوق میں متساوی نہیں ہیں۔ ان سب میں استاد بالمعنی المعروف کا حق زیادہ ہے۔ دو وجہ سے۔ ایک تو یہ کہ استاد جس قدر مشقت افادہ تلامذہ کے لئے برداشت کرتا ہے۔ اس قدر دوسرا اہل افادہ نہیں کرتے۔ بعض طرق افادہ میں تو چنداں مشقت ہی

نہیں۔ اور بعض میں گو مشقت ہے مگر وہ اس مستفید کے لئے برداشت نہیں کرتا۔ اور نص قطعی ووصینا الانسان بوالدیہ حملتہ امہ کرھا ووضعتہ کرھا سے مشقت سے حق کا عظیم ہونا ثابت ہوتا ہے۔ یہ وجہ تو تمام مفضل علیہم یعنی پیر و واعظ و مصنف کو عام ہے۔

اور دوسری وجہ جو صرف بعد میں متحقق ہے یہ ہے کہ شاگرد نے استاد کی تابعیت کا التزام کیا ہے اور التزام ایک وعدہ ہے اور وفاء عہد لازم ہے۔ عام لوگوں کو اس میں یہ غلطی واقع ہو رہی ہے کہ پیر کی تعظیم وخدمت واطاعت میں حدود شرعیہ سے بھی تجاوز کر جاتے ہیں اور استاد کے حقوق ادا کرنے میں حد شرعی کے قریب بھی نہیں پہنچتے۔ وھلے ھذا الا تغییر للمشروع۔

(تنبیہ ثانی) آیا استاد و پیر کا حق زیادہ ہے یا باپ کا، اس میں بھی عام طور پر لوگ اشتباہ والتباس میں مبتلا ہو کر یہ سمجھتے ہیں کہ پیر اور استاد روحانی مربی ہے اور باپ جسمانی مربی ہے۔ اور روحانی مربی بڑھا ہوا ہے جسمانی مربی سے۔ اس دعوے کی غلطی اجمالاً تو اسی سے سمجھ لینا کافی ہے کہ نصوص میں جس شد و مد سے باپ کے حقوق بتلائے گئے ہیں استاد و پیر کے نہیں بتلائے گئے۔ اور تفصیل یہ ہے کہ اگر ان لوگوں کے اوامر میں کچھ تعارض نہ ہو تب تو تحقیق تقدیم حق کی ضرورت ہی نہیں اور اگر تعارض ہو تو دیکھنا چاہیئے کہ ان میں سے کوئی امر شرعاً واجب ہے یا نہیں اگر واجب ہے تو وہ مقدم ہے خواہ اس کا باپ آمر ہو یا استاد یا پیر ہو اور اگر واجب نہیں دونوں طرف مباح ہے بس یہ محل بحث ہے اور اس میں نصوص سے باپ کا حق مقدم معلوم ہوتا ہے۔ کما ھو ظاھر

رہا جواب اس دلیل کا سو اگر صغریٰ مان بھی لیا جاوے اس طرح سے کہ کوئی باپ ایسا ہو جس نے روحانی تربیت بالکل نہ کی ہو صرف کھلایا ہی پلایا ہو تب بھی کبریٰ باعتبار اس کے مراد کے محتاج دلیل ہے اور اس کی کوئی دلیل نہیں۔ پس اگرچہ مربی روحانی درجہ میں افضل ہو مربی جسمانی سے، لیکن جو اس سے مقصود ہے کہ مربی روحانی کا حق اور اطاعت زیادہ ہے مربی جسمانی سے اس کے لئے دلیل کا مطالبہ کیا جاوے گا۔ اور اگر اس کو مان بھی لیا جاوے تب بھی مقصود مستدل کا حاصل نہیں، کیونکہ استاد اور پیر سے زیادہ مربی روحانی رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم ہیں اور حق تعالیٰ تو جسم اور روح دونوں کے مربی ہیں اور خدا اور رسول نے باپ کا حق زائد کیا ہے۔ پس اس کی اطاعت میں بھی ایک بڑے مربی روحانی کی تقدیم حق ہے۔ ایک چھوٹے مربی روحانی پر خوب سمجھ لو۔

(تنبیہہ ثالث) آیا معقول اور فارسی اور حساب کے استاد بھی ان حقوق مذکورہ میں شریک ہیں یا نہیں۔ اور اسی طرح کافر استاد بھی۔ اس میں قواعد سے یہ تفصیل معلوم ہوتی ہے کہ ان میں جو چیزیں مضر ہیں ان کا استاد تو خود مضل اور مضر ہے۔ اور استاد کا حق تھا بوجہ مفید اور محسن ہونے کے، اور جو چیزیں مضر نہیں ان میں یہ تفصیل ہے کہ اگر علوم دینیہ میں نافع و معین ہیں تب تو چونکہ مقدمہ بحکم مقصود ہوتا ہے اس لئے ایسے اساتذہ حقوق مذکورہ کے مستحق ہوں گے۔ گو درجہ استاد المقاصد میں نہ سہی جس طرح اقارب کے حقوق میں قوت قرابت کے تفاوت سے حقوق میں تفاوت ہو جاتا ہے۔ اور اگر نہ مضر ہیں اور نہ مفید تب بھی ایک دنیوی احسان ہے اور خود دنیوی احسان پر بھی شکر گذاری نصوص عامہ سے ثابت ہے اس لئے اس کا بھی حق ثابت ہوگا۔ گو دینی احسان کی برابر نہ سہی۔

اب یہ دعا کر کے قلم کو راحت دیتا ہوں کہ حق تعالیٰ ہم طالب علموں کو ان حقوق کے ادا کی توفیق دے اور بوجہ اس کے کہ مضمون بعنوان سہل لکھا ہے۔ تسہیل جدید کی احتیاج نہیں سمجھی گئی۔ البتہ احادیث کا ترجمہ جہاں رہ گیا ہے اگر حضرات مہتممین اشاعت حاشیہ میں ثبت فرما دیں ناظرین کی قناعت اور میری منت کا سبب ہوگا۔ الحمد للہ حصہ اول ختم ہوا۔